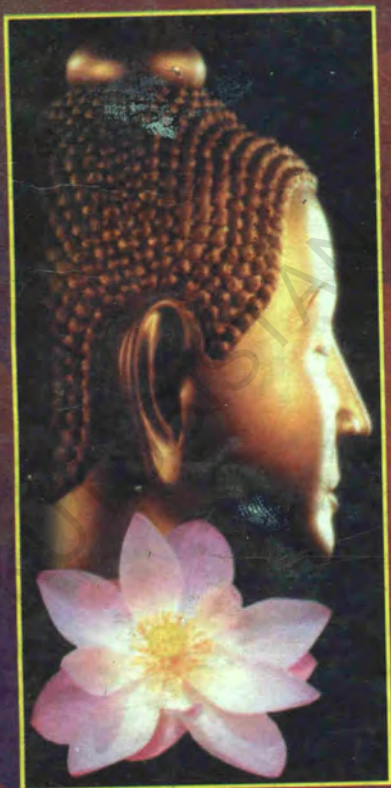


نیپال نگری



مستنصر حسین تارڑ

فہرست

- 7 -1 زندہ دیوی... کماری کماری.. درشن درشن
- 42 -2 پرندے پرواز کرتے ہیں.. اور ان میں باہل کی چڑیا
- 73 -3 بھاگ متی اور بھاگ بھری... بڑھتی جاتی دھند ہے اور اس کے پیچھے شہر ہے...
- 87 -4 کھٹنڈو کا دھوکا دربار.. جھانک لینے میں کیا حرج ہے
- 114 -5 بیکری کیفے... فارہوم دی ہیل ٹولز
- 120 -6 نینا اور طوطے... کس کس کو بلاوا آیا تھا
- 139 -7 شراب خانے میں قمار خانے میں میرے بغیر نہ جانا
- 148 -8 جس کو دیکھا قمار میں دیکھا... جواری کی قمار
- 176 -9 شب کا شمار... ایورسٹ کا بخار
- 195 -10 انا پورنا کے پجاری.. بڈھ کے بیوپاری اور کھٹنڈو کی گلیاں
- 219 -11 تبت کے شاہ جی اور مغل شاہ زادی.. بئے چرانے نئے گلے
- 230 -12 دربار مرگ... شراب حاضر کباب غائب
- 245 -13 تھمیل میں حمل... لارڈ بڈھا وٹلی فالو ہنڈرڈ...
- 255 -14. سکھ مسراں... اور پرندے آزاد ہوتے ہیں..
- 262 -15 آخری قمار، خمار اور کماری... اٹھ فرید استیا
- 284 -16 بگلا بھگت اور چکلی میٹھی... اور وادی کھٹنڈو
- 295 -17 دریائے ہومانے اور شاند... ایورسٹ کی بریس

- 18- بودی شاہ... مسلمان بٹ فروش اور کالی دیوی 299
- 19- بھگتا پور... ہون ساگ اور مار کو پولوان دربار چوک 308
- 20- بھیدوں کی بستی بھگتا پور میں مور ناچا... کس نے دیکھا 331
- 21- ناگ دیوتا ایک متروک خدا... 338

اے ہمالہ... اے فصیلِ کشور ہندوستان

”زندہ دیوی... کماری کماری... درشن درشن“

”دیوی دیکھو گے؟“

”کس قسم کی دیوی؟“

”لوٹنگ گاڈیس... زندہ دیوی..“

”ایک اور دیوی؟...“

شام ڈھلتی تھی اور ہنومان دھوکا کے دربار چوک میں یوں ڈھلتی تھی کہ چوبی دیوتاؤں، برہنہ بڑی چھاتیوں اور اُن سے بڑی پیٹھوں پر براہمن دیویوں اور ہنومان جی کے باندر بنوں اور بد شکل شیروں اور سنگی ہاتھیوں اور لکڑی کی حیرت زدہ کھڑکیوں کے بند کواڑوں اور ہزاروں خداؤں کے چرنوں میں بھیٹ کی گئی خوراک، تیل اور سفید چاولوں اور اُن میں سے اُٹھتی ہوئی وہ مہک جو ہم مومنین کو بو لگتی تھی صرف اس لئے کہ وہ ہمارے خدا نہ تھے ورنہ ہم اُس مہک پر نثار ہوتے اور وہ خوشبو ہمیں سُرگ کا راستہ بھائی دیتی اور کھٹنڈو کے اس سب سے بڑے اور پسندیدہ ٹپل کامپلیکس کہ جس میں کئی صدیوں کی بٹ پرستی کی ہوائیں ابھی ٹھہری ہوئی تھیں کہ جب لاکھوں برس پیشتر آسمانی خداؤں نے زمین پر اترنا چاہا تو سب سے کم فاصلے پر ہمالیہ کی بلند برفیں تھیں تو وہ اُن پر اترے اور دیوی انا پورنا جس چوٹی پر اترتی اُسے اپنا نام دیا اور تب یہ خدا اپنے وقت کے جیٹ لیگ سے تھکے ہارے بلند یوں سے نیچے آئے اور واڈی نیپال میں برام کیا آرام کیا اور اب تک کرتے ہیں اور اُن کی کوئی نیت نہیں کہ وہ واپس اپنے آسمانوں میں جائیں کہ اُدھر اُن کے چرنوں میں تیل ڈالنے والا اور اُنہیں سفید چاول اُبال کر کھلانے والا کوئی

نہیں... اور آسمان پر بھی ایک اور شام ڈھلتی تھی یہی شام اس کھٹنڈو دربار کے ٹپل کا پلیکس میں گھومتے آریائی ناکوں والے اور غیر آریائی چھٹی ناکوں والے ان گنت سیاح اس دربار کی ہزاروں برس سے ٹھہری ہوئی صنم آشنا ہوا میں سانس لیتے ہوئے گھومتے تھے اور ہم ذرا احتیاط سے سانس لیتے تھے کہ کہیں یہ صنم پرستی کی ہوا ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر ہمیں پھر سے بت پرست نہ بنا دے اور کم کم سانس لیتے تھے ان چھٹی اور نیکی... تھوم کی ٹری ایسی نیکی ناکوں والے گھومتے سیاحوں اور اُن کا چچھا کرتے نیپالی گائیڈوں اور ہانگ کانگ سے درآمد کردہ پلاسٹک کے لارڈ بدھاز اور کم از کم ہم مومنین کے لئے لارڈ شیوا کے خوفناک نقابوں... گل دانوں اور شمد کے پیالوں اور تانترک آرٹ کے نمونوں... کہ اس آرٹ فارم کا تانا بانا بدھ مت کے نروان اور ہندو دیومالا کے دھاگوں سے بٹا گیا تھا... اور یوں نئے دیوی دیوتا ظہور پذیر ہوئے جن کا بدن ہندو اور اُن کی روح بدھ تھی... تانترازم اصل میں ایک کوشش ہے روح اور مادے کے ملاپ کی... جہاں اس کے پجاری اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قدرت کے مظاہر پر حاوی ہو کر نروان حاصل کرتے ہیں... تو ان تانترک نمونوں پر بھی تو وہ شام ڈھلتی تھی...

اور ایک ریستوران کی کھڑکی میں سے جھانکتی ایک بے حیا اور سرخ چرنے والی... فروزاں کئے ہوئے چرے والی بیباک سیاح لڑکی اور اُس کے سامنے براجمان اُس کے گورکھا بوائے فرینڈ پر بھی یہی وہ شام تھی جو ڈھلتی تھی...

یہ شام ہنومان دھوکا کے قریب میں جگن ناتھ مندر پر بھی اُترتی تھی جس کی کھڑکیوں کے نیچے اُن دیوی دیوتاؤں کے چوہی مجستے قطار اندر قطار تھے جو ذرا نہ جھجکتے تھے، کچھ خیال نہ کرتے تھے، کچھ لحاظ نہ کرتے تھے کہ کوئی اُنہیں دیکھ رہا ہے یا نہیں اور شدید طور پر محرب الاخلاق حرکتوں میں ”مشغول“ تھے۔ اُنہوں نے شب کی تاریکی کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور مشغول ہو چکے تھے اور کما سوترا کے ہر آسن کو کھلے عام پر فارم کر رہے تھے۔ شرمیلی خواتین ذرا پلومنہ میں دبا کر اُنہیں کن اکیوں سے دیکھتی تھیں اور حساب لگاتی تھیں کہ کیا اُن کے گھر والے نے دیوتاؤں کے اِس آسن کو برتا ہے کہ نہیں اور ہم پاکیزہ روصیں لاجول پڑھتے ہوئے اُنہیں نہایت انسہاک سے دیکھتے تھے تو شام اُن چوہی مجستوں پر بھی اُترتی تھی جو لذت اور لطف کی بیٹگی میں قید تھے...

ہمیں تو نید دی گئی تھی کہ لذت اور لطف کی وہ منزل جس میں سرشاری کا چشمہ اُبلنے کو ہوتا ہے ٹو وہ لمحہ صدیوں پر محیط ہو جائے گا... اور بے شک یہ نید صرف اُن مومنین کے لئے تھی جو اس دنیا میں ایسے لحوں سے پرہیز کرتے ہیں... اور پھر اُنہیں زہد و عبادت کا یہ انعام جنت میں ملے گا۔

لیکن جگن ناتھ مندر کے ان چوہی مجستوں نے وعدہ فردا پر اعتبار نہیں کیا تھا اور اسی دنیا میں لذت اور لطف کی بیٹگی میں قید تھے... البتہ اُن میں ”حرکت“ نہ تھی جو ایسے لحوں میں جزو لاینفک ہوتی ہے...

شرمیلی خواتین ساڑھیوں کے پلومنہ میں دابے ان مشغول خداؤں کو کن اکیوں سے تکتی تھیں اور یقیناً اُس شب اُنہوں نے اپنے مجازی خداؤں کی زندگی کو حرام کرنا تھا۔ تو شام لطف اور بیٹگی کے ان مظاہر پر بھی اُترتی تھی۔

”ایک اور دیوی؟“ میں نے بیزار ہو کر کہا۔

اس شہر کھٹنڈو میں انسان کم تھے اور دیوی زیادہ... اور اُن میں سے اکثر حُسن کے کسی پیمانے پر پورے نہ اُترتے تھے اور لحاظ نہ کرتے تھے کہ کوئی اُنہیں دیکھ رہا ہے یا نہیں... تو اس جنسی کیفیت میں ایک ڈھلتی شام میں ایک اور دیوی...

”ایک اور دیوی...؟“

”لیکن صاحب... یہ تو زندہ دیوی ہے... اس کے درشن سے آپ سیدھا ڈائزکٹ عورگ میں جاتا ہے...“ پُرکاش نے کہا...

اور یہ پُرکاش کیا تھا؟...

دنیا بھر کے سیاحتی مقامات پر پائے جانے والے گائیڈز کا ایک پروٹو ٹائپ تھا... جب ڈبان، کمینہ، آپ کے چرے کی بجائے جیب پر نظر رکھنے والا۔ آپ کو وہی کہانیاں سناتے والا جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ نہایت طوطا چشم اور آپ چاہیں یا نہ چاہیں اپنے آپ کو آپ کے ساتھ نتھی کر دینے والا۔ اس کی قومیت مختلف ہوتی ہے لیکن اس کی خصلت بین الاقوامی ہوتی ہے... وہ فلائرس میں مائیکل انجلو کا ”ڈیوڈ“ دکھا کر آپ سے ایک لاکھ بیسے ڈیمانڈ کر سکتا ہے، استنبول کی کسی مسجد میں سر پر رومال ڈالنے آپ کے ہمراہ جائے گا

گئے لیکن اُن میں سے ایک ایسا تھا جس کی آمد کا کچھ آپا پتہ نہ ملتا تھا کہ اس کا ورود سردار جی کی کونسی آمد کے بعد ہوا تھا اور تب سرداری نے کہا کہ... سردار جی یہ تو ایک کونے میں بیٹھا وہی کھا رہا ہے آپ کا کیا لیتا ہے...

چنانچہ پرکاش بھی وہی بچہ تھا جس کے ورود کا کوئی جواز میسر نہ تھا... اور جب میں اُس کی بھڑکا دینے والی ٹپک اور جلن پیدا کرنے والی موجودگی سے عاجز آ گیا تو میں نے کہا ”تم اپنے آپ کو گم کیوں نہیں کر دیتے؟ وہابی ڈونٹ یو گیٹ لاسٹ؟“

”صاحب... یہ ہمارا شہر ہے۔“ اُس نے نہایت ملائمت سے کہا ”ہم اس میں گم نہیں ہو سکتا۔“

”تو خدا کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑ دو...“

”کون سے خدا کے لئے صاحب... مہاراج ہنومان کے لئے۔ دشمنوں کے لئے۔ شیوا کے لئے۔ بدھ کے لئے... انا پورنا کے لئے... کس خدا کے لئے؟“

”یار کسی بھی مناسب خدا کے لئے...“

تب اُس نے ٹرپ کا پتہ پھینکا ”دیوی دیکھو گے؟“

”کس قسم کی دیوی؟“

”لوگ گاڈیس... زندہ دیوی“

”ایک اور دیوی...“

”شاید سری دیوی ہو...“ لارڈ بائرن نے اپنی سُہری ریش پر ایک حلالہ کی خواہش کرتے مولوی کی طرح ایک شہوت بھرا ہاتھ پھیرا ”تارڑ صاحب کیا حرج ہے“

”اور اس سے پوچھیں اس دیوی کی عمر کتنی ہے؟“ فاروق جو دراز قد اور لاہوری محاورے کے بقول ذرا ڈشکرا اور لاپرواہ تھا اُس کی آنکھوں میں اُن دیویوں کے بدن اُترنے لگے جن کو اُس نے اپنے برسوں میں دیکھا اور پرکھا تھا... کتاپر کھا تھا؟ کون کیا کہہ سکتا تھا...

گندہ خالہ کی وہ خفیف سی آواز آئی جو نہ سنائی دیتی تھی اور نہ سمجھ میں آتی تھی اور انسان ٹانگ ٹوئیاں مارتا رہتا تھا کہ اس عقیقہ نے کیا کہا ہے ”تارڑ صاحب... دیوی دیکھنے میں کیا حرج ہے؟“

اور باہر آتے ہی دامن پکڑ لے گا۔ بٹاک کے کسی برا تھل ہاؤس میں لے جائے گا اور آپ کا بیٹہ خالی کر دے گا۔ غرناطہ کے البسین محلے میں کسی چھپی کے عمار کے دلہنے پر آپ کو ملے گا اور ”سینور“ کہہ کر جھکے گا اور جب اُٹھے گا تو آپ کی جیب میں ایک سوراخ ہو گا... اور ہنزہ کے بازار میں ملے گا تو ہنزہ واٹر کے وعدے کر کے آپ کو فلاش کر دے گا بسن یہ بھی وہی گائیڈ تھا جو ہمارے ساتھ تھی ہو رہا تھا اور بہت دیر سے ہمارے پہلو میں چلا آتا تھا اور اُس کی مسکین شکل سے ہرگز یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ بالآخر یہ بھی طوطا چشم ہو جائے گا اور وہ ہماری درخواست کے بغیر ہنومان دھوکا اور دربار چوک کی عمارات اور مندروں کے بارے میں معلومات فراہم کئے چلا جاتا تھا...

میں چونکہ ایک تجربہ کار گائیڈ دیدہ تھا اس لئے میں نے سُہری بابا سے کہا ”بابا اس کردار کو جلد از جلد رخصت کر دیجئے۔ اس کی رفاقت ڈالروں کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔“

لارڈ بائرن عرف سُہری بابا نے چلتے ہوئے ایک فحش سا ٹھمکا لگایا اور بولے ”تارڑ صاحب یہ تو نہایت عاجز سا بندہ ہے۔ اتنا مسکین ہے کہ صرف اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں ورنہ حالات کا مارا ہوا لگتا ہے...“

”تھوڑی دیر بعد ہم اس کے مارے ہوئے لگیں گے۔“

”اور یوں بھی نیپالی بھائی ہے کیا سوچے گا کہ پاکستانی بھائی ایسے ہوتے ہیں... ایک کونے میں بیٹھا وہی کھا رہا ہے آپ کا کیا لیتا ہے...“ اور اس کے ساتھ سُہری بابا نے ایک ایسا قہقہہ بلند کیا جس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے شاید ہنومان جی کے کسی بت کی دم ہوا میں بلند ہو گئی ہوگی...

کہا جاتا ہے کہ ایک سردار جی جب دور دیسوں میں کمائی کر کے وطن لوٹے تو گھر کا صحن بے شمار بچہ لوگ سے بھرا ہوا تھا... اُن کی یادداشت میں جب اُنہوں نے اپنی سرداری کو چھوڑا تھا ایک دو بچے تھے تو انہوں نے پوچھا اور کسی ایک نونمال کی جانب اشارہ کر کے پوچھا کہ بسنت کورے یہ کب پیدا ہوا تھا... بسنت کور نے دوپٹے کا پلو منہ میں دبا کر حیا سے دوہری ہوتے ہوئے بتایا کہ سردار جی یاد نہیں جب آپ صرف دو دن کے لئے فلاں سال چھٹی پر آئے تھے تو یہ وہ ہے... یونہی متعدد بچوں کے جواز پیش کئے

”لو.. ذرا جھانک لیتے ہیں..“ طاہرہ بی بی دے گرل گائیڈ نے اپنی عینک درست کی اور فوراً ہوشیار ہو گئیں... ذرا جھانک لیتے ہیں، اُن کا تکیہ کلام تھا اور وہ اسے ایسے ایسے نازک مقامات پر استعمال کرتی تھیں کہ انسان دنگ رہ جاتا تھا.. مثلاً طاہرہ بی بی ذرا دیکھیں تو سہی اس چلبانی خاتون نے کتنا خوبصورت بلاؤز پہن رکھا ہے... تو فوراً جواب آ رہا ہے کہ ذرا جھانک لیتے ہیں.. یا یہ جو یورپی سیاح ہمارے آگے آگے چل رہا ہے تو دیکھیں اس کی جین پھٹی ہوئی ہے تو.. ذرا جھانک لیتے ہیں..

”تو یہ لوگ گاڈیس... سچ زندہ ہے؟“ میں نے پُرکاش سے پوچھا۔

”جی صاحب.. لیکن وہ اپنے مندر میں سنگھار کرتی ہے اور وہاں بجلی نہیں دیتے جلتے ہیں اور دیوی اُن کی روشنی میں سنگھار کرتی ہے۔“

”لپ سنک کا کونسا شیڈ استعمال کرتی ہے؟“ خالدہ نے بال جھٹک کر پوچھا۔

پُرکاش کستا گیا ”اور وہ بچاریوں کو درشن نہیں دیتی.. کتنے لوگوں کو درشن دے.. اور شاید اس وقت نیپال میں کوئی ایک ٹورسٹ نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اُس نے لوگ گاڈیس کو دیکھا ہے.. لیکن..“

”لیکن کیا بر خوردار...“ گرل گائیڈ ہمیشہ نے فوراً کہا۔

”لیکن... اگر میں آپ کے ساتھ جاؤں تو شاید وہ درشن دے.. اُس کا شکل دیکھے گا تو سیدھا سورگ میں جائے گا.. آپ لوگ سورگ میں نہیں جانا چاہتے؟“

”رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی..“ لارڈ بائرن نے حسب عادت غالب کو بے وجہ کٹوتہ کر دیا ”مارٹ صاحب جنت ہاتھ سے جا رہی ہے اس لوگ گاڈیس کے درشن کر لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے؟“

”اور یہ جو پُرکاش دی بنگر ہمارے ساتھ چھپی ہوا چلا آ رہا ہے یہ بعد میں پیسے مانگے گا تو اس کا کیا کریں گے؟“

”جنت کے لئے تھوڑی سی انوسٹمنٹ کر دیں گے جناب عالی.. اگرچہ دل سے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے..“

پچھلے دو ہزار برس سے وادی کھٹمنڈو سلطنت نیپال کی نگہبانی کر رہی ہے.. اور

یہاں دنیا کے دو بڑے مذہب ہندو اور بدھ کی مقدس ترین یاترا میں ہیں۔ نیپال کی قدیم تاریخ قصوں اور داستانوں کی دُھند میں ملفوف ہے۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ ایک زمانے میں وادی کھٹمنڈو ایک وسیع جھیل تھی.. جسے مانجو سیری نے خشک کر دیا.. اور اس کے بعد اپنے گندھارا کے اُس بدھ نے جو بدھ کی پیدائش سے پیشتر ایک اور بدھ تھا جو بودھی ستوا کہلاتا تھا اس وادی میں قدم رکھا، یہاں ایک جھونپڑا بنایا اور قیام کیا.. اُس کے بعد اشوک اعظم بھی اپنے نئے مذہب کے پرچار کے لئے مہاتما بدھ کی جائے پیدائش پر ایک ستون نصب کرنے کے لئے ادھر آیا..

اور بودھی ستوا اور اشوک کے بعد... ایک طویل داستان ہے کہ کون کون آیا.. لیکن اُن کے بعد اگر کوئی عظیم ہستیاں اس وادی میں آئیں تو وہ ہم تھے.. اور پُرکاش ہمارا پیچھا نہ چھوڑتا تھا اور لوگ گاڈیس کے درشن کے لالچ دیتا تھا..

وادی کھٹمنڈو میں تین بڑے دربار ہیں..

تین ٹپل کا مپلیکس ہیں..

ہنومان دھوکا.. پتن اور کھٹمنڈو سے دُور بھکتوں کا شہر.. بھکتا پور۔

نیو روڈ کے مصروف سپر سٹورز اور نیون لائٹس سے بھرتے اور ٹریفک کے شور سے بھرپور چوراہے میں آپ اُترتے ہیں۔ ذرا ایک جانب ہوتے ہیں تو شور کی نبضیں رگ جاتی ہیں۔ آپ ہنومان دھوکا کی مکاکی ٹریفک سے خالی وسعت میں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور یکدم شانت ہو جاتے ہیں.. نروان چند قدم کے فاصلے پر آپ کا منتظر ہوتا ہے.. اپنے قدموں کی آواز بھی سنائی دینے لگتی ہے.. اور ہنومان جی ڈم اٹھائے ماتھے پر سُرُخ تلک لگائے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

نیپال کا ہٹا خاندان (اور اسے ہرگز ٹٹا نہ پڑھا جائے) چونکہ اپنے آپ کو راجہ رام چندر کی اولاد میں سے سمجھتا ہے یعنی یہ مقامی شاہ صاحبان ہیں جیسے ہمارے ہاں.. صدیقی، علوی اور قریشی برادران ہوتے ہیں اور اسی لئے ذرا غیر ملکی سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو مقامی شودھروں سے سپریر سمجھتے ہیں ویسے ہی یہ نٹا حضرات ہیں.. کہا جاتا ہے کہ ہنومان جی یعنی مقدس باندر صاحب نے سری لنکا کے بن باس کے دوران راجہ رام چندر کے ساتھ نہایت شفقت برتی تھی اور اُن کے لئے پورے کے پورے سالم پہاڑ.. یعنی

لئے مجبور کیا تھا اور تب بھی نہیں جان سکا تھا کہ اس پر کندہ پیغمبروں کی کمائیاں... اور ان میں حضرت نوح علیہ السلام کی کمائی بھی تصویر ہوئی تھی... میں نہیں جان سکا تھا کہ اس دروازے میں وہ کون سی ایسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے جنت کے دروازے کا خطاب دیا گیا ہے... اگر یہی جنت کا دروازہ ہمارا منتظر ہے تو ایسی محبت سے ہم باز آئے... کچھ اسی طور اس نیپالی ”گولڈن گیٹ“ کو دیکھ کر... تماشہ ہمدردی اور اشہاک کے باوجود میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں ذوق جمال کی وہ کونسی ایسی خصوصیت ہے کہ اس کا درشن لازمی ٹھہرے...

سوات۔ چنیوٹ۔ سرگودھا۔ بھیرہ اور بھٹ شاہ میں ایسے درجنوں دروازے تھے جن کی کارگیری ایسی تھی کہ انسان جنت میں جانے سے جھجکتا نہ تھا... البتہ اس گولڈن گیٹ کے اوپر تین ایسی شبیہیں تھیں جن کو میں نے ذرا شوق سے دیکھا۔ ان میں عظیم رزمیہ مہابھارت کا ایک منظر ابھارا گیا تھا...

وہاں لارڈ کرشنا جلوہ گر تھے اور موصوف قطعی طور پر تہائی پسند نہ تھے اور جب بھی جلوہ گر ہوئے نہایت حسین رفاقت میں جلوہ گر ہوئے۔ تو یہاں بھی وہ اپنی دل پسند اور نہایت عزیز... زکمی اور سیتا بھاما گویوں کی ہمراہی میں جلوہ افروز تھے اور کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا... دیوتاؤں کو کم از کم اتنی تو آزادی اور لبرٹی ہوتی ہے کہ وہ گویوں کے ساتھ چٹلیں کرتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا کرتے ہیں اور پھر بھی مقدس رہتے ہیں۔ اور ایک ہم انسان لوگ ہیں کہ ذرا کسی لڑکی کا تذکرہ کر دیا، ذرا کسی شکل کی دیدہ زیبی کے سحر کو بیان کر دیا تو فی الفور فتویٰ نہیں تو اعتراض وارد ہو گیا کہ جی تارڑ صاحب کے سفرناموں میں لڑکیاں بہت ہوتی ہیں... ہنگامہ ہے کیوں برپا...

ہنومان دھوکا سے آگے بڑے چوک کے سامنے جو ایک چوٹی محل ہے اس کی مینا کاری اور کارگیری ایسی ہے کہ آپ سر اٹھا کر اس کی کھڑکیوں، چھتوں اور راہداریوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کی گردن کی ہڈی میں ایک سرد لہری اٹھتی ہے کہ یہ کیا ہے جس کی خبر کچھ کو نہ تھی... یہ کیسی کشیدہ کاری ہے کہ انسان کے ہاتھوں نے اسے تخلیق کیا... اس محل کے قدیم چھتے اور ستون جن پر دیوی دیوتاؤں اور جنگلوں اور صحراؤں میں جتنے بیل بوٹے اور گل رعنا ہیں وہ سب کھدے ہوئے ہیں اور شاید زندہ ہو جانے کے لئے کسی پھونک

ماؤنٹین رینج اپنی ہتھیلی پر اٹھا کر بمشکل پرواز کی تھی اس لئے یہ تلا خاندان ان کا شکر گزار ہے اور انہیں مرشد ماننا ہے... یعنی باندر ہنناں دے مرشد ہو... چنانچہ یہ پورا علاقہ اس پوٹر اور پینچے ہوئے باندر کے مجسموں سے منسوب ہے۔ یہی وہ نصیب کو جگا دینے والے اور خفیہ جنت کو بیدار کر دینے والے ہنومان جی ہیں جو ان تلاؤں کے محافظ تھے پیر مرشد اور اتار تھے جو دوران جنگ انہیں فتح کی قربت میں لے جاتے تھے گویا ان کے وہ سبز پوش تھے جو دشمن طیاروں کے بم ان کی نگری سے ادھر ادھر کر دیتے تھے۔ چنانچہ نیورڈ چوک سے اندر داخل ہوتے ہی داخلے پر ایک ایسے باندر کا مجسمہ ہے جس کا باندر ہونا سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صرف ایک ناک منہ سے عاری پتھر ہے اور نہ اس کی ذم ہے اور نہ یہ کسی کی جو کیں نکالتا ہے...

اس کے پتھر ماتھے پر سرخ پینٹ کے اتنے کثیر تلک تھوپ دیئے جاتے ہیں کہ ہنومان مہاراج باقاعدہ کیونٹ پارٹی کے بنیادی ممبر لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے کندھوں پر ایک سرخ چادر اوڑھادی جاتی ہے اور ان کے سر پر تانی ہوئی چھتری باقاعدگی سے تبدیل کی جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں داتا صاحب کے عرس کے موقع پر انہیں غسل دیا جاتا ہے اور چادر تبدیل کی جاتی ہے... اگرچہ قبر اور پتھر کو ان کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن انسان کو ثواب کی ضرورت ہوتی ہے۔ قبر اور پتھر اگر احتجاج بھی کریں تو بھی ان کی کون سنتا ہے...

دادی کھنڈو میں رواں دریاؤں... بھاگ متی اور دشمنو متی کے درمیان واقع اس ہنومان دھوکا.. دربار چوک میں ہم آئے تھے تو دوپہر تھی اور اب شام ڈھلتی تھی.. ان کیونٹ ہنومان جی کی قربت میں ایک ”سُہری دروازہ“ ہے جس کے باہر دو شیر پیرا دے رہے ہیں.. شیوا اور شکتی ان شیروں پر سوار ہیں اور مجھے تو قدرے خوفزدہ لگے... شیر پر سواری کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بے شک آپ ایک دیوتا ہی کیوں نہ ہوں۔ اس ”سُہری دروازے“ کا موازنہ... اور دنیا میں کہیں بھی اگر کوئی دروازہ ہو گا اور وہ ذرا سُہری ہو گا تو اس کا موازنہ اطالیہ کے مائیکل انجلو اور ڈی ونچی کے شرفلارنس کے مرکزی چوک میں البتہ ”جنت کے دروازے“ سے کیا جاتا ہے۔

میں نے فلارنس میں اس جنتی دروازے کی ساخت اور کارگیری کو نہایت اشہاک اور ہمدردی سے دیکھا تھا... اپنے آپ کو اس کی مٹائی کے سحر میں گرفتار کرنے کے

لئے بند اور پوشیدہ ہے۔ اگرچہ اسے سربراہان مملکت اور بلند مرتبت شخصیات کے لئے۔
شاہ نیپال کی رفاقت میں کھولا جاتا ہے اور دکھایا جاتا ہے۔

میں ہمیشہ ایک شدید آزدگی سے ٹیلی ویژن کے خبرنامے میں شاہوں کی موجودگی
میں کسی بھی سربراہ مملکت کو خانہ کعبہ کے اندر جاتے دیکھتا ہوں یا تہائی میں روضہ اقدس
کی اس جالی کی قربت میں جس میں تین سوراخ اس کے اندر خوابیدہ ہستیوں کی نشاندہی
کرتے ہیں وہاں نوافل ادا کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اس شدید ناانصافی پر غصہ آتا ہے۔
شاہ و گدا کا فرق تو ختم کر دیا گیا تھا۔ تو پھر بیشتر شاہ جو مکر اور فریب اور دھوکے سے شاہ
ہوتے ہیں وہ قربت میں کیوں ہیں اور گداؤں کو دھکے کیوں دیئے جا رہے ہیں۔ شاہ پیشک
اس لمحے جب وہ کعبہ کے دروازے میں سے اندر داخل ہو کر دنیا کے بت کدے میں
خدا کے پہلے گھر کے اندر جھاڑو دے رہے ہوں تب وطن لوٹ کر اپنے مخالفوں کو تختہ دار
پر لٹکانے کے منصوبے بنا رہے ہوں یا اپنے سوس اکاؤنٹس کا بیلنس یاد کر رہے ہوں۔
حاضری کے حقدار ہوتے ہیں اور گدا اپنا کسٹول اٹھائے راندہ درگاہ ہوتے ہیں۔
اگرچہ گداؤں کا کسٹول چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہوں۔ بھر دیا جاتا ہے۔ اور
شاہوں کے لبادے قربت میں بھی خالی اور بے ٹراد رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود غصہ تو
آتا ہے۔

اس چوہی جنگل کے سامنے جو بڑا چوک ہے اس میں کئی سو برس پیشتر شاہان
نیپال کی تاجپوشی ہوا کرتی تھی۔ ان کے سر پر ایک بڑی کپنی والا تاج رکھا جاتا تھا۔ یہ رسم
اب بھی چلی آتی ہے۔ ذرا آگے کل چوک میں ایک بلند مینار نما کعبہ ایستادہ ہے اور مینار
جو مذہبی جشن ہوتے ہیں اور وہ نہایت کثرت سے ہوتے ہیں، ان کے دوران دیوی تالپو
کے لئے جانوروں کی قربانی ہوتی ہے اور ان کے خون سے ماتھوں پر جو تلک لگائے جاتے
ہیں وہ پاکیزگی اور پارسائی تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ ہیں۔ یعنی شارٹ کٹ ہیں۔
اور اسی کل چوک میں ایک اور مینار ہے۔ جسے ”بسنٹ مینار“ کہا جاتا ہے۔
یہ بسنٹ مینار کھٹنڈو کے دربار سکوتر میں کیوں ہے لاہور کے بھائی دروازے کے
سامنے کیوں نہیں ہے اس کی سمجھ نہیں آئی۔ بسنٹ ہم مناتے ہیں اور مینار انہوں نے
کھڑا کر دیا ہے۔

کے منتظر تھے۔ اگر یہ صرف حیرت سے زندہ ہو سکتے تو کب کے ہو چکے ہوتے۔ ان کے
لئے تو صرف میری حیرت ہی کافی تھی۔ وہ کھڑکیاں اور جھکاؤ والی چھتیں اپنے سامنے ایک
تائینا کی طرح نہیں نکلتی تھیں بلکہ ایک تریچھے زاویے پر آپ پر جھکتی چلی آتی تھیں اور
آپ کو دیکھتی تھیں اور میں ذرا سرنگوں ہوتا تھا کہ لکڑی کے طلسم کا یہ جنگل جسے انسان
کے عقیدے نے جنم دیا ہے ابھی مجھ پر گر جائے گا۔

یہ وہی پیچیدہ اور مریض مینا کاری تھی جو قصر الحما کے ایوانوں میں گچ اور چُونے
سے کی گئی تھی۔ ماہلی کے مقبروں میں سُرخ پتھر میں بھی یہی کاریگری غروب آفتاب میں
سُرخ ہو کر اک جہان حیرت وجود میں لاتی تھی جو انسان کو گنگ کر دیتا تھا۔ وہ بولنے جو گا
نہیں رہتا تھا۔ تخلیق کار کافر ہو یا مومن۔ اگر وہ دل کی گہرائی سے عقیدے پر یقین رکھتا
ہے تو اس کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ بدن کے اس مقام پر اثر کرتی ہے جس کا
کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ میں نے اگرچہ واڈی کھٹنڈو کی پہاڑیوں کو اور کشور ہندوستان کی
فصیل کو جس میں بے شک ایورسٹ اور اناپورنا سر بلند تھے اپنے ایبٹ آباد اور کے ٹو سے
کتر جانا تھا لیکن۔ اس محل کی چوہی کاری اور ایسی کڑھائی کو جیسے وہ ایک پھول دار فتر
ہو۔ جھار ہو۔ جیسے لکڑی میں گونے کناری کا کام ہو لاہور شہر کے جھروکوں اور کھڑکیوں کی
نسبت بہت برتر جاتا۔

صدیوں پیشتر کہیں ایک جنگل تھا جو انسانی ہاتھوں نے موم کیا، اسے سنوارا
سنگھارا پھر اس سے پتے بوٹے اور بلیں بنائیں اور ان کے درمیان میں دیوی دیوتاؤں
کے معبد بنائے اور اسے لاکر کھٹنڈو دربار میں بڑے چوک کے سامنے رکھ دیا۔ اور مجھے یہ
بھی یقین ہے کہ وہ لوگ جب اسے کھودتے تھے اس کی جھالیں دیوی دیوتاؤں کے
بناتے تھے تو وہ جانتے تھے کہ صدیوں بعد ایک سیاح آئے گا جو سر اٹھا کر اسے دیکھے گا تو
اس کی گردن کی ہڈی میں ایک بوسدی لہرائے گی اور وہ کہے گا کہ یہ کیا ہے جس کی مجھے
خبر نہ تھی۔ اس لئے کہ جب کبھی کوئی سنگ تراش ”فاسٹنگ بدھا“ یا ”ڈیوڈ“ تراشا ہے تو
اسے صدیوں بعد اسے دیکھنے والے کسی ایک سیاح کی آنکھوں میں در آنے والی حیرت کا
علم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ متوقع حیرت ہوتی ہے جو اسے تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔
میں اس محل کے اندر نہیں جا سکتا تھا کہ یہ اب بھی عوام الناس کی آنکھوں کے

ایک لاہوریا ہو اور اُس کی اُنکلیوں پر اب بھی ڈور کے تیز شیشے سے کٹنے کے نامعلوم نشان ہوں۔ وہ اب بھی شور بے میں اُنکلیاں ڈالنے سے جھجکتا ہو کہ کہیں تیز مرچیں ”چیروں“ کے آندر جا کر اذیت نہ دیں تو یہ لاہوریا تو ہر صورت اس بسنت مینار کے سامنے ٹھہرے گا کہ یہ یہاں کیوں ہے بھائی دروازے کے سامنے المتادہ کیوں نہیں... اس مینار کو بسنت چیمپی کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔

یہ تہوار یہاں بھی بہار کی آمد پر جنوری فروری کے دنوں میں منایا جاتا ہے اور حیرت انگیز طور پر پنجاب کی طرح وادی نیپال میں بھی اُنہی دنوں میں سرسوں کے کھیت زرد زو چینی شہزادیوں کے چہروں کی طرح بسنتی ہوتے ہیں۔ ایسے بسنتی کہ اُن سے ایک چولارنگا جاسکتا ہے۔

اسی تہوار کے موقع پر علم اور عرفان کی دیوی سرسوتی کی پوجا ہوتی ہے۔

یہ وہی دیوی ہے جسے چولستان میں بالآخر خشک ہو جانے والے... ویدوں کے زمانے کے دریا سرسوتی کے نام سے پکارا گیا۔ جس کے کناروں پر پاروشنی رہتی تھی... اور چن اور سومرو جس کے کناروں پر آباد تھے۔

پکلی جس کی مٹی سے برتن بناتی تھی اور اُن پر ایسے ایسے گل بوٹے ایکٹی تھی کہ جب تین ہزار برس بعد قلعہ ڈیر اور کی رات میں کیپٹن مردان علی ریت کُریڈتے ہوئے ایک ٹھیکری دریافت کرتا ہے اور اُسے الاؤ کی روشنی میں دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ یہ کس کے ہاتھ تھے جنہوں نے یہ گل بوٹے اُلکے تھے۔

وہ ”بہاؤ“ کے ہتھ جانے سے آگاہ تھا اور ”راکھ“ کو اپنے چہرے سے پونچھتا تھا۔

تو یہ وہی سرسوتی تھی جو چولستان کے صحراؤں میں بہتی تھی اور اب ایک دیوی کی صورت نیپال میں ٹھہراؤ میں تھی۔

جو طالب علم کسی امتحان کی تیاری میں ہوتے ہیں اور کامیابی کے متمنی ہوتے ہیں تو وہ سرسوتی کی پرستش کے لئے آتے ہیں... پوجا کرتے ہیں اور بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

اور بسنت کے تہوار پر ہزاروں پجاری سرسوتی کے مندر میں سر بسجود ہوتے ہیں

اور پھر شاہ نیپال بہار کے گیت گاتی ناریوں کے جلو میں اس میلے کا افتتاح کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ معصوم نیپالی لوگ نہیں جانتے۔ ہرگز آگاہ نہیں ہیں کہ بہار کی آمد کا یہ تہوار صرف پاکستان کے شہر لاہور میں منایا جاتا ہے۔ اہل لاہور اگرچہ سرسوتی کے پجاری نہیں لیکن بہار کے پجاری ہیں۔ اور تب اس تحت لاہور کے جھروکے اور درد، یوار اور راتیں فلڈ لائٹس سے منور ہوتی ہیں، بجلی کے چاند آسمان کو روشن کرتے ہیں اور اہل لاہور اس سکرچاندنی کے آسمان پر اُڑتی ہر پتنگ کی اُڑان میں ایک سرسوتی دیوی دیکھتے ہیں۔

ہر سُدھ گڈے کو فضا میں اُٹھتے دیکھ کر اُسے لارڈ شیوا سے زیادہ متبرک جانتے ہیں۔ ہر ”چھترے“ کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ اُنہیں ہنومان جی سے کہیں بڑھ کر پوتر دکھائی دیتا ہے۔

اور وہ ”کپ“ جو کندھے مارتا تخت لاہور کی فسیلوں کی قید سے آزاد ہو کر ناک کی سیدھ میں فلک کو جاتا ہے۔ ایک ایسے بدھ کی طرح دکھائی دیتا ہے جو اپنے شاہی محل کی قید میں سے نکل کر آسمانی جنگوں کا رخ کرتا ہے۔

لاہور کے آسمان پر بسنت کے دن دیوی دیوتاؤں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور... اور اُن کے پجاری اُن کی ڈور تھامے انہیں اپنی نظروں کے مندروں میں سجالے اُن کی پوجا کرتے ہیں اور زخمی اُنکلیوں کا بلیدان کرتے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ دیوی دیوتا لاہوری آسمان پر اُڑان کرتے ہیں بلکہ جب وہ کٹ جاتے ہیں... عرف عام میں ”بو“ ہو جاتے ہیں تو اہل لاہور اُن کے پیچھے گلیوں بازاروں منڈیروں اور سڑکوں پر پاگل پجاریوں کی طرح اُن کے حصول کے لئے جان داؤ پر لگا دیتے ہیں کہ کہیں ان کے پوتر بدن زمین سے نہ چھو جائیں، وہ اُنہیں فضا میں ہی دبوچ لیتے ہیں زمین پر گرنے نہیں دیتے۔

ایسے مومن پجاری بھلا دیوی دیوتاؤں کے نصیب میں کب آئے ہوں گے۔

اک دن رہیں بسنت میں

اک دن جنیں بہار میں

اک دن پھریں بے انت میں

تھی.. ہم مشرقیوں کو تو صدیوں سے اس کی خبر تھی لیکن اُس ایک زمانے میں یہ خبر یورپی اور امریکی بیبوں تک بھی پہنچ گئی.. کہ یہ وہی حشیش ہے جو حسن بن صباح کی جنت میں لے جاتی ہے...

پہی کلچر اور فلاور کلچر اپنے عروج پر تھا...

اور حشیش کی دیوی بلند ترین سنگھاس پر براجمان ڈھواں دیتی تھی...

میں اُن زمانوں میں زمینی راستے سے یورپ کی جانب سفر کرتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے میں کسی دُن وے سٹریٹ میں ٹریفک کی خلاف ورزی کر رہا ہوں کہ میں واحد مسافر ہوتا تھا جو اُس سمت میں سفر کرتا تھا اور بقیہ کل خدائی یورپ اور امریکہ سے اپنی پھٹی ہوئی جینوں اور نیکروں میں بے ترتیب دائیوں اور ڈھیلی چولیوں میں، بے خواب آنکھوں میں ہرے کرشنا ہرے راما الاپتی ہوئی میرے پاس سے گذرتی جاتی تھی اور اُن سب کی منزل نیپال ہوتی تھی۔ میں ایک تنہا مسافر اُن کے دیاروں کی جانب اور اُن کا جم غفیر سُہری گھاس کی تلاش میں حشیش اور پہی کیسپٹل آف دی ورلڈ، کھٹنڈو کی جانب... جیسے قدیم زمانوں میں تمام شاہراہیں روم کو جاتی تھیں ایسے اُس مایوس اور نامراد عمد کے باشندوں کے سارے راستے کھٹنڈو کو جاتے تھے...

اُنہی زمانوں میں دربار چوک کا ماجو دیول مندر پہی مرد و زن کے لئے مخصوص ہوا.. اور ”پہی ٹپل“ کہلایا.. ارزاں چرس کے شوٹے لگا کر وہ نروان کی منزلیں طے کرتے تھے لیکن وہ جلدی کے کام کو شیطان کا کام سمجھتے تھے اس لئے ایک سگرٹ کے بعد صرف ایک سیڑھی طے کرتے تھے.. اور بالآخر جب وہ اس مندر کی آخری سیڑھی پر پہنچتے تھے اور کھٹنڈو دادی کے فضائی منظر پر ایک نظر کرتے تھے تو اُس لئے لڑھکتے ہوئے نیچے دربار سکور میں لینڈ کر جاتے تھے اور آخری سیڑھی پر اوندھے ہونے کے بعد ہرے کرشنا ہرے راما کا نعرہ بلند کرتے ہوئے پھر سیڑھیاں طے کرتے گرتے پڑتے اوپر اٹھتے تھے.. نروان کی منزلیں کتنی کٹھن ہوتی ہیں۔ اُن کی راتیں دربار چوک، سستے ہوٹلوں اور فٹ پاتھوں پر گزرتی تھیں اور وہ وہاں زیادہ جگہ نہیں گھیرتے تھے۔ ایک شخص کی جگہ پر دو بدن بسیرا کرتے تھے کیونکہ شنید ہے کہ چرس کے نشے میں انسان جس کام پر جُت جائے بس جُتا ہی رہتا ہے تاآنکہ پولیس دخل اندازی نہ کرے...

اک دِن چلیں خمار میں

دو دِن زکیں گرہست میں

اک دِن کسی دیار میں...

اک دِن رہیں بسنت میں...

یہ ایک مہادیو منیر نیازی کہتا ہے۔

حیاتی کے کسی ایک دِن بسنت میں رہنا...

کسی اک دِن بہار میں جینا...

کسی بے انت میں ایک دِن پھرنا...

اور کسی ایک روز خمار میں چلنا...

بس یہی زندگی کا انت ہے...

بسنت پور مینار کے آس پاس نیپال کے آسمان پر ایک دھوکا باز شام اُترتی تھی، کوئی فلڈ لائٹس کی مگر چاندنی نہ تھی اور نہ کوئی پتنگ اس چاندنی میں راستے بتاتی تھی تو کیسی بسنت تھی... یہ کیسا بسنت بخار تھا؟

اسی دربار چوک میں جو اس کو مرعوب کرنے والا شاندار مندر ”ماجو دیول“ ہے جس کی سیڑھیاں شہر روم کی رومن سیڑھیوں کی طرح آسمان کو اُٹھتی چلی جاتی ہیں۔ کسی ردی لکشی نے اسے 1690ء میں شیوا کی پرستش کے لئے تعمیر کیا تھا.. پرکاش کا کہنا تھا کہ اگر ہم اس کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر جائیں تو وہاں وادی کھٹنڈو کا ایسا فضائی منظر ہو گا جو کسی اور مقام سے دکھائی نہیں دیتا.. ہم نے اُن سینکڑوں سیڑھیوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا، نیپالی بھائی، ہمیں تمہارے بیان پر پورا یقین ہے، اگر شک ہو تا تو ضرور اوپر جا کر دیکھتے...

ماجو دیول مندر کو عرف عام میں ”پہی ٹپل“ کہا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا... اور وہ زمانہ میری آوارہ، آوارہ گردیوں کے زمانوں کی قربت میں تھا.. جب حشیش ایک دیوی تھی جس کی ایک دنیا بچاری تھی.. اس کے ہرے بھرے اوپن ایئر معبد ایران، افغانستان اور پاکستان میں بکثرت تھے جہاں ملنگ بابوں کی صدیوں سے یہ ایک روحانی خوراک تھی اور درگاہوں اور خانقاہوں میں اس کا دھواں اگر تیبوں اور موم تیبوں کے دھویں سے مل کر انہیں وہاں لے جاتا تھا جہاں سے اُن کو اپنی خبر بھی نہیں آتی

لیکن کھنڈو میں کون دیکھتا تھا کہ کون کس کام میں جتا ہوا ہے کیونکہ اُن کے دیوی دیوتاؤں کا بھی تو یہی مشغلہ تھا۔ وہ بھی جتنے رہتے تھے...

لیکن دم مارنے کا وہ عہد گذر چکا تھا...

آج کے عہد میں جو نشے اور نردان رائج تھے اُن کے مقابلے میں یہی بہت معصوم لوگ تھے۔ ”یہی ٹپل“ کے برابر میں ایک منقش اور سُہری چبوترے پر موم بیوں اور دیوں کی جھلمل میں ایک صحن میں دو بہت بڑے اور نہ سمجھ میں آنے والی وسعت اور پھیلاؤ کے ڈھول یا ڈرم رکھے ہوئے تھے...

میں نے بچپن میں ایک فلم ”چندر لیکھا“ دیکھی تھی جس کے اختتام پر ایک رقصہ بڑے بڑے ڈھولوں پر ناچتی تھی۔ یہ اُن کی نسبت بہت بڑے تھے...

یہ وہ جمالی ساز کے طبلے تھے جنہیں کوئی استاد شوکت حسین یا ذاکر حسین نہیں بجا سکتا تھا البتہ ان پر کنول آسن میں بیٹھ کر ڈھونی مارا جاتا تھا۔ یا پھر پنگ پانگ کی گیم کھیل سکتا تھا۔ ڈھولوں کا محافظ ایک پجاری یہ قیاس کرتے ہوئے کہ کوئی اُسے نہ دیکھتا تھا بار بار اپنی دھوتی کے اندر ہاتھ ڈال کر بدن سے چپکے ہوئے اور لٹکتے ہوئے حصوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا تھا...

ان دو عظیم الشان ڈھولوں کو سال میں صرف ایک بار نہایت مشکل اور دشوار تلفظ والے دیوتا، دیگوتا، دیگوتا، دیگوتا کے اعزاز میں پینا جاتا تھا۔ اگر صرف مشکل نام والا ہی ان ڈھولوں کے پیئے جانے کا مستحق ٹھہرتا ہے تو پھر انہیں میرے اعزاز میں سال میں متعدد بار پینا جانا چاہئے تھا۔ ان ڈھولوں کے سامنے دربار چوک میں ایک بلند مینار پر ایک فوت شدہ شاہ نیپال پر تپ نلا۔ (اور اسے اب بھی ملانا پڑھا جائے) کا مجسمہ اپنے تاج پر ایک کلنی نما اعزاز سجائے براجمان ہے۔ اور اس نوعیت کی کلنی۔ سفید پروں والی آج بھی شاہان نیپال کے سروں میں سے بلند ہوتی ہے یا ہمارے ہاں کے اسیل مرغ یہی خصوصیت رکھتے ہیں۔ اور اس مینار پر وادی کھنڈو پر شاہانہ نظرس بچھائے ہوئے اس مجسمے کی خاصیت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے پہلو میں اُن کے چار بیٹے اور دو عدد بیگمات سرنگوں بیٹھی ہیں...

یہاں بھی وہی اصول کار فرما تھا جو مغل مختصر تصاویر میں مد نظر رکھا جاتا تھا۔ یعنی بادشاہ وقت کا قد سب سے اونچا ہوتا تھا پھر وزیر کبیر اور درباری سر جھکائے اُن سے قد

میں چھوٹے ہوتے تھے۔ درباری اہلکار مزید مختصر ہوتے تھے اور جب عوام الناس کی باری آتی تھی تو وہ ٹھکنے بنا دیئے جاتے تھے...

آج بھی عوام الناس ٹھکنے اور بے توقیر بنائے جاتے ہیں۔

پنچاچہ شاہ کے بیٹے اور بیگمات شاہ کی نسبت قدرے مختصر اور منظر سے ذرا پرے بیٹے ہوئے تھے تاکہ شاہ کی کلنی کو حرکت کرنے میں دقت نہ ہو۔

شاہ صاحب کے مینار کے سائے میں، ایک اور عمارت ہے اور یقیناً ایک اور مندر ہے۔ یہاں لوہے کی جالیوں کے اندر ایک نہایت ڈراؤنا۔ سُہری نقاب ہے۔ جو ایک اور مشکل نام والے خدا کا ہے۔ یعنی سوتیا بھیراب کا ہے۔ اور یہ سخت شرابی قسم کا نقاب ہے...

نہایت وحشی اور ڈرا دینے والی شکل کا نقاب۔ ایک چہرہ۔ جو لوہے کی جالیوں کے پیچھے قید اور ہر آنے جانے والے کی جانب پھنکارتا ہے اور قہر کی نگاہیں ڈالتا ہے۔

اس کی قسمت بھی مقدس ڈھولوں کی طرح سال میں ایک مرتبہ بیدار ہوتی ہے۔

ستمبر کے مہینے میں...

اندر جاتا کے دن...

اُس روز اس کے کھلے اور ہولناک منہ سے مقامی بیڑ کی آبشاریں اُبلتی ہیں اور یا تری ایک دوسرے کو دھکیلتے اپنے منہ کھولے اس سوم رس کے چند قطروں کے لئے ترستے ہیں اور انہیں اپنے حلق سے اُتارتے ہوئے نردان پاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ گھر لوٹتے ہوئے اُن کا سائیکل رکشا بک کر پولیس اُن کے منہ نہیں ٹونگھے گی...

یہ شرابی آبشار کسی معجزے کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہوتی بلکہ نقاب کے عقب میں پوشیدہ پجاری حضرات بیڑ کی بالٹیاں بھر بھر کے سوتیا بھیراب کو سیراب کرتے ہیں۔

ہم اگرچہ شراب یعنی ام الحباثت کو صدق دل سے حرام گردانتے ہیں لیکن جتنی توصیف ہمارے ادب اور شاعری میں اس مشروب کی ہوئی ہے وہ محبوب کی بھی نہیں

لاڑ و نخل میں ٹہائیاں ہوں گے.. لیکن سب کہاں...
اور ہمیں.. ماسان چوک کی گماگمی میں.. کئی کے بھٹوں کو بھونتی ہوئی نادار نیپالی
خواتین کے نیم برہنگی سے بھرے ہوئے چوک میں وہ چپک جانے والا.. بالوں میں پھنسی
چونگم کی طرح لاچار کر دینے والا.. جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو.. اپنے آپ کو
ہمارے ساتھ نشئی کر دینے والا.. پرکاش کہتا ہے ”دیوی دیکھو گے؟“

”کس قسم کی دیوی؟“

”لوگ گاڈلیں... زندہ دیوی“

شام ڈھلتی تھی.. یا شاید ڈھل چکی تھی ”ایک اور دیوی؟“

ہر شخص کی ایک اپنی اپنی زندہ دیوی ہوتی ہے جس کو وہ آخری سچ گردانتا ہے..
اُس کی پرستش کرتا ہے۔

کسی کی دیوی بینک اکاؤنٹ میں اضافہ کرتے ہوئے جادوئی ہندسوں میں براجمان
ہوتی ہے... کوئی اپنے عقیدے پر اتنا پختہ اور سنگلاخ ہوتا ہے کہ اُس کے خیال میں جنت
کا جو دروازہ کھلے گا صرف اُس کے لئے کھلے گا..

کوئی تصویر کی دیوی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور کوئی تحریر کی دیوی میں قید
ہوتا ہے.. تو یہ دیوی کونسی ہے؟...

”اُس کا نام.. کماری ہے“ پرکاش نے ڈھل چکی شام میں ہم سب کی جانب شطرنج
کے ایک ایسے کھلاڑی کی مانند دیکھا جو شہہ چال چل کر ہمیں مات دینے کو تھا.. کیا یہ ستیا
میرے دام میں پھنس چکے ہیں.. اور ہم اُس کی چرب زبانی کے فریب میں دھیرے دھیرے
پھنستے چلے جاتے تھے.. اُس کی باتوں کی دلدل میں آدھے آدھے دھستے چلے جاتے تھے..
”صاحب وہ لوگ گاڈلیں ہے.. یہاں تک کہ شاہ نیپال بھی اُس کے سامنے جھکتا ہے...
درشن کرتا ہے۔“

سُہری بابا اس طویل تفصیل سے تنگ آچکے تھے چنانچہ انہوں نے ایک نہایت
بنیاد پرست مسلمان کی طرح اپنی سُہری داڑھی پر ایک دھکی آمیز جھاڑو پھیرا ”اوائے
مشرک... نیپالی راہبر... کہاں ہے وہ دیوی...“
”صاحب... اُس کا نام... کماری ہے۔“

ہوئی۔ نہایت پاکیزہ منش صوفی بھی یہی کہتے ہیں کہ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر۔ اور
اُمت مسلمہ کی یگانگت کے لئے بھی کسی نہ کسی ساقی کو ہی طلب کرتے ہیں۔ بتا کیا تو میرا
ساقی نہیں ہے۔ تیرے شیشے میں سے باقی نہیں ہے؟ جتنے بھی استعارے ہیں وہ سب کے
سب مخمور حالت میں ہیں.. شراب کو مننی کر دیا جائے تو ہمارا شعری سرمایہ.. بے شک وہ
فارسی کا ہو یا اردو کا.. رُو دکھا، بے رنگ اور بے جان سا ہو جاتا ہے۔

میں نے ایک بار فراز سے یہی سوال کیا...

اُس نے اپنے خراب زدہ گھٹنگہ والے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا ”تارڑ پڑو“

کچھ ممنوع ہے.. وہی شاعری ہے۔“

اک دن رہیں خمار میں...

اور میں سے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا...

میں نے سوچا اُس روز جب سوتیا بھیراب کے نقاب میں سے اس آپ ممنوعہ کی
آبشاریں اُہلتی ہیں اور پجاریوں کے سوکھے ہوئے حلق تر کرتی ہیں.. تب.. ادھر دربار
چوک میں شاہ نیپال کی کلفی کے نیچے بیٹھے.. بڑے ڈھولوں کے سائے میں.. عزیز میاں تواری
پارٹی کو ”میں شرابی.. میں شرابی“ کی وجد آفریں تواری کرنی چاہئے.. یا مٹی بیگم کو ادھر ہونا
چاہئے اپنی عجیب سی ناک اور ہارٹونیم کے ساتھ.. کہ..... اور اگر نصرت زندہ ہوتے اور وہ
اس دربار چوک میں اپنی بدھا جسامت کے ساتھ ”یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے.. یہ تری نظر کا
قصور ہے..“ الاپتے.. تو سوتیا بھیراب اپنا نقاب اُلٹ دیتے..

اگر ہنومان دھوکا دربار کے علاقے کو مندروں اور دیوتاؤں کی افرا تفری اور اہتری
کا مجموعہ کہتے ہیں تو اس میں جھوٹ کا شائبہ بہت کم ہے..

اور اس کے آخر میں سائیکل رکشوں سے اٹا ہوا.. کئی کے بھٹوں کو بھونتی ہوئی
نادار نیپالی خواتین کی نیم برہنگی سے بھرا ہوا وہ چوک ہے جسے ”مردوں کو جلانے کا صحن“
کہا جاتا ہے.. ماسان چوک کہا جاتا ہے۔

یہاں کتنے لاکھوں انسانوں کی راکھ ہوگی، جس پر ہم چلتے تھے..

اور اس راکھ کا ہر ذرہ اپنے عقیدے پر حمل ایمان رکھتے ہوئے راکھ ہوا ہو گا..

جیسے قبرستان میانی صاحب لاہور میں مدفون لاکھوں لوگ اس خیال میں راکھ ہوئے کہ وہ

”ہیں۔“ گرل گائیڈ ہمیشہ فوراً چوکتی ہو گئیں اور جب وہ چوکتی ہوتی تھیں تو اُن کی عینک کا فریم بھی چوکنہ ہو جاتا تھا ”ہیں۔ یہ جو کماری ہیں تو کیا مینا کماری ہیں۔ ہم نے اُن کی فلم ”پاکیزہ“ دیکھی تھی۔ اور کیا مجرا کرتی تھیں یہ پاکیزہ مینا کماری۔“

”مینا کماری“ پُرکاش نے ناک چڑھا کر ہمیشہ کی شافی پس ماندگی پر ماتم کیا ”میڈم یہ کوئی ایکٹرس نہیں، زندہ دیوی ہے۔“

”سوری پُرکاش بھائی...“ ہمیشہ فوراً بیک آؤٹ کر گئیں۔ ”تو یہ کماری کیسے کماری ہو جاتی ہے؟“

”ادھر شاکیہ قبیلے میں ایسا جنم ہوتا ہے کہ شیوا اور ہنومان جی کا زور اور آسمانی پاکیزگی اس میں داخل ہو جاتا ہے تو سب لوگ جان جاتا ہے اس بچی میں جو بولتا ہے دیوی دیوتا بولتا ہے۔ اور پجاری لوگ بھی جان جاتا ہے۔ اُسے پہچان جاتا ہے تو پھر اُس کا امتحان لینے کے لئے بھینس اور بھینسا کا بلی کرتے ہیں۔“

”بلی یا بلی...“ فاروق کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا تھا حالانکہ یہاں دیوی دیوتاؤں کا مستقبل نہر بحث تھا۔

”بلی...“

”یہ بلی کیا ہوتا ہے؟“ خالدہ نے چپکے سے ایک ایسی سرگوشی کی جو اعلیٰ ترین سنگھاسن پر براجمان بھگوان بھی نہ سن سکتا۔

”جانور کا سر کاٹنا ہے۔ دیوتا کے لئے“

”اچھا اچھا“ سُہری بابا نے فوراً اپنی دانشمندی کا مظاہرہ کیا ”یعنی ادھر یہ قربان ہوتا ہے۔ قربانی ہوتا ہے۔ تو پھر؟“

”تو پھر صاحب۔ جو بلیدان کا بھینس اور بھینچا ہوتا ہے اُس کو کاٹنا ہے تو اُس میں سے اتنا خُون نکلتا ہے اتنا خُون نکلتا ہے کہ دریائے بھاگ متی میں اتنا پانی نہیں ہو گا اور وہ ترپتا ہے۔“

”یعنی آخر شب دید کے قابل تھی لسل کی ترپ...“ سُہری بابا نے مزید دانش مندی کا مظاہرہ کیا اور ہم اُن سے تنگ آچکے تھے۔

پُرکاش نے منہ کھول کر اُن کی جانب دیکھا ”سوری بر۔ آپ نے کیا کہا؟“

”آپ ذرا چُپ کر جائیں ناں۔“ خالدہ نے ایک مدہم دوہائی دی ”اتنی انٹرنسٹنگ

سنووری بنا رہا ہے۔ تو پھر کیا ہوتا ہے پُرکاش جی؟“

”تو پھر میڈم اُس بچی کو لاتے ہیں اور وہ اُس خُون پر چلتی ہے۔ بلیدان کے اوپر

پاؤں رکھتی ہے اور اِس کے ارد گرد بھینس اور بھینسے کا گوشت ترپتا ہے اور میڈم یہ اتنا

ہور جاتا ہے کہ بہت بہادر آدمی بھی دیکھ نہیں سکتا۔ اور اگر وہ بچی اس خُون پر

چلتے ہوئے بالکل نہ ڈرے۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی خوف نہ ہو تو پھر اُس کو کماری بنا

دیتا ہے۔ اور اب جو کماری ہے وہ اِس مندر میں رہتا ہے۔“

شام ڈھل چکی تھی۔

اُس میں ایسی سیاہی تھی کہ رنگوں کی شناخت نہ ہوتی تھی۔

ہم ایک دوسرے کے چہرے آسانی سے پہچان نہ سکتے تھے۔

دربار چوک میں کہیں کہیں جو لیمپ پوسٹ تھے اُن کی روشنی اس سیاہی میں دور

تک جانے سے قاصر تھی اور ایک منعموم کیفیت میں بھجتی جاتی تھی۔

اور اِس گھلتی سیاہی میں ہمارے سامنے ایک مختصر اور بوسیدہ اور قدیم ساخت کا

مندر تھا۔ کماری ہمارا کماری گھر تھا۔

شاکیہ نسل کی کنواری کماری کا گھر تھا۔ زندہ دیوی جو دیوتا تالیجو کا دوبارہ ظہور

تھا۔ تین منزلہ عمارت جس کا ماتھانیاپالی ثقافت کی دو خوبیوں سے نمایاں ہوتا تھا۔ اینٹوں کا

خوشنما کام اور دیدہ زیب کڑھائی والی منقش کھڑکیاں۔

شنید ہے کہ بے پُرکاش ملانے اس مذہبی عقیدے کا آغاز کیا تھا اور آج سے دو

سو برس پیشتر پہلی بار دریافت کیا تھا کہ ہر زمانے میں ایک زندہ دیوی ہوتی ہے۔ اور اُسے

بھگت لوگوں کے سامنے لانا چاہئے۔

مندر کے باہر اُس عظیم رتھ کے سپتیرپارش ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے

اُس دن کا انتظار کر رہے تھے جب اُنہیں جوڑا جائے گا۔ ہماری نیل گاڑیوں ایسے لکڑی

کے پیچھے جو دوسری منزل تک پہنچتے تھے، شہتیر اور چوہنی چھتریاں۔ اور اندر جاترا کے جشن

کے دن یہ رتھ تیار ہو گی۔ اور کماری اس پر سوار ہو کر کھٹنڈو شہر کی گلیوں اور بازاروں

میں درشن دے گی۔ اور سینکڑوں عقیدت مند اس رتھ کو کھینچ رہے ہوں گے اور

”اندر جاترا“ کا تہوار جب کماری رتھ میں سوار ہو کر نکلتی ہے تو یہ رتھ اور خوشی کا تہوار ہوتا ہے۔ اٹھ روز تک بدھ اور ہندو یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ کون ہیں۔۔۔

کی جانناں میں کون او بلہیا۔ کی جانناں میں کون۔۔۔

اندر جاترا کے جشن کے پہلے ون بارش کے دیوتا اندر کی یاد میں ایک کھمبا المستادہ کیا جاتا ہے اور اُس کے گرد نقاب پوش راقص والمانہ رتھ کرتے ہیں۔۔۔

اس رتھ کے انداز اور طور طریقے قدیم دیومالائی دُھند میں سے نمودار ہوتے ہیں اور انسان کے ازلی خوف اور اُس خوف سے جنم لینے والے عقیدے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اور پھر اس تہوار کے تیسرے روز کماری اپنے گھر سے باہر آتی ہے۔ اُس عظیم رتھ پر سوار ہوتی ہے اور اُس کے جلو میں اُس کے ماتحت دیوی دیوتا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ گنیش اور بھیراب بھی اُس کے چرنوں میں بیٹھتے ہیں کہ وہ محض پتھر ہیں اور کماری زندہ ہے۔۔۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ وہی تیسرا دن ہے جب نیپال کے شاہوں کے اجداد نے اس سلطنت کو فتح کیا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے لشکر کا اظہار کماری کے قدموں میں سمر رکھ کر کرتے ہیں۔

پھر ایک صحن دکھائی دیا۔۔۔

اس چوکور صحن میں۔۔۔ شام کی سیاہی میں ارد گرد جو مندر کے در دیوار تھے وہ بھی ڈھلتی شام میں یوں ڈھلتے تھے جیسے سیاہ سونا سانچے میں ڈھلتا ہے۔۔۔

صحن میں اور تاریکی میں بشکل دکھائی دیتے صحن میں ایک آہنی جینگلے میں مہاتما بدھ کی ایک مورتی تھی۔ اُن کی ایک زیارت تھی جو اپنے سانس کے ہمراہ کھنکا گھوڑے پر سوار ایک شب عیش کی زندگی سے نکل گئے تھے اور پھر اُن کی فاقہ زدہ پسلیوں اور دھیان میں بندھے ہوئے ہاتھوں میں پرندوں نے گھونسلے بنائے تھے۔۔۔

ایک درگاہ تھی۔۔۔

بدھ کے چرنوں میں دو موم بتیاں کھپاتی تھیں۔۔۔ پھول اور چاول تھے۔ چند سکتے

شاہ نیپال اُس کے سامنے سر بسجود ہو گا۔۔۔

شام کی سیاہی ایسی تھی کہ ہم اس کماری گھر کے اندر جانے سے جھجکتے تھے۔ ہم اپنی جھجک ظاہر تو نہ کرتے تھے لیکن ذرا سستی سے قدم اٹھاتے تھے تاکہ کماری گھر کے دروازے میں پہلا قدم کسی اور کا ہو ہمارا نہ ہو۔

تب خالدہ نے ایک سیکی سی سسکی لی اور پلٹ کر کہا ”تار ڈ صاحب کھوپڑیاں۔۔۔“

”ہائیں۔۔۔ طاہرہ بی بی نے خالدہ کے کندھے پر ایک لرزتا ہوا ہاتھ رکھا ”کس کی کھوپڑیاں؟“

”بھئی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ“ سُہری بابا تاریکی میں بھی ذرا زرد ہو گئے ”اجنبی دیس ہے۔ یہاں پتہ نہیں کیا کیا کافر سحر اور جادو ٹونے ہیں تو۔۔۔ اندر جانے کی کیا ضرورت ہے اگر ادھر کھوپڑیاں ہیں۔۔۔“

”کدھر ہیں کھوپڑیاں؟“ فاروق نے سینہ تان کر کہا۔۔۔

”ادھر۔۔۔ دروازے کی چوکھٹ کے گرد۔۔۔ خالدہ نے خاموشی کی حد کو چھوتے سم کے ساتھ ہٹ کر کہا۔

کماری کے مندر کے اُس چوکھٹ کے گرد جو ڈھل چکی شام میں تھا لکڑی کی کھوپڑیوں کے ہار تھے۔ پُرکاش حیرانی میں ہمیں دیکھتا تھا کہ یہ دیوی کے درشن کو جھجکتے کیوں ہیں۔۔۔

”اللہ مالک ہے“ گرل گائیڈ نے گویا آتش نمود میں بے خطر کود پڑنے کا تہیہ کر لیا اور دروازے میں داخل ہو گئیں۔۔۔

ایک تاریک سُرنگ سی آئی۔۔۔

پھر ایک صحن دکھائی دیا۔۔۔

نیپال میں ہندو اور بدھ عقیدے آپس میں یوں مدغم ہو چکے ہیں کہ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ ہندو دیوتا اپنے سنگھاسنوں سے ذرا کھسک کر بدھ کے لئے براجمان ہونے کے لئے جگہ بنا دیتے ہیں اور مہاتما اپنے گیان دھیان میں اتنے گم ہیں کہ انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر شیوا یا ہنومان جی اُن کے عقب میں آکھڑے ہوتے ہیں اور گروپ فوٹو بنوا رہے ہیں۔۔۔

تھے اور تلک لگانے کے لئے سرخ رنگ تھا جو تاریکی میں خون رنگ ہوتا تھا...

تاریکی میں فنا میں گم ہوتا ایک صحن تھا جس کے گرد جھروکے اور کھڑکیاں سج ہوئی تھیں اور اُن میں ایک ناآسودگی اور خوف تھا...

ہمارے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا...

ہم اگر رسوم کی قیود میں نہ ہوتے تو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر اس خوف کا ازالہ کرتے.. سفر آپ کو کیسے کیسے ذہنی دھچکوں سے آشنا کرتا ہے...

ایک شب آپ، جیسی کی شدت میں سانس بھی نہیں لے سکتے کہ ”میں ایک گائے کی طرح ہوں“ اور دوسری شام آپ زیورخ کی جھیل کے کنارے اپنے خیمے میں تنہا ہوتے ہیں اور آپ کے پاس اُس کمپننگ سائٹ کا کرایہ تک نہیں ہوتا...

کبھی شاک ہوم کے نواح میں آپ شدید بارش کے دوران اپنے خیمے میں سر اور بھوکے ہوتے ہیں اور پھر برگیٹا اور گتاف کی سٹڈی میں گرم اور آسودہ ٹالسٹائی کی ”کارنیا“ پڑھ رہے ہوتے ہیں اور دل پسند مشروب سے موڑھوں کو گرم کر رہے ہوتے ہیں...

اور کبھی جھیل کرومبر کے پانیوں کی میڑھیوں میں اتر کر اُن کی نم مہک لے ایسے ہوتے ہیں اور اگلے روز کنول جھیل کے کنارے تنہا اور پیاسے ہوتے ہیں۔

آج بھی سفر نے مجھے ایک کچھل شاک سے آشنا کیا تھا... ایک اور دھچکا لگایا تھا...

میں آج صبح کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ میں سے سوا چاکلیٹ اور دوہنی کے چوبیس کیرٹ سونے کے زیور خریدتا تھا... ایک مومن معاشرے میں تھا اور اب اُس صبح کی اِس ڈھل چکی شام میں ایک ایسے بٹ کدے میں کھڑا تھا جس جھروکوں کے اندر ایک لونگ گاڈیس سانس لیتی تھی اور بدھ کے چرنوں میں چراغ جا تھے...

”کماری...“ پرکاش نے سر جھکا کر ایک یا تری سرگوشی میں پکارا...

اور اُس کی آواز سیاہی میں گھلتی ہوئی اوپر تک گئی جہاں چوہی کھڑکیوں کے اندر کچھ کمرے تھے.. تنگ اور تاریک.. اور اُن میں صرف ایک لائین کی روشنی اُن کی تاب اور سیاہی کے سامنے عاجز آ کر دم توڑتی تھی...

”کماری...“ پرکاش نے پھر کہا اور ایسے کہا جیسے تسبیح کا ایک اور دانہ گراتے

ہیں۔

ہم اُس کھڑکی کی جانب تکتے تھے جس میں کماری کے درشن کا ٹک تاریک ہوتا

تھا..

تاریک صحن میں بدھ کے سٹوپا کے گرد ایک آہنی جالی تھی.. اور اُس کے چرنوں میں دو موم بتیاں اپنی ہی آگ سے ٹھکنی ہوتی چلی جاتی تھیں.. دو چراغ تھے.. کیا یہاں ہمیشہ دو چراغ جلتے ہیں...

اور تیسرا چراغ جلانے کون آئے گا..

وہاں.. ہمیشہ چار چراغ جلتے تھے اور سندھڑی اور سیمن کے شہباز قلندر کے چرنوں میں پانچواں چراغ جلانے کے لئے وہی عقیدت مند آئے گا جو یہاں بدھ قلندر کی درگاہ میں تیسرا چراغ جلانے کے لئے آئے گا..

لیکن ہم وہ نہ تھے جو تیسرا یا پانچواں چراغ جلاتے تھے...

ہم تو رسوم و قیود کے پابند وہ مسافر تھے جو اندھیروں میں بھٹکتے تھے اور پھر بھی چراغ جلانے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں روشنی نہ ہو جائے.. کہیں ہمارے چہرے نہ دکھائی دے جائیں.. ہم تو شرغم کے وہ باسی تھے جہاں چراغ جلتے ہی دل بجھ جاتے تھے.. ہم میں تیسرا یا پانچواں چراغ روشن کرنے کی جرأت ہی نہ تھی...

بدھ کے مجتھے کے چرنوں میں روشن دوسرا چراغ اس اُمید میں کہ کبھی تیسرا چراغ بھی جلے گا اپنی لو کو تیز کرتا تھا.. آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو...

”کماری...“

ایک مدت گذر گئی...

جیسے قیس نے لیلیٰ کو پکارا ہو ”لیلیٰ...“ اور صحرا سے کچھ جواب نہ آیا ہو۔

اس خاموشی نے ہمیں شک میں مبتلا کر دیا..

کیا کوئی زندہ دیوی ہے بھی یا نہیں؟

اس ڈھل گئی شام کے پردے کے پیچھے کوئی سچ ہے بھی یا نہیں.. ہم بے وجہ اس

کے درشن کے لئے اتنی طویل مسافتیں طے کر کے آئے ہیں۔

لیکن ہم سب کے سب چپ تھے اور بولتے نہیں تھے...
... کہ کہیں ہمارے بولنے سے کوئی طلسم ٹوٹ نہ جائے.. ہمارے سانس سے کوئی
چراغ بجھ نہ جائے..

سُہری بابا اپنی سُہری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے رُک چکے تھے.. ساکت ہر
گئے تھے اور ذرا بٹ بنے اوپر تکتے تھے..

سندھی کڑھائی کے ایک دل فریب کُرتے میں خالدہ عرف سرگوشی خانم ایک
دوہرے شیڈ کی لپ سنک والے ہونٹوں کو بار بار اپنے دانتوں تلے دباتی تھیں اور اپنے
مختصر قد میں مزید جھکتی ہوئی شام کی سیاہی میں اپنی پلکیں یوں کھولتی تھیں جیسے ایک گیارہ
پنچول پر براجمان ایک تتلی ہولے سے اپنے پَر کھولتی ہے...

گرل گائیڈ طاہرہ کے لب لرزش میں تھے، شاید وہ زیر لب کوئی تسبیح پھروں رہی
تھیں کہ وہ عبادت گذاری اور نیکی کے مراحل میں ہم سب سے آگے تھیں، شاید انہیں
اپنے ایمان کے متزلزل ہونے کا خدشہ تھا اور وہ اپنے عقیدے کے دفاع پر کمر بستہ تھیں۔
فاروق جو شاید زندگی کے کسی بھی پہلو کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا سوائے زندگی
کرنے کے.. اپنی مونچھوں کو بل دیتے دیتے رُک گیا تھا اور وہ بھی خاموش تھا۔

ہنومان دھوکا کے مندروں کے آندر ایک مندر میں ڈھل چکی شام میں ہم سب
رگھر چکے تھے۔ قید ہو چکے تھے.. اس مندر کی آب و ہوا نکل دُنیا سے الگ تھی.. اس کے
موسم میں بھید بھری تاریکی کا راج تھا جس میں سینکڑوں برسوں سے یہاں آنے والے
یا تریوں اور بگھتوں کی تمنائیں اور آشائیں اب بھی سانس لیتی تھیں اور اُن سانسوں کو
اجنبی جانتی تھیں جو ہمارے تھے کہ ان میں کوئی آشنا نہ تھی، عقیدت کی نائینائی نہیں تھی
صرف جاننے کی تمنا تھی اور دو موم بیوں کی روشنی تھی..

”کُماری..“ ایک اوزر سرگوشی ہوئی اور پھر پَر کاش نے اپنی زبان میں بہت مسودہ
ہو کر حالِ دلِ زار بیان کیا جس میں درشن کا لفظ بار بار آتا تھا..

”یہاں سے نکل چلیں تارڑ صاحب..“ طاہرہ نے میرے کندھے کو چھونا چاہا اور
پھر نامحرم جان کر جھجک گئیں ”ان لوگوں کے جادو ٹوٹے ہوتے ہیں.. اور میں کچھ عجیب کی
محسوس کر رہی ہوں“

”آپ کو پتہ نہیں کیوں شوق ہے اس قسم کی... اس قسم کی.. جگہوں پر...“ خالدہ
رُک گئیں..

پھر ایک اور خاموشی اُتری..

”کُماری.. کُماری.. کُماری..“ پَر کاش کی تسبیح کے دانے گرتے گئے..

دوسری منزل پر جو پوشیدہ سی آماجگاہیں تھیں جن میں صرف ایک لائینن جلتی
تھی وہاں کچھ حرکت سی ہوئی.. کچھ سائے ادھر اُدھر ہوئے.. وہاں اور لوگ بھی تھے.. کچھ
ٹائٹس آوازیں، ہم تک آئیں اور ہمیں مزید خوفزدہ کر گئیں..

وہاں دوسری منزل پر تین کھڑکیاں تھیں جن کی درزوں میں سے لائینن کی
روشنی کی باریک کترنیں باہر آتی تھیں.. اور ہمیں واضح طور پر احساس ہوا کہ اُن کے
پیچھے کوئی ہے جو نیچے لارڈ بدھا کے چرنوں میں جلتے چرانوں کی مدھم لومیں ہمارے چہرے
پہچان رہا ہے، جاننے کی کوشش میں ہے کہ درشن کو آنے والے کون ہیں.. انہیں درشن
دینا جائز بھی ہے یا نہیں..

ہم دیکھتے رہے.. جیسے بنی اسرائیل کوہ طور کو دیکھتے تھے..

اوپر ایک کھڑکی کھلی.. لائینن کی روشنی قید میں سے نکل کر مندر کے چوکور صحن
میں پھیل گئی.. بدھ کے مجستے کے خدوخال اور لبداے کی شکنیں نظر آنے لگیں.. ہم نظر
آنے لگے اور پھر وہ روشنی یکدم واپس چلی گئی کہ اُسے کُماری کے وجود نے روک لیا تھا
اور وہ کھڑکی میں کھڑی تھی.. کُماری وہاں تھی..

بہت بنی ٹھنی اور پورے میک آپ میں..

”یہی ہے..“ طاہرہ نے مجھ سے پوچھا..

”پتہ نہیں.. یہ میری پہلی کُماری ہے..“

”پَر کاش..“ خالدہ نیپالی بھائی کی جانب مڑیں ”یہی کُماری ہے؟“

لیکن پَر کاش کہاں منتتا تھا وہ تو جھکا چلا جاتا تھا..

اُس نے ہماری جانب نگاہ نہیں کی.. ایک دیوی کی طرح پجاریوں کے وجود سے
عافل رہی اور اپنے سامنے دیکھتی رہی.. کھڑکی کے فریم میں وہ دیومالا کی ایک تصویر تھی..
اُس کے سر پر ایک چوڑا اور رُو پہلی تاج تھا جیسے ہمارے ہاں ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں

الف لیلا کے بادشاہ سر پر پہنتے ہیں... اُس میں جڑے پتھر لالین کی روشنی کو اپنے اندر جذب کرتے تھے اور بجھتے ہوئے کونوں ایسی لودیتے تھے.. وہ زیادہ سے زیادہ دس برس کی ہوگی...

اُس کے کھیلنے کے دن تھے لیکن وہ دنیا کی واحد لڑکی تھی جو ”دیوی دیوی“ کھیل رہی تھی.. کماری کا پورا ماتھا سُرخ پینٹ سے رنگا ہوا تھا اور اُس سُرخنی کے درمیان میں ایک بہت بڑا سُہری تلک تھا..

آنکھوں میں سے سیاہ سُرمے کی دھاریاں نکل کر کانوں کی لووں تک کھینچی جاتی تھیں...

اسی لئے اُس نے دیر لگائی تھی، وہ میک آپ کر رہی تھی...

اگر وہ ایسا ٹھیکریکل میک آپ نہ کرتی تو کون یقین کرتا کہ وہ لوگ گاؤں میں ہے.. وہ چھٹی ناک والی ایک کم سن دیوی تھی اور اُس کے گلے میں زرد پھولوں کے ہار تھے.. ہمارے ہاں تو ”دیدار“ صرف پیغمبروں کے نصیب میں تھا اور یہاں دیدار عام اور ٹورسٹ لوگ بھی فیض یاب ہو رہے تھے...

اُس کے پوچے ہوئے پینٹ شدہ چہرے کے باوجود اُس کی آنکھوں میں ایک گہری کشش تھی.. اُن میں کوئی نہ کوئی جادو ٹونا تھا جو اُس کی جانب دیکھنے والی آنکھ کو مودب کرنا تھا اور وہ آنکھ جھپکی نہ جاتی تھی...

”درشن...“ پر کاش کا سر جھکتا چلا جاتا تھا.. معلوم نہیں یہ عقیدت تھی یا ایکٹنگ تھی کہ وہ اُسے یقیناً پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا.. ویسے عقیدت اور ایکٹنگ میں بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہوتا.. دونوں کو طاری کرنا پڑتا ہے...

ممتاز مفتی کو روحانیت کا لپکا تھا.. وہ لپک لپک کر اُس کے پاس جاتے تھے اور اپنے شوق سے اُسے نڈھال کر دیتے تھے.. اپنی باکمال لفاظی سے اُسے بے بس کر دیتے تھے.. اسلام آباد کی ایک نجی محفل میں وہ اپنے خصوصی مفتیانہ انداز میں پوچھتے ہیں اور اس انداز میں اُن کا منہ ذرا ٹیڑھا ہوتا ہے اور مخاطب یہ نہیں جانتا کہ وہ سنجیدہ ہیں۔ من کی موج میں آپ کو احمق بنا رہے ہیں وہ پوچھتے ہیں ”تارڑ تارڑ پر ٹیلی ویژن کی شہرت کا جادو نہیں چلا.. میں آج سے دس برس پیشتر تجھ سے ناراض تھا کہ تو لکھنے والا ہے شہرت

کے بازار میں طوائف کیوں ہو گیا ہے.. لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو بہت چالاک ہے.. تو نے شہرت کی راہ کو اپنے لہارے سے جھٹک دیا ہے اور اپنے اندر کے لکھنے والے کو دفن نہیں کیا.. تو یہ بتا کہ ان دنوں تیری تحریر میں جو پانچویں سمت آئی ہے تو یہ کس کی دین ہے؟“

”سَر میں سمت کا تعین کر کے تو نہیں لکھتا..“

”نہیں..“ وہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی موجودگی میں اپنی بوڑھی اور ناتواں اُننگی سیدھی کر کے کہتے ہیں ”نانگا پرہت“ اور ”ہماؤ“ میں تو لکھتے لکھتے کہیں اور نکل جاتا ہے.. سیدھے راستے پر نہیں چلتا.. کسی اور راستے پر نکل جاتا ہے.. یہ تم نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟“

”مفتی جی.. اتنے برس ہو گئے ہیں کاغذ سیاہ کرتے ہوئے تو.. بندے کو جاچ آ جاتی ہے، ڈھنگ آ جاتا ہے..“ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ مفتی صاحب مجھ سے کیا کہلوانا چاہ رہے ہیں اور یوں بھی پچاس ساٹھ لوگ اُن کی جانب اور پھر میری جانب نکلتے تھے کہ یہ کیا معرفت کی باتیں ہو رہی ہیں...

”نہیں...“ مفتی جی نے ایک نہایت کچھری عیار مسکراہٹ میں سر ہلایا اور پھر اپنی اُننگی سیدھی کر کے پروفیسر رفیق اختر کی جانب اشارہ کیا ”یہ تم نے ان سے حاصل نہیں کیا؟“

”نہیں...“

”تو ان کو نہیں مانتا...؟“ مفتی صاحب اُن دنوں پروفیسر صاحب کی تقریباً بیعت کر چکے تھے.. گو جرج خان کے پروفیسر رفیق اختر کو میں تب سے جانتا تھا جب وہ اپنے آپ کو جوگی کہلاتے تھے اور میرے بال بچوں کے لئے وہ اب بھی جوگی انکل تھے.. پروفیسر صاحب کلین شیڈ، گولڈ لائف سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے ایک ایسے عبادت گزار شخص تھے جنہوں نے مجھے قرآن اور خدا کے بارے میں وہاں تک قائل کیا جہاں تک میں قائل ہو سکتا تھا.. کسی بھی بڑے سے بڑے جید عالم دین نے میرے شکوک کو اُس طرح زائل نہیں کیا تھا جس طرح جوگی صاحب نے منطق اور استدلال سے.. اور اُس رنگ زبان سے.. چاہے وہ انگریزی ہو یا پنجابی اور میری خواہش ہے کہ مجھے اُن جیسا ایک پریش نصیب ہو کہ

ایک ڈھل چکی شام میں...
 بدھ کے چرنوں میں بھیٹ گئے گئے سفید چاولوں، تیل اور سکوں پر اترتی تاریکی
 میں...
 دو موم بیوں پر...

ہم پانچوں پر...
 اور اُس شام میں تین کھڑکیوں میں سے درمیان والی کھڑکی کھلی تھی اور اُس
 میں جو شکل نظر آتی تھی وہ ایک دیوی کی تھی... جو زندہ تھی.. اور اُس کی رنگین تصویر..
 سُہری فرسوں میں جڑی ہوئی کھنڈو کے ہر پُتر سُور میں.. غیر ملکی اشیاء سے ٹھے ہوئے
 سُور زیں.. ہوٹلوں اور تہہ خانوں اور شراب خانوں میں اور گھروں میں سچی تھی اور اُس
 کے گرد چراغ جلتے تھے، زرد پھولوں کے انبار اُسے ڈھکتے تھے اور میرے سامنے تصویر نہ
 تھی.. وہ خود تھی.. اپنے سُرخ سنگھار اور سیاہ سُرمے میں...

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم بھگنے والوں کے قبیلے میں سے نہیں ہیں.. اس لئے منہ
 کھولے، بھگے ہوئے پرکاش کی موجودگی میں، منہ کھولے اُس نیم تاریکی میں سر اٹھائے
 اُسے تکتے رہے...

اور شاید اُس نے کن اکیوں سے ہم پر نگاہ کی.. اور ہمیں جھکا ہوا نہ دیکھ کر اُس
 کے سُرخ پینٹ کئے ہوئے ماتھے پر ایک ٹمکن اُبھری کہ یہ کون سے قبیلے کے یاتری ہیں جو
 مجھے دیکھ کر سجدے میں نہیں چلے گئے.. آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے تکتے جاتے ہیں جیسے میں
 کوئی عام انسان ہوں.. دیوی نہیں ہوں..
 ہم کیا کرتے.. ہماری ٹریننگ میں جھلنا شامل نہیں تھا..

اور اُس شام کی سیاہی میں مندر کے صحن پر.. ہم پر جھلی چوہی اور بوسیدہ کھڑکیاں
 بھی شکایت آمیز انداز میں ہم پر جھکتی تھیں کہ ہم کیوں نہیں جھکتے...
 ”کماری..“ پرکاش بار بار پکارتا تھا جیسے اُس کے بار بار پکارنے سے ہی کھڑکی کھلی
 رہ سکتی ہے۔

بدھ کا سُوپا تاریکی میں تاریک تو ہوتا تھا لیکن اُس کے قدموں میں بکھرے نارنجی
 سُرخ رنگ اندھیرے میں بھی تاتواں جگنوؤں کی طرح دکھتے تھے...

اُن کا پیرایہ اظہار بڑے سے بڑے ادیب کو حیرت میں ڈال دیتا ہے... مجھے متاثر کیا تھا.. ا
 میں آسانی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہوں... تو انہی پروفیسر صاحب کی جا:
 ممتاز مفتی کی اُننگی اُٹھتی تھی اور وہ نہایت رعب سے پوچھتے ”تو ان کو نہیں مانتا؟“
 ”نہیں..“

”تو ان کو پیر نہیں مانتا؟“ ممتاز مفتی اپنے تئیں مجھے کارنر کر چکے تھے...
 ”نہیں مفتی صاحب... میں اپنا سب کچھ کسی ایک فرد کے حوالے نہیں کرنا
 میں کسی کو مُرشد نہیں مان سکتا.. میں نابینائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا.. مجھے کچھ فیصلے
 کرنے ہیں چاہے وہ غلط ہوں.. چاہے میں صراطِ مستقیم سے بھٹک جاؤں.. میں اگر پاکر
 میں کسی بھی شخص کی عیلت، اظہار بیان اور تفسیر قرآن کا معترف ہوں تو پروفیسر صاحب
 ہوں.. لیکن میں اُن کو پیر نہیں مانتا..“

”یہ آپ کو پیر نہیں مانتا..“ ممتاز مفتی نے فاتحانہ انداز میں پروفیسر صاحب کو ا
 ”اِسے آپ سے عقیدت نہیں ہے“
 پروفیسر صاحب نے گولڈ لیف کا ایک ٹوٹا لگایا اور کہا ”یہ تو بہت احسن بات
 کہ تار صاحب مجھ سے عقیدت نہیں رکھتے کیونکہ.. جہاں سے عقیدت کا آغاز ہوتا۔
 وہیں سے جہالت شروع ہو جاتی ہے..“

”درشن..“ پرکاش کا سر جھلکا چلا جاتا تھا.. معلوم نہیں یہ عقیدت تھی یا ایک
 تھی.. عقیدت اور ایکٹنگ میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا.. دونوں کو طاری کرنا پڑتا ہے.. ا
 جہاں سے عقیدت کا آغاز ہوتا ہے وہیں سے جہالت اس لئے شروع ہوتی ہے کہ اُس
 بعد آپ سوال نہیں پوچھ سکتے..

لوگ گالیں.. کماری کھڑکی میں کھڑی تھی..
 کوئی نہ کوئی کھڑکی.. کہیں نہ کہیں کھلتی تھی...
 کبھی دمشق کے بازاروں میں.. کبھی ہنزہ میں.. اور کبھی لاہور کے کوچوں میں
 کوئی نہ کوئی کھڑکی دیدار کے آوارہ گرد مشتاق کے لئے ضرور کھلتی تھی..
 تو ایک اور کھڑکی کھلی تھی..
 کھنڈو کے ہنومان دھو کا دربار میں..

وہی دو موم بتیاں روشن تھیں۔

وہی دو چراغ جلتے تھے۔ اس آس میں کہ کوئی تو تیسرا چراغ جلانے آئے گا۔ ہم سب ایک کچل شاک میں سے گذر رہے تھے۔

ہم جو وحدانیت کے پجاری تھے اور شرک سے توبہ توبہ کرتے تھے، ہمارے سامنے شرک ہی شرک تھا۔۔۔ مجھے اکثر انٹرویوز میں پوچھا جاتا ہے کہ سفر میں تمہیں حاصل ہوا؟ کیا کھویا، کیا پایا۔ کیا سیکھا؟ اور میں جواب دیتا ہوں کہ بس یہی کہ جب آپ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ کا بچ ہی واحد بچ نہیں... دنیا میں اور بھی بچ ہیں۔ آپ کی سوچ ہی حرف آخر نہیں۔ حرف آخر سے بہت پرے اور بھر حرف ہیں۔

تو کیا یہ ایک اور بچ تھا؟

ایک اور حرف تھا۔ جس سے میں آگاہ نہیں تھا۔

کھڑکی میں درشن دیتی کماری۔ جو مشکل سے نظر آتی تھی۔ اُس کے عقب میں جو لائین روشن تھی وہ اُس کے خدو خال کو نمایاں نہیں کرتی تھی۔ تو یہ دیوی۔ کہیں ایک اور بچ تو نہیں۔ میرے بچ سے جدا۔ اور میں اس سے آگاہ نہیں تھا۔

یاشاید یہ صرف ”ماحول“ تھا جو مجھ پر اثر انداز ہوتا تھا۔

ڈرامہ چاہے شیخ کا ہو یا ٹیلی ویژن کا۔ اُس میں ”ماحول“ ہی روح پھونکتا ہے۔

ایک کردار کے چہرے پر کتنی روشنی ہے۔ پس منظر میں کیسی موسیقی اُبھرتی ہے۔ شیخ کے کس حصے کو تاریک رکھا گیا ہے اور کونسا حصہ روشن ہے۔۔۔ کمال روشنی کی صرف ایک کرن ہے۔ او تھیلو جب انٹری دیتا ہے تو اُس کے لمبے کے بیچ و خم کس انداز میں اُس کے بدن سے الگ ہو کر ایک شاہانہ وقار سے اُٹھتے ہیں اور گرتے ہیں۔

پرنس آف ڈنمارک بمبلیٹ جب کھوپڑی کو آنکھوں کے برابر لاکر ”ٹوٹی آرٹاٹ ٹوٹی“ کا مکالمہ ادا کرتا ہے تو کھوپڑی کے کس حصے کو تاریک رکھ کر اُس پر دانٹوں کی مترنم اور اداس پکار اُٹھتی ہے۔

ایڈی بس اپنی سوتیلی ماں کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے

تو پس منظر میں کن آوازوں کا کورس بلند ہوتا ہے۔

”مائی فیڈلی“ کی ہیروئن اپنے ان پڑھ کاکنی انداز میں پھول بیج رہی ہے تو ریکس بیری سن کس سمت سے بیج میں داخل ہوتا ہے۔

صرف بیج ڈرامے میں ہی نہیں۔ محبت کے ڈرامے میں بھی ”ماحول“ بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔۔۔ ہیر کارانگلا پلنگ اور اُس کے پس منظر میں چناب کا ہریا دل جنگل بیابان۔۔۔ سوہنی کہمارن کے ہاتھوں کے اُلکے ہوئے گل بوٹے اور کچا گھڑا۔ اور شاہ حسین کا الاؤ بھی تو ماحول ہیں۔ شاہ گوری کے کورے بدن پر سورج کی پہلی کرن جو ایک گرم بوسے کی طرح ثبت ہوتی ہے اور اُس کی برفوں پر نیل ڈالتی ہے۔ اور شاہ گوری اُس نیل کو دھند کے لمبے میں روپوش کرتی ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ جانے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا۔ تو یہ وہی آن ہے جو محبت کے ڈرامے میں بھی بہت کارگر ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ کسی بھی یاد کو، کسی بھی فریاد کو، کسی بھی اُلفت کی کک کو اور کسی بھی ڈرامے اور کسی بھی عقیدے کو جو دراصل ایک بڑا ڈرامہ ہوتا ہے ”ماحول“ بناتا ہے۔۔۔ نہیں تو وہ کورا سفید ہو جائے۔ اُس میں کوئی چاشنی کوئی کشش کی لذت نہ رہے۔ اُس شام بٹ پرستار و بٹ گراں و ضم آتھامیں... انجانے کے خوف میں گھرے ہوئے۔ جب ہم پانچوں اوپر دیکھتے تھے تو لونگ گاڑیں کو اُس کے ”ماحول“ میں دیکھتے تھے۔ وہ اگر دن کی روشنی میں ٹریفک کے شور میں پیدہ پونچھتی کسی ٹیکسی کی منتظر کسی چوک میں کھڑی ہوتی۔ کسی ریسٹوران میں فرنیچ فراز کھانے کے بعد اور کوک کی بوتل حلق میں اتارنے کے بعد اُسی حلق میں سے اُٹلتے ڈکار کو منہ پر ہاتھ رکھ کر روکتی ہوتی۔ یا کسی دفتر میں سٹیو ٹائپسٹ ہوتی تو ہم اُس کی جانب ایک نظر بھی نہ دیکھتے۔ نہ اُس کے سر پر قیمتی پتھروں سے مزین سُہری تاج ہوتا اور نہ کپلے سے بھری آنکھیں، سُرخ پینٹ کیا ہوا چہرہ اور نہ گلے میں زرد پھولوں کا ہار ہوتا تو ہم ایک دس برس کی بچی کے تیل سے چڑے ہوئے بال اور چھٹی ناک کو کاہے کے لئے دیکھتے۔ اُس سے کیوں مرعوب ہوتے۔

تو ہم یہاں اُس کے مندر کی سیاہی میں ماحول کے مارے ہوئے مرعوب ہو رہے تھے۔

ہم فی الحال اپنے بچ پر قائم تھے اور وہ کھڑکی میں کھڑی درشن دکھلاتی تھی اور

ہیں شہبے میں ڈالتی تھی کیا صرف ہمارا سچ ہی آخری سچ ہے۔

اُس کی سیاہ آنکھیں کھلی تھیں۔

وہ اُنہیں جھپکتی نہ تھی۔ جیسے ایک ناگن پھن پھیلانے کھڑی ہو۔

وہ اپنے جھروکے میں درشن دیتی ہوئی وہ دیوی تھی جس کے سامنے شاید اُس کا خدائی میں پہلی بار نیچے سٹوپا کے پاس جو پجاری کھڑے تھے وہ جھکتے نہ تھے اور اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے چلے جاتے تھے۔

خالدہ کے خوش نظر سندھی کڑھائی والے لباس میں سے ایک مہک اُٹھتی تھی یہ یقیناً کھنڈو ایئر پورٹ کی ڈیوٹی فری شاپ سے خرید کردہ کسی فرنیچ پر فیوم کی تھی۔ اور یہ پر فیوم گیندے کے پھولوں اور بدھ کے چرنوں میں پگھلتی موم اور باسی ہوتے سفید چاولوں اور شام کی ٹھنڈک میں گھلتی جاتی تھی۔

”تارڑ صاحب یہ تو سراسر تو اہم پرستی ہے۔۔۔ یہ عام سی لڑکی ہے محلے کے فٹ پاتھ پر کیکری کاڑا کھیلنے والی۔ مجھے تو بہت ڈری ڈری اور معصوم سی لگتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے ماں باپ یا رشتے دار کھڑے ہیں جن کے ڈر سے یہ یہاں درشن دے رہی ہے اس کا بس چلنا تو یہ اس وقت اپنی گڑیوں سے کھیل رہی ہوتی۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ۔۔۔ یہ سچ سچ دیوی ہو سکتی ہے؟“ اُس نے مزید سرگوشیانہ سرگوشی میں پوچھا۔

”پتہ نہیں۔۔۔“

خالدہ نے سر اٹھا کر حیرت سے آنکھیں متعدد بار جھپکائیں، اُس کے دانت تاریکی میں ظاہر ہوئے ”یعنی یہ۔۔۔ ہو بھی سکتی ہے“

”میں نے ایک عرصے سے حتمی فیصلے دینا چھوڑ دیئے ہیں۔“

”سچ کے بارے میں بھی؟“

”سچ ہی کے بارے میں۔۔۔ کیا پتہ یہ سچ ہے یا یہ۔۔۔ سچ ہے۔ کیا پتہ“

گرل گائیڈ نے اس خواہ خواہ پراسراریت کو توڑ دیا ”ویسے اگر ہم اُن میڑھیوں سے اوپر جا کر دیوی جی سے ذرا دست پیچہ لیں اور گپ شپ لگائیں تو کیا حرج ہے۔۔۔ ذرا جھانک لیں گے۔“

”جھانک لیں؟“ میں نے سُہری بابا کے ساتھ مشورہ کیا۔

”سراسر مسئلہ تو جھانک لینے سے ہوتا ہے۔۔۔“ وہ اپنی عادت کے برخلاف دھیمے

لہجے میں کہنے لگے ”اگر آپ جھانک لیں اور جو کچھ آپ کو نظر آئے وہ آپ کے عقیدے

اور آپ کے سچ کے بالکل مخالف سمت میں ہو تو پھر آپ کیا کریں گے؟ مان لیں گے؟ سر

جھانکتا نہیں چاہئے۔ اپنی دنیا میں گم رہنا چاہئے۔ میر نے بھی تو کہا تھا کہ تانکنا جھانکتا کبھو

نہ گیا اسی لئے وہ خوار ہوئے اور کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس لئے جھانکنے سے گریز کرنا چاہئے“

”لو آپ تو پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہے ہو کچھ شعر و شاعری کے بارے میں۔“ گرل

گائیڈ نے ذرا غصیلے پن کا مظاہرہ کیا ”میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اوپر جا کر ملاقات کر

آتے ہیں ذرا ہاؤ ڈو ڈو کہہ آتے ہیں۔ کیوں پُرکاش بھائی؟“

پُرکاش بھائی نے جھکا ہوا سر نہیں اُٹھایا وہیں سے زمین کو گھورتے ہوئے کچھ

بڑبڑائے جس کا مطلب لاجول ولا بھی ہو سکتا تھا۔ ”نہیں۔۔۔ کماری صرف درشن کے لئے

ہے“

یہ صرف ”ماحول“ تھا جس نے ہمٹک اور ایڈی پس پر اثر کیا تھا۔ اور کچھ نہ

تھا۔

کماری نے اگرچہ صرف چند لمحے۔۔۔ شاید دس بیس سیکنڈ جھروکے میں براجمان ہو

کر درشن دیا تھا۔۔۔ لیکن ہم پر تو زمانے گزرے۔۔۔

اور پھر شاید۔۔۔ وہ اُن پجاریوں سے مایوس ہو گئی جو جھکتے نہ تھے۔ اُس کے مقدس

بُت کدے میں کفار آگئے تھے وہ اُس کے رُتبے اور پوترتا سے ناواقف تھے اور اپنی

بخشش کا سامان نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ذرا پیچھے ہوئی، کھڑکی سے ہٹی۔

اور کھڑکی بند ہو گئی۔

مندر کا صحن پھر سے تاریک ہوا اور دونوں چراغوں کی روشنی پھر سے تیز ہوئی۔

کھڑکی اگرچہ بند ہو چکی تھی مگر ہم اُسے تکتے جا رہے تھے۔

اُس زندہ دیوی کے سُہری تلک اور کبلے کی دھاروں کے شائبے اب بھی بند

کواڑوں پر نقش نظر آتے تھے۔

”کماری۔۔۔“ پُرکاش یہ نہ دیکھتا تھا کہ وہ درشنی کھڑکی خالی ہو کر بند ہو چکی تھی اور

بار تاتھا ”کماری۔۔۔ کماری۔۔۔“

ہندوستان.. تاج محل.. ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق..
ایران.. آتش کدے اور... حافظ اور سعدی..

البتہ پاکستان تک پہنچتے پہنچتے سوئی انک جاتی ہے.. یہ کہاں ٹھہرے؟ مونہجو ڈارو۔
ہڑپہ.. یا دجبل.. شایسار باغ یا درہ خیبر.. گندھارا کا عہد یا دینی مدرسے.. سوئی انک جاتی ہے
آگے نہیں جاتی... آگے جاہے گی تو اُس پر فتوے صادر ہو جائیں گے.. تو اس صورت حال
میں اگر کے ٹوک پاکستان کی تصویر مان لیا جائے تو کیا حرج ہے... کیونکہ کے ٹوک کافی الحال کوئی
مذہب نہیں ہے..

تو جب ہم نیپال تک پہنچتے ہیں تو ہمارے دماغ کے ذیلے کس ایک تصویر کو اُس کی
شناخت کے طور پر سامنے لاتے ہیں؟ یقیناً.. ایورسٹ.. اس فانی دنیا کا بلند ترین مقام..
ایورسٹ..

میں قطعی طور پر نیپال کو نہیں جانتا تھا..

سوائے اس کے.. کہ دنیا میں بہت سے ملک ہیں جو ”لینڈ لاکڈ“ ہیں.. وہ کسی
سمندر تک نہیں پہنچتے.. لیکن نیپال ”انڈیا لاکڈ“ ہے.. اُس پہاڑی سلطنت کے تمام تر
دروازوں کی کنجیاں ہندوستان کی گرفت میں ہیں۔

سوائے اس کے کہ... وہاں سے تبت اور بھوٹان کو رستے نکلتے ہیں... وہاں
گورکھے ہوتے ہیں جو برطانوی راج کے ڈائی ہارڈ سپاہی تھے.. وہ جب 1947ء میں
گوالمندئی اور شاہ عالی میں اور میرے لاہور میں گھومتے تھے تو نہ میری زبان سے آشنا تھے
ور نہ میری آریائی شکل سے.. اس لئے بے دریغ فائر کرتے تھے.. اور کلوز کوارٹرز میں اپنی
لکھاتی مگر کی کو آپ کے پیٹ میں بھونک کر گھما دیتے تھے۔

گورکھا پلٹن پورے برصغیر میں ایک سامراجی دہشت کی علامت تھی.. چپٹی
کوں والے گلھنے قد کے گورے سپاہی اپنے گورکھا بیٹوں میں.. برطانوی راج کے ستون
تھے..

میں نیپال کو صرف اتنا جانتا تھا۔

یا.. ایورسٹ کو جانتا تھا.. جو دنیا کی بلند ترین چوٹی تھی.. اور اُس کے سائے میں
نہاڑ رہتے تھے جو انگریز کوہ نوردوں کے ہمراہ پورٹرز کے طور پر سٹولیک تک آئے تھے

”پرندے پرواز کرتے ہیں... اور ان میں بابل کی چڑیا“

انسان کے اُن دماغی خلیوں میں جن میں فتور کا سودا سما یا ہوتا ہے اور جن میں
آوارہ گردی کی ڈھول تہ در تہ جم کر اُنہیں ابنا مل کرتی ہے.. ان خلیوں میں فریم شدہ کچھ
نقش ہوتے ہیں جو بہت ڈھندلے ہوتے ہیں لیکن اُن کی پہچان مشکل نہیں ہوتی.. چپے
نقیات دان لفظ اور اُس لفظ کی ادائیگی کے بعد ذہن میں فوری طور پر ابھرنے والی تصویر
سے سامنے بیٹھے شخص کی ذات کو جان جاتے ہیں.. اگر ”ماں“ کا لفظ بولا گیا ہے تو اُدھر
”محبت“ یا ”چھاؤں“ کا جواب آیا ہے.. ”بادل“ کہا گیا تو فوری طور پر ”مور“ ”بارش“
”سیلاب“ کی تصویر سامنے آتی ہے.. ایسے ہی ان خلیوں میں بھی کچھ نقش کچھ جواب
ہوتے ہیں.. انڈیا رہے کہ یہ وہ ذیلے ہیں جن میں تجارت، بینک بیلنس اور کامیابی نہیں
فتور کا سودا سما یا ہوتا ہے تو انہیں جب کسی ایک سرزمین کا نام سنائی دیتا ہے تو وہ فوری طور
پر کسی ایک تصویر سے اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہیں..

عراق... کوئی کتا ہے.. اور اُدھر شہر بابل کے دروازوں کی تصویر کھٹاک سے
سامنے آتی ہے۔ فرانس تو آکٹفل ٹاور کے سوا اپنے وجود کا ثبوت نہیں دے سکتا..
برطانیہ.. بگ بین یا پکاڈلی سرکس..

اطالیہ.. روم سویٹ روم..

ہسپانیہ.. بل فائٹ.. قصر الحمراء..

کینیڈا.. ماؤنٹ کلی منجاروز.. زرا نے..

اور برفانی انسان ”یے ٹی“ سے خوفزدہ ہوئے تھے۔

شاید اب بھی میری فانلوں میں اور کانڈوں کے انبار میں.. کہیں ایک بھروسے ہوتے کانڈ والے.. ”پاکستان ٹائمز“ کی ایک ایسی کلنگ موجود ہوگی جس میں کوئی شخص عجیب و غریب خلائی مخلوق والے لباس میں.. اُس کے منہ سے ایک ربڑ کی سونڈھ نکلتی تھی اور اُس کی پشت سے بندھے آکسیجن سلنڈرز تک جاتی تھی... برف کے ایک تودے پر کھڑا ہے اور اُس کی سفیدی میں ایک اُس ایکس گاڑھے دوسرے ہاتھ کو فضا میں بلند کئے ہوئے ہے۔ اور اُس ہاتھ میں کچھ پرچم ہیں اور اس بھوری تصویر کے نیچے اب بھی درج ہوگا ”شرپا تن زنگ.. انسانی تاریخ میں پہلا شخص جو دنیا کے بلند ترین مقام پر پہنچا۔“

اُس کے پیچھے ایڈمنڈ ہلیری تھا جو یہ تصویر اتارتا تھا.. نیوزی لینڈ کا کوہ پیاک ہلیری! اس برطانوی مہم کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی جیتی ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی کے موقع پر اُسے دنیا کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنے کی خوش خبری سنائیں۔

اور یہاں گھلایا یہ ہو گیا کہ ایورسٹ پر پہلا قدم شرپا تن زنگ کا پڑا... جیسے نل آر مشرانگ کا پہلا قدم.. اگرچہ اُس نے اسے انسانیت کا بڑا قدم قرار دیا... چاند پر پڑا... اور ایڈمنڈ ہلیری نے اس تاریخی وقوعہ کی تصویر اتاری..

ہلیری کی کوئی ایک تصویر تاریخ کے اوراق پر ثبت نہیں ہے.. جس میں اُس کا ایورسٹ پر پہلے پہنچنے کا ثبوت ہو..

تو ہمیں پر حالات دگرگوں ہو گئے..

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک ایشیائی چینی ناک والا ایک سفید قام سے پہلے دنیا کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا..

اور جب یارانِ نکتہ ذراں نے بس یہی نکتہ اٹھایا کہ.. وہ ژبندہ بلند کسے ملا؟.. کون تھا جس کے قدم ایورسٹ کی صدیوں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں برسوں کی کنواری برفوں پر پہلے پڑے تو.. ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ایڈمنڈ ہلیری نے اور شرپا تن زنگ نے جو محض ایک پورٹر تھا اور وہی کتا تھا جو اُس کے ماشرز کہتے تھے کہ یہ کون.. اُن دونوں نے کہا.. ہم ایک ہی رسے سے بندھے آگے پیچھے بلند ہوتے تھے.. تو اس سے

کیا فرق پڑتا تھا کہ آگے کون ہے اور پیچھے کون ہے اور پہلا قدم کس کا تھا..

اور اس کے باوجود ٹائٹ ہڈ یعنی ”سر“ کا خطاب.. جو سید احمد خان کے لئے بھی باعث افتخار تھا اور علامہ اقبال کے لئے بھی صرف گورے ایڈمنڈ ہلیری کے حصے میں آیا۔ اگرچہ شرپا تن زنگ پر بے شمار اعزاز نچھاور کئے گئے لیکن وہ کبھی بھی.. سرتن زنگ نہ کہلا سکا اور نہ اُس کی کسی شرپا گاڈوں میں ان پڑھ اور چٹھی ناک والی بیوی لینڈی تن زنگ کہلا سکی.. اس لئے کہ گورے اور کالے میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے..

صرف ہلیری نے احتجاج کیا کہ مجھے اور ٹیم کے لیڈر کو.. ہنٹ کو جو آخری کیمپ میں صرف دورین آنکھوں سے لگائے ایورسٹ کی چوٹی کو تکتا رہا ٹائٹ ہڈ سے نوازا گیا ہے تو میرے ساتھی شرپا تن زنگ کا کیا تصور ہے.. اس لئے کہ ہلیری انگریز نہ تھا، نیوزی لینڈ کا باشندہ تھا اور برطانوی سامراج کے تعصب سے آزاد ہو چکا تھا اور اس لئے بھی کہ وہ ایک شاندار کوہ پیا تھا اور ایک کوہ پیا کا کوئی ملک نہیں ہوتا اور کوئی مذہب نہیں ہوتا.. سوائے پہاڑوں کے... پہاڑ اُن کے معبد ہوتے ہیں جن کی پرستش اور زیارت کے لئے وہ اپنی جان جو کھوں میں ڈالتے ہیں... اُن کے داتا صاحب، نظام الدین اولیاء۔ سینٹ فرانس۔ امام رضا۔ گورو گوبند سنگھ۔ دیوارِ گریہ اور کپل وستو.. ایورسٹ۔ کے ٹو۔ اناپورنا۔ ناگاپربت۔ راکا پوٹی۔ ماؤنٹ بلائک اور ماؤنٹ کلی منجاروز ہوتے ہیں اور یہ واحد مذہب ہے جس میں فرتے اور فتوے نہیں ہوتے۔

آج وہی ایڈمنڈ ہلیری بوڑھا اور بے بس ہو چکا ہے..

اُس کا بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچنے کی کوشش میں اُس سے ٹھٹھکا ہے۔

اور اُس کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سر ایڈمنڈ آپ کی عمر اور پھیپھڑے اب اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ آپ بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے ایک فٹ بھی اوپر جائیں، ایک اور قدم اٹھائیں.. اور وہ بوڑھا کوہ پیا بارہ ہزار فٹ کی اُس سرحد پر کھڑا ہو کر اکثر اُنتیس ہزار فٹ بلند اُس چوٹی کو حسرت سے تکتا ہے جس پر وہ صدیوں پہلے پہنچا تھا.. وہ پہنچا تھا یا تن زنگ.. اس سے کیا فرق پڑتا تھا.. تن زنگ اب مر چکا ہے۔

ایورسٹ سینکڑوں برسوں سے ایک خواب تھی.. دنیا کا بلند ترین معبد تھی اور برف کی اس دیوی کے چرنوں تک پہنچنے کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اگرچہ اپنی شاہ گوری.. کے ٹوکا اہرام برف اُس سے کہیں شاندار پر شکوہ تھا لیکن وہ حساب کتاب میں مار کھا جاتا تھا.. اور اُسے دوسری پوزیشن پر قناعت کرنی پڑتی تھی.. حساب کتاب میں ہر جینس مار کھا جاتا ہے..

لیکن اب.. ان دنوں.. ایورسٹ نہ خواب ہے اور نہ کوئی برف کی دیوی.. صرف ایک طوائف ہے.. جیسے پسندیدہ ٹورسٹک جھیلیں رکھیں ہو جاتی ہیں کہ ہر وہ شخص جس کے پاس ایک پیمبرو.. کچھ بلیک لیبل وہسکی، بہت ساری بلیک مینی اور کوئی دل پہنچاؤ خاتون ہوتی ہے وہ ان تینوں کے ہمراہ بڑی آسانی سے وہاں تک پہنچ جاتا ہے.. تو ایورسٹ ان دنوں.. فارسیل ہو چکی ہے..

دنیا بھر میں یہ لالچ دیا جاتا ہے کہ آپ ہماری ایڈوانس ٹریول ایجنسی سے رابطہ کریں، ہم چند ہزار ڈالرز کے عوض آپ کو دنیا کی بلند ترین چوٹی پر لے جائیں گے.. آج بے شک بوڑھے اور محتاج ہوں، بے شک بچپن میں عمر گزارنے والی ایک ہاؤس والا ہوں جیسا کہ ایک جاپانی خاتون تھی جو ایورسٹ تک پہنچانی تھی.. آپ فیملی ادا کریں ہمارے تجربے کار گائیڈ اور کوہ پیما آپ کا ہاتھ پکڑ کر یا گود میں اٹھا کر وہاں لے جائیں.. جہاں پہلی بار ہیلیری اور تن زنگ پہنچے تھے..

لیکن ایورسٹ کے بیوپاریوں سے ایک غلطی ہو جاتی ہے.. وہ بھول جاتے ہیں کہ پہاڑ اپنی خصلت نہیں بدلتے.. نہیں بدل سکتے.. بے شک ایورسٹ کی طرح آپ اُن کے قدموں تک ایئر پورٹ اور سڑکیں لے جائیں، ہوٹل بنیں کر لیں اور وہاں برگر اور کوکا کولا سپلائی کر دیں.. گتے کی شراب پیش کر دیں.. وہ خصلت نہیں بدلتے وہی رہتے ہیں جیسا انہیں رب نے بنایا ہوتا ہے.. وہ اپنا رد عمل ظاہر کرتے رہتے ہیں..

ابھی پچھلے دنوں ایورسٹ کو خریدنے والے ورجنوں ”کوہ پیما“ اور اُن کے گاہک ایک ایسے برفانی طوفان کی اور ہواؤں کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے جو اُن کے طے شدہ شیڈول میں شامل نہ تھا..

کہا جاتا ہے کہ ایورسٹ دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے.. کے ٹو مشکل ترین چوٹی ہے..

نانگا پربت سب سے خطرناک پہاڑ ہے جو انسانی خون کو پسند کرتا ہے.. اناپورنا اور راکا پوشی سب سے خوبصورت ہیں..

شاید اسی لئے کے ٹو کو سر کرنے والے چند درجن لوگ ہوں گے.. جب کہ ایورسٹ پر قدم رکھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے..

دنیا بھر کے آشفستہ سروں اور کوہ نوردوں کے لئے نیپال صرف ایورسٹ تھا.. میرے لئے بھی تھا.. صرف اُس میں گورکھا پلٹن کا خوف بھی شامل تھا.. کیونکہ میں نے آزادی کے سُہری دنوں میں اُن کی تیز خم دار گھریوں کو اپنی شہ رگ کے قریب ہوتے محسوس کیا تھا.. لیکن میں نیپال جا کیوں رہا تھا؟

تیس برس کے ”بن باس“ کے بعد اپنے ملک کے جنگل سے کیوں نکل رہا تھا.. اگر پاکستان سے باہر قدم رکھنا تھا تو نیپال میں ہی جا کیوں رکھنا تھا.. اگر میں نے یورپ میں منعقدہ سیمینارز میں شرکت کے لئے صرف اس لئے معذرت کرنی تھی کہ یہ اُن دنوں میں آتے تھے جب.. میں جسمانی طور پر نہ سہی ذہنی طور پر کمر بستہ ہو چکا ہوتا تھا.. شمال کے لئے.. وہ اُن دنوں میں آتے تھے جب پاکستانی شمال میں برقیں کھیلنے لگتی ہیں، چشمے رواں دواں ہوتے ہیں اور فیڑی میڈو کا جنگل اپنے برف لبادے کو پگھلا کر اپنے روپوش گل بوٹے ظاہر کرتا ہے.. اس جنگل کے سالخورہ درختوں تلے ایک پہلا پھول برف میں سے ایک خوابیدہ حیرت کے جاگنے کا جادو اپنی پنکھڑیوں پر لئے سفید کھن کی طرح چھب دکھلاتا ہے اور پھر بے حساب اور بے انت پھول اُس کی پیروی کرتے ہیں.. اُسے امام مان کر ظاہر ہوتے ہیں.. یہ وہی دن ہوتے ہیں جب وادی سوختر آباد پر بلند کوہ پاسیر کی آبخاروں کی پھوار جنم لیتی ہے اور اُن کے کناروں پر گھاس اُگتی ہے اور زرد سفید سنو لپہر ڈرتے.. سنو سے تنگ آئے ہوئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیچے کیسے بھائی ایسے شکاری اپنی ٹوسی بندوقوں کی ٹالیوں کا زنگ صاف کرتے ہیں اس پھوار بھری گھاس پر لوٹنیاں لگانے کے لئے نیچے آ جاتے ہیں.. ٹرانگو ٹاورز اور نیم لیس ٹاور کے نیچے ایسے گل کھلتے ہیں جنہیں صرف وہ دیکھتے ہیں جو اُن کے قدموں تک پہنچتے ہیں.. اردو کس کی گھاس پھروں

کے سینے میں سے نکلتی ہے۔

پایو کے درخت سرسبز ہونے لگتے ہیں۔

ناپ میدان میں۔ ناگپربت کے زویل چہرے کے سائے میں۔ گھوڑے سردی کے ناقوں سے تنگ آئے ہوئے ہوا میں بدلتے موسم کی مکھنتوں میں اُتارتے ہیں! ہنسناٹے ہیں۔

سنولیک پر سے ڈھند اُٹھتی ہے اور وہاں خواہشوں کی کشتیوں کے بادبان کھل جاتے ہیں۔

تو پھر ان موسموں میں ایک آوارہ گرد۔ کیسے یورپ چلا جائے اور ایک فائوٹو ہوٹل کی آسائش میں قید ہو کر بے جواز اور بے وجہ تقریریں سنے۔

بس اسی لئے میں ان سینارز میں شرکت کرنے سے معذرت کر لیتا تھا۔ کہ میں شمال کے لئے کمر بستہ ہو چکا ہوتا تھا۔

تو اگر میں سے خانہ شمال کا اتنا رسیا تھا تو اب نیپال کیوں جا رہا تھا؟

صرف اس لئے کہ جن دنوں مجھے وہاں ایک بین الاقوامی سینار میں شرکت دعوت موصول ہوئی یہ وہ دن تھے کہ اسکولے، فیزی میڈ اور سنولیک کے انگور ابھی تھے، زرد اور رس بھرے نہ ہوئے تھے۔ اور ابھی کچھ وقت تھا کہ انہیں اُتارا جاتا اور اُن سے وہ شراب کشید کی جاتی جو شمال کے مے خانے میں مستی بکھیرتی تھی۔

یہ مارچ کا مہینہ تھا۔

اگرچہ ایلیٹ اپریل کو۔ سال کے سب مہینوں میں سے ظالم ترین گردانتا ہے لیکن میرے لئے یہ مارچ تھا۔ کہ میں اس مہینے کی پہلی تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ پیدائش سے زیادہ ظالم اور کونسا دوقمہ ہو سکتا ہے۔

اور جب انسان یکدم اُنٹھ برس پورے کر کے ساٹھویں کی دہلیز پر آکھڑا ہوتا اس سے بڑی ٹریجڈی اور کیا ہو سکتی ہے۔

میرے ساتھ ایک عجب سانحہ ہو گیا ہے۔

تحریروں، حیات اور بدن کی کیفیتوں کے حوالے سے اگر پرکھ کی جائے تو زندگی کی ایک شیخ درمیان میں سے یکسر غائب ہو گئی ہے۔ لوگ جوان ہوتے ہیں۔ مڈل ایج تک

پہنچتے ہیں اور پھر بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

میرے ساتھ جو عجب سانحہ ہوا ہے وہ یوں ہوا ہے کہ مجھ میں ایک عرصے تک۔ اور میری تحریروں میں۔ ایک مدت تک جوانی کی نوخیزی اور بخار تھا۔ نکلے تری تلاش میں تھا۔ پیار کا پہلا شہر تھا۔ جیسی تھی۔ اگرچہ ان دنوں میں ایک فاختہ اور ایک کچھرو بھی تھا لیکن میری تحریروں پر اُداسی کی ایک ڈھند چھائی ہوتی تھی۔ میں اُنڈلس میں اجنبی تھا۔ خانہ بدوش تھا۔ اور پھر کوئی عارت گر ہوش آیا۔

آیا مری محفل میں وہ عارت گر ہوش آیا۔

بے ہوش ہی اچھا تھا تاحق مجھے ہوش آیا۔

تو تاحق مجھے ہوش آیا۔

اور جب مجھے ہوش آیا تو میں جوانی کی نوخیزی اور تحریر کے رومان پرور بخار سے یکدم۔ ایک سنڈریلا کی طرح جو اپنے خوابوں کے شہزادے کے ساتھ رقص کرتی ہوئی رات کے بارہ بجنے پر اپنے جمہور پڑے میں پہنچ کر ایک عام سی لڑکی ہو جاتی ہے۔ میں بھی عام سا ہو گیا۔ گمشدہ کڑی۔ مڈل ایج تھی۔ جو مجھ پر نہیں گذری۔ میں بزرگ اور بوڑھا ہو گیا اور وقت کے ہماؤ پر راکھ تک پہنچ گیا۔

میری ریل گاڑی۔ جوانی کی نوخیزی کے شیشوں پر بہت دیر ٹھہری، سنگل ڈاؤن نہیں ہوا تھا اور جب چلی تو فرائے بھرتی ہوئی۔ بیچ کے بے شمار شیشوں چھوڑ گئی اور ساٹھویں برس کی دہلیز کے شیشوں پر آڑی۔

تو یہ مارچ کا مہینہ تھا۔

سال کا ظالم ترین مہینہ۔

ابھی شمال کے مے خانہ فطرت کے دروازوں کے آگے ڈھیروں برف تھی اور وہ کھل نہ سکتے تھے۔

صرف اس لئے میں نیپال جا رہا تھا۔

پی آئی اے کی ایئر لائن کراچی سے کھٹمنڈو جا رہی تھی۔

مجھے دادی کھٹمنڈو سے کوئی الفت نہ تھی۔

اپنے جو گرز کے جوڑے کو... ایک چوری شدہ مال کی مانند چھپایا۔
 یہ سب کچھ پہلی محبت کے خطوط کی مانند تھاجے میں ایک چور کی طرح چھپا کر
 اپنے ہسپانوی سوٹ کیس میں نیپال لے گیا۔
 میں ہابل کی اُس چڑیا کی طرح تھا۔ جس نے کھٹنڈو میں اُس بین الاقوامی سیمینار
 میں شرکت کے بعد اناپورنا کی سفیدی اور ایورسٹ کی بلندی کی جانب اڑ جانا تھا۔

میں پرسیٹے ایئر لائن میں بیٹھا تھا۔
 اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں وہ پرندہ ہوں جو اُن کے قبیلے میں سے نہیں ہوں۔
 جو سینکڑوں ہم سفر ہیں میں اُن سے جدا ہوں۔
 وہ سب لاعلم تھے کہ میں کیا ہوں۔
 میں اپنی چونچ بند رکھے ہوئے تھا۔
 اگر میں یہ چونچ کھولتا تو اُس میں سے... ایورسٹ اور اناپورنا کی چھجھاہٹ بلند
 ہوتی اور ایئر لائن کے مسافر جان جاتے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اسی لئے میں اپنی چونچ
 بند رکھے ہوئے تھا!

میں اپنے پرسیٹے نہایت پرندہ معصومیت سے ایئر لائن کے نیچے... پینتیس ہزار فٹ
 نیچے... ہندوستان کی سرزمین پر سے گذرتا جاتا تھا۔
 نیچے لکھنؤ اور ایک دریا گذر رہا تھا۔
 اور میرے ہمراہی کون کون سے پرندے تھے۔

سلمان ملک... اگرچہ نہایت تباہ کن حد تک پیئڈ سم... لیکن ذرا ذرا سی بات پر
 روٹھ جانے والا... منہ بسورنے والا سویٹ سائے بی... سلمان... جس کے بال شاید عمر کی وجہ
 سے نہیں بار بار روٹھنے کی وجہ سے سفید ہو رہے تھے اور وہ اُنہیں ایسے رنگتا تھا کہ کہیں
 کہیں اُس کے روٹھ جانے کا شائبہ سفید ہوتا تھا... سلمان... یونیسف پاکستان کا نمائندہ تھا
 اور نیپال جاتی ہوئی ہم کو نوجوں کی مختصر ڈار کے آگے آگے پرواز کرتا تھا تاکہ ہمیں راستہ
 دکھاسکے... انگریزی اطالوی لہجے میں بولتا تھا اور بیوٹی فل کو بیوٹی فل کہتا تھا۔

ایک بڑے اردو اخبار کی اگرچہ مختصر مگر معتبر خاتون خالدہ یوسف... جو بولتی تھیں
 تو اتنا دھیما بولتی تھیں کہ کسی ایسی ساس کو بھی نہ سنائی دے سکتی تھیں جو کان لگا کر برابر

لیکن یہ وہ پڑاؤ تھا... وہ کاروان سرائے تھی جس میں شب بسر کرنے والے قافلے
 جب آگے چلتے تھے تو وہاں اُن کے سامنے... کہیں بہت آگے... اناپورنا تھی... ایورسٹ تھی...
 دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے انبار تھے۔
 پاکستان کے سوا یہ دنیا کا واحد ملک تھا جہاں پہاڑوں کے خداؤں کے تخت بچے
 تھے۔

اور مجھ میں... یکم مارچ کو 59 برس کے بوڑھے ہونے کے باوجود وہ ہوس
 قائم و دائم تھی جو کسی بیس برس کے بخار زدہ جنس کی نم آلودگی سے بھرے ہوئے
 نوجوان میں بھی کیا ہوگی... اگرچہ میں نے اپنے بین الاقوامی میزبانوں کے مزاج کو ملحوظ خاطر
 رکھتے ہوئے اپنا نیلا رُک سیک اٹھانے سے صرف اس لئے اجتناب کیا تھا کہ کہیں اُس کی
 بوسیدگی... جس میں شاہ گوری کی اُلفت اور دیوسائی کی بلندی اور سنولیک کے بادبان رہے
 بے تھے اُن کے مزاج پر گراں نہ گذرے... میں نے اپنے جدید اور نویں نکور... کئی
 ہسپانوی فرم کے تخلیق کردہ نہایت قابل احترام نیلے سوٹ کیس کو پیک کرتے ہوئے
 کانفرنس میں شرکت کے لئے انتہائی معزز سوٹوں اور سلک کی ٹائیوں اور گول واٹرز کے
 کولون... اور پیئر کارڈن کی شرٹوں کے نیچے اپنی آرزوؤں کو پوشیدہ کیا۔
 جیسے گاؤں کا میراثی یکدم قریشی ہو جاتا ہے اور اپنے پس منظر کو پوشیدہ کر لیا
 ہے۔

جیسے تزکھان اور کہمار... تاج محل کے معمار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مغل
 اور مرزا ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ اُن کے دعوؤں پر شبہ نہیں کیا جاسکتا... یہ سب کے سب... میراثی، تزکھان
 یا کہمار صرف پیشے تھے ذمت نہیں تھے۔

بہر طور یہی پوشیدگی میرے ہسپانوی سوٹ کیس کی تموں میں تھی...
 جہاں استری شدہ سوٹوں اور گول واٹرز کے نیچے میری اصلی ذات پوشیدہ تھی
 باریک پروں والی نیلی جیکٹ جسے میں نے ایک سربستہ راز کی طرح چھپا رکھا تھا۔ سنولیک
 کی آرزو شدہ شرٹس اور ٹریکنگ ٹراؤزرز۔

میں نے گرم جرابوں اور اُونی بنیانوں کو ادھر ادھر گھسیٹا۔

والے کمرے میں سرگوشیاں کرتی اپنی بسو کو سنتی ہے۔

طاہرہ دی گرل گائیڈ ایک تنگ اور بادی الپنٹر میں نہایت درشت اور اُستانی ح کی خاتون جو بڑی آپا کے رول کے لئے نہایت موزوں تھیں۔ بولتی تھیں تو بولتی چلی جاتی تھیں۔ چپ ہوتی تھیں تو چپ شاہ ہو جاتی تھیں۔ خوش ہوتی تھیں تو زیادہ ہی خوش ہو جاتی تھیں اور غما ہوتی تھیں تو کل کائنات منانے آجائے مانتی نہ تھیں۔

اسلام آباد کے ایک نوجوان یورو چیف۔ ایک پسندیدہ روزنامے کے یورو چیف فاروق۔ جو اپنے تن و توش سے ایسے لگتے تھے۔ جیسے ابھی کھٹنڈو میں منعقد ہونے والے اُس عظیم الشان دنگل کی اناؤنٹمنٹ کریں گے جس میں بنگلہ دیش، بھارت، نیپال افغانستان، پاکستان اور امریکہ کے پہلوان اور پہلوانیاں شریک ہو رہے ہیں۔ منوچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے یا تو وہ نزدیک ترین ایئر ہو سٹس پر نظر رکھتے تھے اور یا ہم پر نظر رکھتے تھے۔ البتہ ایئر ہو سٹس پر تادیر نظر رکھتے تھے۔ وہ ایک دھوکا باز صحافی تھے۔ جو اپنی لاپرواہ شخصیت سے شبہ نہ ہونے دیتا تھا کہ یہ شخص رپورٹ بھی کر سکتا ہے۔ اور بھیتریں۔ انہی میں۔ وہ ایک پروفیشنل جرنلسٹ تھا جو نظر رکھتا تھا اور جو وہ خود نظر آتا تھا اصل میں وہ تھا۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی نمائندگی ضیاء الرحمن کر رہے تھے۔ میں نے ضیاء کا نام اگرچہ میں اس نام سے ازحد الرجک تھا ٹیلی ویژن کی سکرین پر ایک مجھے ہوئے پردے پر اس کی حیثیت سے متعدد بار دیکھا تھا۔ لیکن اُن کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

ضیاء اپنی سُہری داڑھی پر نہایت عقیدت سے ہاتھ پھیرتے تھے جیسے وہ داڑھی اُن کی نہ ہو۔ اُن کے پیرو مُرشد کی ہو۔ اور وہ شکل سے کوئی سوس کوہ پیا لگتے تھے اگرچہ کوہ پیا اتنے خوش لباس نہیں ہوتے۔

”تارڑ صاحب کیا آپ پی آئی اے سے مطمئن ہیں؟“ ایک ایئر ہو سٹس نے مجھے پہچان کر انگریزی میں پوچھا۔

”میں آپ سے مطمئن ہوں۔“ میں اُس خاتون کا شکر گزار ہوا جس نے شہر لکھنؤ کے اوپر پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر مجھے پہچان لیا تھا اگرچہ میں اُس سے بھی کوئی اتنا زیادہ مطمئن نہ تھا لیکن عمدہ اخلاقیات بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

”تھینک یو۔“ وہ اس قسم کے کاہلی منٹس کی عادی تھی۔ یہ وہ پروفیشنل ہیئرڈ تھے جن میں سے وہ ہر فلائٹ کے دوران درجنوں مرتبہ گذرتی تھی۔ ہر وہ شخص جسے بیشک ناک پونچھے کی تمیز نہ ہو جب ایئر ٹکٹ خریدتا ہے تو وہ ایئر ہو سٹس کے ساتھ فلرٹ کرنے کا اپنے تئیں حق بھی خرید لیتا ہے۔ وہ بے شک بھدا بد شکل اور بوڑھا ہو۔ لوہے کا بیوپاری ہو۔ اسٹوڈنٹ ٹکٹ پر سفر کرنے والا ایک بچہ ہو وہ بار بار اپنی نشست کے اوپر سروس کال کا بٹن دبا کر اُسے روشن کرے گا اور ایئر ہو سٹس کے آنے پر ایک گلاس پانی مانگنے سے پیشتر تھوڑا سا فلرٹ کرے گا۔ چنانچہ ایک ایئر ہو سٹس پر کسی فقرے۔ کسی فلرٹیشن کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان سے محفوظ ہو چکی ہوتی ہے۔ بے خوف اور آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔ اُس کے لئے مسافر وہ بچے ہوتے ہیں جو اُوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے اپنے آپ کو اہم اور عقلمند ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس قسم کا فلرٹیشن فقرہ میرے جیسے شخص کی جانب سے آتا ہے تو وہ اسے انجائے کرتی ہے اس لئے کہ وہ خوب جانتی ہے کہ یہ فقروں کے بیوپاری ہیں۔ لفظوں کے سوداگر ہیں۔ ان کی پروفیشنل مجبوری ہے کہ اس قسم کے فقرے کہیں۔ جیسے ایک زرد چہرے والی بی بی نما خاتون نے مجھ سے کہا تھا ”تارڑ نہ تمہاری شکل ہے نہ عمر ہے۔ لیکن۔ تیریاں گلاں نیں مینوں پٹیا اے۔ یعنی تیری باتوں نے مجھے اُکھاڑ دیا ہے۔“

”تھینک یو۔“ اُس نے کہا ”لیکن کیا آپ پی آئی اے کی سروس سے مطمئن ہیں؟“

”قطعاً نہیں۔“

”لیکن کیوں؟“ ایئر ہو سٹس ہمہ تن گوش ہوئی۔ اور اُس کا تن ایسا نہ تھا کہ وہ اُس کے ساتھ من سکتی۔

”اور یہ جان لیں کہ۔ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔“ ایئر ہو سٹس ذرا ہلش کر گئی۔ یا شاید اُس کے چہرے پر جو ہلش آن تھا وہ مزید ہلش کر گیا ”جانے دیں سر۔ آپ اس عمر میں بھی باز نہیں آتے۔ ویسے مجھے اُمید ہے کہ آپ نیپال سے واپسی پر ہمارے لئے ایک اور سفر نامہ لکھیں گے۔“

”پتہ نہیں۔ وہاں کیا ہوتا ہے۔ میں بے شمار ایسے مقامات پر گیا ہوں جہاں سے

واپسی پر میرے پاس لکھنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا... اگر نیپال میں میرے ساتھ کچھ ہوا تو شاید میں اس کا حال لکھوں لیکن اس سفر نامے میں آپ نہیں ہوں گی۔

”کیوں؟“

”اس لئے کہ میں آپ سے مطمئن نہیں ہوں۔“

میں ذرا گھر سے باہر قدم رکھوں۔ ذرا کالا شاہ کا کو تک جاؤں تو ہمیشہ مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ تارڑ صاحب واپسی پر سفر نامہ تو لکھیں گے ناں۔

”اور آپ ہم سے کیوں مطمئن نہیں ہیں۔“ ایڑہوسٹس جس کے بال سرخ تھے۔ چہرہ توانا فراخ اور تجربہ کار تھا اور دو ہزاروں مسافروں کے ذومعنی جملوں میں بڑھی تھی بلکہ پٹی زیادہ اور بڑھی کم تھی، قدرے اٹھلا کر بولی۔

ایڑہوسٹس اتنی دیر سے اس شخص پر کیوں جھلی ہوئی ہے۔ ہم نے بھی تو ٹکٹ پر رقم لگائی ہوئی ہیں۔

”میں آپ سے اس لئے مطمئن نہیں ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے میرے ایک ایسے محبوب سے جدا کر دیا ہے جو پچھلے ستائیس برس سے میرے پہلو میں تھا۔ بلکہ میرا کاندھے پر تھا۔ یہ محبوب میرا جاپانی کیمرا ایشائی پینٹکس تھا جس کے سیاہ بدن میں نصب ایک بٹن کو میں نے پہلی بار ستائیس برس پیشتر دیا تھا اور اُس کے دبانے سے منظر اور چہرے ساکت ہو کر میری یادوں کو دوام بخشنے تھے۔“

میں نے لاہور سے کراچی تک ”گریٹ پیپل ٹو فلائی وڈ“ یعنی پی آئی اے کے ایک جیو جیٹ میں سفر کیا تھا۔ اگرچہ ایک زمانے میں.. اور ان دنوں قطعی طور پر نہیں.. کہ اُس زمانے میں اس ایئر لائن کی ایڑہوسٹسوں کی کوالٹی نہایت معیاری اور پُرکشش ہوتی تھی اور ان دنوں کوالٹی ذرا کم: کم ہو چکی تھی اور کوالٹی بہت زیادہ ہو چکی تھی.. اُس زمانے میں نظر بٹنی نہ تھی ان دنوں نظر ڈالنے کو جی نہ چاہتا تھا.. تو اُس زمانے میں.. جو زندہ دل تھے اور مزاج عاشقانہ رکھتے تھے.. یہی کہتے تھے کہ یہ موٹو اور ایڑہوسٹسوں کے بدنی تناسب اور حرکت کو مد نظر رکھتے ہوئے ”گریٹ پیپل ٹو فلائی وڈ“ نہیں ”گریٹ پیپل ٹو فلائی وڈ“ ہونا چاہئے... شاید ”لائی وڈ“ جھوٹ بولنے کے حوالے سے کہا گیا ہے یا کسی

اور حوالے سے.. میری انگریزی نہایت ناقص ہے.. میری عقل کی طرح.. میں جب لاہور سے کراچی پہنچا اور گنی رات قائد اعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے وسیع ویرانے میں پہنچا تو کھنڈوں کی فلائٹ پر سوار ہونے سے پیشتر میں نے اپنے ہسپانوی نوٹ کیس کی زپ کھول کر اُس کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹول کر.. یہ اطمینان کرنا چاہا کہ کیا میرے انڈریویر اور بنیائیں اور اُن کے نیچے پوشیدہ میرے کوہ نور دی کے ساتھی موجود ہیں... تو وہ سب موجود تھے.. لیکن میرا ایشائی پینٹکس کیمرا موجود نہ تھا..

میرا ہاتھ اُس کے بھاری آہنی وجود کو تلاش کرتا رہا.. اس لئے کہ میں یقین نہ کر سکتا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو سکتا.. جیسے ایک شخص پارکنگ لائٹ میں واپس آتا ہے تو اُس کی کار وہاں موجود نہیں ہوتی جہاں وہ اُسے پارک کر کے گیا تھا اور وہ اُس خالی جگہ کو ایک عرصے تک بے یقینی سے تکتا رہتا ہے۔

وہ صرف ایک کیمرا نہ تھا.. ایک ہم راز اور ساتھی تھا.. اور اُس کے ٹاکو مار لینز میں میرے کیسے کیسے راز اترے تھے اور اُس نے اُنہیں افشانہ کیا تھا..

میں نے اُس کے لینز میں سے اپنے بچوں کو انگوٹھا چوستے اور فیڈر سے دودھ پی کر اُسے ہضم کرنے کی کوشش میں نختے نختے.. کھپلے اور سفید گریا بازوؤں کو فضا میں بلند کرتے دیکھا تھا۔

اور پھر برسوں بعد اُنہی بچوں کو اسی کیمرے کی آنکھ سے پروفیشنل ڈگریز تھاے ہوئے آرزو اور گولڈ میڈل وصول کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اپنی بیگم کے آزرہ حسن کو، ہنی نمون تیکے زمانوں سے... یہاں تک آتے ہوئے اُس حسن کو ماند پڑتے اور خزاں رسیدہ ہوتے دیکھا تھا۔

یہ کیمرا کہاں کہاں نہیں گیا تھا..

جب کوئی عزیز از جان دوست اپنی جان سے جاتا ہے تو اُس کی پوری زندگی سامنے آ جاتی ہے۔

یہ دوست کہاں کہاں نہیں گیا تھا..

دُنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی شاہ گوری کے دامن میں، کنکور ڈیا تک، نانگا پربت کے روپہلی چہرے اور فیڑی میڈو چہرے کے سامنے میں۔ دُنیا کے طویل ترین گلشن راستے

جیسے آج سے پندرہ برس پیشتر سوزوکی کار نصیب میں آئی تو میں نے اپنے سرخ ہونڈا 175 کو فراموش کر دیا۔ اُسے اپنے بیک یارڈ میں ڈمپ کر دیا کہ اُس کا بدن زنگ آلود ہو چکا تھا اور انجن ناکارہ ہو گیا تھا اور ٹڈ گاڑ زمین اتنے چھید تھے کہ بارش کے دوران میرے چہرے پر کچھ کے چھینے برستے تھے اور لیپ کرتے تھے۔ بیک یارڈ میں اُس کا ڈھانچہ مزید خست اور زنگ آلود ہوا۔ کچھ بیلوں نے اُس کے بدن میں آشیانے بنائے، آبیوی اُس کی ٹینکی کے ساتھ چٹ گئی اور وہ اُس حالت میں بھی فریاد کرتا سنائی دیتا تھا کہ یاد کرو۔ میں نے کن کن زمانوں میں تمہارا ساتھ دیا تھا۔ تمہارے بچوں کے بوجھ کو ایک ڈھور ڈنگر کی طرح سکول سے گھرتک ڈھوتا تھا۔ میری پچھلی نشست پر کیا کیا صورتیں تھیں جو تمہارے شانے پر ٹھوڑی رکھ کر سفر کرتی تھیں۔ اور اب تم مجھے فراموش کرتے ہو۔ میں نے اُس کی آہ و فغاں سے تنگ آ کر اور مجرم محسوس کرتے ہوئے اُسے اونے پونے داموں میں ایک کباڑیئے کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

ایک عرصے تک بیک یارڈ کی وہ گھاس جس پر وہ کھڑا تھا۔ سفید رہی۔ آس پاس وہ سبز رنگت کی تھی۔ اور جب تک وہ سفید کھڑا جس پر ہونڈا 175 زنگ آلود ہوتا رہا تھا۔ سرسبز نہ ہوا میرا احساس جرم موجود رہا۔

کچھ یادیں میں نے خود فروخت کر دیں۔ ایک کباڑیئے کے ہاتھوں۔

اور بقیہ یادیں۔ پی آئی اے نے فروخت کر دیں۔

تو۔۔ جانے والی چیز کا غم کیا کریں۔

”تارڑ صاحب۔۔ وہ محبوب کونسا ہے جسے ہم نے آپ سے ستائیس برس کی رفاقت کے بعد جدا کر دیا ہے؟“ ایئر ہوسٹس کے چہرے پر۔۔ جو فراخ اور سپید تھا۔ بوریت اتر چکی تھی۔

”ایک لوہے کا صنم۔۔ جس کے بوجھ کے۔۔ میرے کاندھے عادی ہو چکے تھے۔“

نیچے۔۔ دادی نیپال تھی۔

اُس پر پی آئی اے کی ایئر لائن ایک ایسے بندر دیوتا ہونماں کی طرح پرواز کرتی

میں وہ میرا ساتھی تھا جب ہم سنو لیک پر شکرانے کے نفل ادا کرتے تھے تو وہ تھا جو ا لحوں کو محفوظ رکھتا تھا۔ قرطبہ، غرناطہ، فلارنس، روم، ہرات، پیرس، بیروت۔۔ یونانی دیو کے جزیرے، دشت مرگ، دشت لوط۔۔ کوہ ارارات۔۔ اسرائیلی سرحد اور گولان۔۔ قبر اور شہزادوں کے جزیرے۔۔ ایک طویل فہرست ہے۔ وہ کہاں کہاں نہیں گیا تھا۔

اور کبھی یہ صحراؤں میں گم ہوا۔ اور کبھی میں برف ویرانوں میں اُسے چھوڑا اور کبھی سنو لیک پر میں نے اُسے فراموش کر دیا اور ایسا بھی ہوا کہ وہ میرے کندم سے آزاد ہو کر ایک بلند گھاٹی سے لڑھکا اور دنیا کے وحشی ترین دریا برالڈو کی قربت لڑھکتا ہوا ٹرک گیا اور پھر سے مجھے مل گیا۔

جو کیمرو دنیا بھر کی مسافت اور کوہ نور دیوں کے دوران مجھ سے جدا نہ ہوا وہ ہا سولت سے پی آئی اے کی لاہور سے کراچی جانے والی فلائٹ نمبر 396 میں مجھ سے پُ گیا۔ اب کے پھڑے تو شاید۔

میں جانتا ہوں کہ پی آئی اے کے جس اہلکار۔۔ جس لوڈر نے اُسے چوری کر اُس کی یونین کا ایک سرگرم رکن ہو گا۔ لیکن وہ میرے کیمرے کے پرانے ماڈل کی ا سے اُسے فروخت کرتے ہوئے زیادہ رقم حاصل نہ کر سکے گا۔ کسی کباڑیئے کے ہاتھ اونے پونے داموں میں فروخت کر دے گا۔ کاش یہ دام وہ مجھ سے لے لیتا۔

اور جو رقم اُسے ملی ہو گی اُس سے زیادہ سے زیادہ میکلڈ روڈ لاہور یا برنس کراچی میں چند روز کڑھائی گوشت کھائے گا۔

چند روزہ کڑھائی گوشت میں کتنی یادیں دفن ہو جائیں گی۔

روم۔ قرطبہ۔ پیرس۔ ارض روم۔ بلیک فارسٹ اور دشت مرگ دفن ہو جائے گے۔

ہاں ویسے تو اُسے رقم بہت کم ملے گی لیکن۔۔ اگر وہ کباڑیا یہ جان جائے کہ ا کیمرے کی آنکھ نے ستائیس برس میں کیا کیا دیکھا ہے۔ کن شکلوں کی تصویر گری کی۔ کن کن مقامات آہ و فغاں کا شاہد ہے۔ تو وہ کباڑیا پی آئی اے کے اُس بد کردار چور اہل کو مال مال کر دے گا۔

کہ یہ ایسی یادیں ہیں جو کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔

جاتی تھی جو اپنی ہتھیلی پر ایک پہاڑ کی بجائے ہمیں اٹھائے اڑان کرتا تھا۔

نیچے کچھ دادیاں تھیں... کچھ گھر اور بستیاں تھیں اور کچی سڑکیں تھیں۔

میں موازنہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اسلام آباد سے سکروڈ یا گلگت کی فلائ

یاد آتی تھی۔

نیچے منظر ذرا پھیکے تھے۔ اُن کی ہریا دل ذرا مدہم تھی۔

نہ اس ایئر بس کے نیچے انجانے اور سکوت میں گنگ برف زار تھے۔ اور نہ ا

ایسی جمیل جس کے نیلے طلسم میں آج تک کوئی نہ اُترا ہو۔ درجنوں بار اسلام آباد

شمال کی جانب اُڑتے ہوئے میں نے یہی محسوس کیا جیسے میرے نیچے سرکتی سرزمین

برفانی بلندیوں کے لامتناہی سلسلوں کا سکوت اور اُن پر ایک سفید سانس لیتے آسپ

طرح اُترتی دُھند... یہ میری پہلی پرواز ہے۔ میں آج سے پیشتر ادھر کبھی نہیں آیا۔

برف معبدوں کی سفیدی اگرچہ متعدد بار میری نظروں سے آلودہ ہو چکی تھی لیکن ہر

وہ کنواری اور ان چھوٹی لگتی تھیں۔ میں ہمیشہ وہ اجنبی مسافر تھا جو سرشام کوہ آراء

دامن میں واقع اُس تنہا جھونپڑے کی جانب تھکے ہوئے قدموں سے رات بسر کر

آس میں چلتا تھا جس میں سے دھواں اُٹھتا تھا۔ اور اُس دھوئیں میں رات کے کھانے

مہک اُٹھتی تھی۔

بادل بہت گھنے نہ تھے اور دھند ہلکی اور بے نام سی تھی۔

کیرے کی گمشدگی کے بعد میں ذرا چوکنا ہو گیا تھا۔

میں نے کراچی کھنڈو فلائٹ پر حفاظتی پٹی کسے سے پیشتر ہسپانوی سوٹ ک

میں سے اور کچھ نہ نکالا صرف اپنی بنیائیں، ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان نکالا اور اُن

اپنے دستی بیگ میں رکھ لیا کہ اگر یہ بھی چوری ہو گئے تو ان کے بغیر میں وہاں کیا سے کیا

جاؤں گا۔

میرا خیال تھا۔

... اور زندگی کے اکثر خیالوں کی طرح یہ بھی ایک خام خیال تھا کہ یہ... ایک

بین الاقوامی پرواز ہے... اس لئے اس میں سوار ہوتے ہی.. دنیا بدل جائے گی، قسمت با

جائے گی... دھیمی خواہناک موسیقی ایک جلتی جل ترنگ کی طرح میرے کانوں میں اُتر

گی اور میں اُس کے لطف میں خوابِ خرگوش کے مزے لوں گا۔ میرے اردگرد آپس میں

رقص کریں گی اور اپنے کو مل بدن مجھ سے ایک مناسب فاصلے پر رکھیں گی تاکہ مجھ میں

حرص بیدار نہ ہو حالانکہ حرص بیدار بھی ہو جائے تو میں اُن کو گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اور

دنیا بھر کے کھانے اور خاص طور پر پینے میرے سامنے سجادے جائیں گے۔ ایڑہو سٹس مجھ

پر قربان ہو جائے گی اور اس انٹرنیشنل فلائٹ میں بلاشبہ میرے پہلو پہ پہلو ہر قسم کی ہر

بدن اور ہر ہوس کی گوریاں گئے دیاں پوریاں سفر کریں گی اور تب مجھ پر باہر بھی رشک

کرے گا۔ وہ بے شک فرغانہ سے اُترا تھا اور اب کامل میں بے آرام سوتا تھا اور اُس کے

دروغے کی جالیاں نوادرات کے طور پر پاکستان میں سمگل کی جا چکی تھیں اس لئے کہ

طالبان اُسے اپنی سرزمین کا فرزند نہیں گردانتے تھے۔ یہ باہر کی خوش قسمتی ہے کہ طالبان

زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں اگر ہوتے تو ”ترک باہری“ کا مطالعہ کر کے اُس کی ہڈیوں کو قبر

میں سے نکال کر کامل سٹیڈیم میں دزے لگاتے اور گردن کا منکال جاتا تو اُس کے گرد

پھندا کس کے اُسے پھانسی پر لٹکاتے۔ کہ باہر نے ترک کے ہر دوسرے صفے پر شراب اور

مغجون کا ذکر کیا ہے کہ جنگ کے بعد ہم نے دشمنوں کی کھوپڑیوں کا میٹار تعمیر کروایا، رات کو

جشن منایا اور پہلے مغجون کھائی اور پھر شراب پی... اگرچہ اُس نے ابراہیم لودھی کے

خلاف میدان میں اُترنے سے پیشتر شنید ہے کہ جام اور منکے توڑ ڈالے تھے اور توبہ تائب

ہو گیا تھا لیکن.. اگر ایک قاتل قتل کے بعد توبہ کر لے تو بھی سزا سے تو نہیں بچ سکتا۔ اور

یوں بھی باہر بہ عیش کوش ہی اُسے دزے لگانے کے لئے کافی اقبال جرم تھا۔ چنانچہ مجھے

یقین تھا کہ توبہ تائب ہونے سے پہلے کا باہر مجھے اس انٹرنیشنل فلائٹ میں اپراؤں اور جام

سسو کے درمیان دیکھ لیتا تو یقیناً رشک کرتا اگرچہ ادھر مغجون یعنی افیم کا بندوبست نہیں

فلا۔

لیکن یہ محض ایک خوابِ خرگوش تھا۔ کہ ایسا ہو گا۔ بھلا کبھی خرگوشوں کے

داب بھی پورے ہوئے ہیں۔ پی آئی اے کی اس فلائٹ پر.. انٹرنیشنل فلائٹ پر.. نہ دنیا

لی، نہ قسمت بدلے.. صرف مسافر بدلے.. اور وہ مسافر کیا تھے؟

اس ایئر بس میں لاہور سے کانا کچھا جانے والی دیگن میں جس قسم کا کراؤڈ ہوتا

ہے بس اسی قسم کا کراؤڈ تھا۔ فرق صرف ناکوں کا تھا۔

بیشتر مسافر مشرق وسطیٰ میں مزدوری کرنے والے وطن لوٹتے نیپالی حضرات جن کی مشکل بدن خبر کرتی تھی اور بار بار کرتی تھی اور ناک پر رومال رکھ لینے کے باوجود کرتی تھی کہ وہ سب چند برس پیشتر نیپال سے نما کر نکلے تھے اور اب بشرط زندگی والا اپنے گھروں میں پہنچ کر ہی دوبارہ اس امتحان میں سے گذریں گے... کیسی کیسی دل مہک تھی جو اس کیبن میں پرواز کرتی تھی۔

”سر آپ ہم سے مطمئن تو نہیں ہیں لیکن“ فراخ چہرے والی کٹے ہوئے نم بالوں والی جمال دیدہ.. اور اُس نے کیا کیا نہ دیدہ کیا ہو گا ایئر ہوسٹس ایک مرتبہ پھر جھلی ”اگر آپ پسند کریں... ہمارے پائلٹ آپ کو مدعو کر رہے ہیں کہ آپ کاک پٹ آجائیں اور اُن پہاڑیوں کو دیکھ لیں جنہیں ہمارے ایک پائلٹ نے نہیں دیکھا تھا اور قسم کی ایئر بس جس میں آپ سوار ہیں کریش ہو گئی تھی.. چند سو مسافران راہی ملک ہوئے تھے... اُن فور چونیٹلی..“

جب سے میں نے اس کھٹنڈو فلائٹ پر قدم رکھا تھا..

ایئر بس جو ایک خشکی پر رہ جانے والی وہیل کی طرح ایئر پورٹ پر پڑی تھی کی میڑھیاں چڑھنے سے پیشتر سیکیورٹی کے عملے کو سامان کے ساتھ لٹکے ٹیکڑ پر شین پڑھی جانے والی مہرس چیک کروانے کے بعد پی آئی اے کے سٹاف کو بورڈنگ کارڈ کا حصہ پیش کرنے کے بعد جب ہم سفر بخیر کی دعائیں مانگتے اور اپنے بال بچوں کو دوبارہ کی آرزو کرتے اُن میڑھیوں پر بو جھل قدم رکھتے اوپر گئے اور ایئر بس کے دہانے داخل ہوئے، مفت کے لالچ میں متعدد اخبار اٹھائے اور وہیل کے بدن میں اپنی نشستیں تلاش کرنے لگے تو ہم سب کے بدن میں وہ ایئر کریش، کریش ہو رہا تھا..

نیپالی مسافروں کی ”دل آویز“ مہک کے باوجود.. صبح کے اُس ناشتے کے باوجود اگرچہ گرم تھا اور چائے میں خشک دودھ حلق کو خشک کر دینے والا تھا اور زندگی سے کر دینے والا تھا.. اس کے باوجود ہمارے دلوں میں... ایک ایئر کریش تھا.. قاہرہ کا بہت دور تھا.. مجھے ابھی تک یاد ہے کہ دو چار مسافروں کے علاوہ اُس کریش میں چند بچ گئے تھے اور تصویروں میں وہ اپنے سوختہ پنجروں کے اُوپر حیران بیٹھے تھے.. کہا جا کہ قاہرہ ایئر پورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے مسافر اپنی سیٹ بیلٹس باندھ چکے تھے اور

روشنیاں تیزی سے قریب آتی چلی جاتی تھیں جب بیشتر مسافروں کے لئے فنا کا بلاوا آ گیا.. میں آج چھ چالیس برس پیشتر ایک پنکھوں والے جہاز میں.. ایک سپر کانٹیشن جہاز میں جب قاہرہ ایئر پورٹ پر ایک شب اترتا تھا تو منظر وہی تھا.. ہم نے بھی سیٹ بیلٹس باندھ لی تھیں.. شہری روشنیاں تیزی سے قریب آتی چلی جاتی تھیں.. مجھے اب تک یاد ہے کہ قاہرہ کی ٹائٹ لائف کی ایک جھلک دکھانے کے لئے تمام مسافروں کو بسوں میں پیک کر کے ویران سڑکوں اور اونگھتے ہوئے شہر میں سے.. ایک ایسے ٹائٹ کلب میں لے جایا گیا تھا جس کے ویٹر چند نونوں والی سرخ ترکی ٹوپیاں پہنے سفید سوٹ اور بوٹائیاں باندھے ہمیں کھانا سرو کرتے تھے اور سیج پر ایک نیلے ڈانسر ”یا جیبی.. یا جیبی“ کے نعرے لگاتی اپنی پتلی کمر اور کولوں کو لچکاتی دوہری ہوتی جاتی تھی.. ٹائٹ کلب میں جمال عبدالناصر کی تصویر مسکراہٹ بکھیرتی تھی.. اور مصری ہماری سمجھ میں نہ آتے تھے کہ وہ جمال کو گمال کہتے تھے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے جنرل نجیب نے شاہ فاروق کو فارغ کیا تھا.. اور اُس کے بعد جنرل جمال عبدالناصر نے جنرل نجیب کو فارغ کیا تھا.. لیکن اس سے پیشتر ان دونوں نے شاہ فاروق کو مکمل ملٹری اعزاز کے ساتھ سلیوٹ کرتے ہوئے شاہ صاحب کے فریہ اور بیکار تن و توش کو ایک رائل شپ پر سوار کر کے جلا وطن کیا تھا..

یہ وہی شاہ فاروق تھے جن کی ہمشیرہ شریا.. شاہ ایران کی پہلی اور آخری محبت تھیں.. فرح دیبا کی نوخیزی کے باوجود..

یہ وہی شاہ فاروق تھے جو اپنی گرل فرینڈز کو پہلو میں بٹھا کر قاہرہ کی راتوں میں کسی پلوک میں جب مقامی پولیس کی مداخلت پر پہلے تو اپنی جرمن گن سے فائر کرتے تھے اور پھر کہتے تھے... باسٹروڈ.. تم نے کبھی مصر کے ڈاک کے ٹکٹ نہیں دیکھے.. ہر ٹکٹ پر میری تصویر ہے.. اور یہی شاہ فاروق تھے جو انقلاب مصر کے بعد جنوبی فرانس کے ساحلوں پر سیاہ چشمے میں اور ایک وسیع اور تربوزی توند کے ساتھ فرانسیسی دو شیرازوں کے جھرمٹ میں ٹپکتے تھے.. اور پھر کسی احسان نافراموش دو شیرہ نے اُن کے ساتھ معاشرے کی تفصیلات میں یہ شرانگیز خبر بھی دی کہ شاہ صاحب کا تن و توش جتنا وسیع تھا اُن کے دیگر اعضاء اتنے ہی مختصر تھے..

قاہرہ کریش... میں جو ہنر اپنے پنجروں پر حیران بیٹھے تھے.. شہر سے باہر ایک صحرا

میں.. اور اُن کے آس پاس سینکڑوں سوختہ بدن تھے.. جن میں نامور پاکستانی صحافی دانشور بھی شامل تھے.. اُس شب کے بہت بعد میں جب پھندوں والی سُرخ ٹوپوں اور ویٹرز اور ”یا جیبی“ پکارتی ٹیلی ڈانسرز لچکتی ہوئی دوہری ہوتی تھی.. اور میرا مین اتنا سلگتا تھا اور اُس کی ہر لچک کے ساتھ دوہرا نہیں.. تیرہ ہوا جاتا تھا.. اور ابھی :
اعضاء شاہ فاروق کی نسبت اتنے مختصر نہیں ہوئے تھے..

قاہرہ کا حادثہ بہت دور تھا..

تقریباً چالیس برس کا فاصلہ..

لیکن کوئی بھی ایئر کریش.. چاہے وہ چالیس برس پہلے ہوا ہو یا آج کے اذ ہیڈ لائن میں فلیش ہوا ہو.. ایک ایسے ترک وطن کرنے والے شخص کی طرح ہوتا جس کے دل میں ایک خدشہ ہمہ وقت موجود رہتا ہے کہ مجھے شہر بدر کر دیا جائے گا ہی اس دیس میں سے نکال دیا جائے گا..

تو.. یہی وہ فلائٹ ہے جو کریش ہو جائے گی.. سب کے دلوں میں اور بدلتا

یہی خدشہ تھا..

اور قاہرہ کا حادثہ تو بہت دور کی بات تھی..

لیکن کھنڈو کریش تو ابھی نزدیک کا قصہ تھا..

اُس کریش میں جلنے والے مسافروں کی کھوپڑیاں اور سوختے ہڈیاں وہ ابھی اتنے نزدیک تھے کہ ہم کسی بھی کھوپڑی کو ہاتھ لگا سکتے تھے... اُس سے سوال کر سکتے کہ تم بہ قانگی ہوش و حواس اس ایئر ٹابوت میں کیوں چلے آئے جس کے اندر تم نے تھوڑی سی راکھ ہے... شاید ایک آدھ ہڈی بھی ہو جو تمہاری نہیں ہے... یہی ضیاء الحق سے بھی پوچھا جا سکتا تھا.. تم نہیں جانتے کہ کراچی سے کھنڈو پرواز ہوئے وادی میں داخل ہونے سے ذرا پہلے جو پہاڑیاں ہیں انہیں ایک بار پائلٹ اور شوت کیا.. ذرا احتیاط کرتے ہوئے بلندی پر سے ہو کر ایئر پورٹ پر لینڈ کیا تو ایئر مختصر ہو گئی اور ایئر بس کو ایمر جنسی بریکس کے ساتھ روکا گیا اور اس کوشش میں برسٹ ہو گئے اور ایئر بس ڈولتی.. لڑکھرائی.. کسی ٹن باپے کی طرح ڈرنک اور بے اور بے قابو ہوتی ہوئی کھسکتی گئی اور بمشکل تباہی سے ذرا ادھر پہنچ کر رُک گئی.. ادا

فلائٹ پر پائلٹ نے یہ طے کر لیا کہ وہ اور شوت نہیں کرے گا.. پہاڑیوں کے نظر آنے پر ذرا پیچھے ہو کر لینڈ کرے گا.. اور جب وہ اُن پہاڑیوں کی قربت میں پہنچا اور ذرا نیچے ہوا تو اُس نے دیکھا کہ وادی کی وہ پہاڑیاں جن سے پرے کھنڈو ایئر پورٹ ہے وہ ایئر بس کی ناک کی سیدھ میں اتنی تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی ہیں جیسے کوئی شہاب ثاقب گر رہا ہو.. وہ براہ راست اُن کی آغوش میں کریش ہونے کو ہو.. تب پائلٹ نے فل تھراٹل دے کر ایئر بس کو تقریباً نوے درجے کے زاویے پر اُپر اُٹھایا..

سینکڑوں مسافر جو ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے لئے حفاظتی پٹیوں باندھ رہے تھے اُن کو یک لخت جھٹکے لگے.. وہ اپنی نشستوں سے یوں آزاد ہوئے جیسے خلا کے مسافر بے اختیار ہوتے ہیں.. اُن کا سامان اور وہ ایسے مدغم ہوئے جیسے برسات میں بھیگے ہوئے نرم جامن ایک کبچے میں ڈال کر جھکائے جاتے ہیں اور وہ بے اختیار اور بے بس ہوتے ہیں...

ایئر بس کا پورا وجود... خلا میں اُٹھتے ایک راکٹ کی طرح سیدھا ہوا...

اُن پہاڑیوں کے اُپر اُٹھا..

لیکن ایئر بس کی ایک ڈم یا ٹیل بھی تھی.. جس پر کاتب تقدیر نے رقم کر رکھا تھا کہ سارا جہاز کلیئر ہو جائے گا لیکن تم نے اس پہاڑی کو ذرا چھونا ہے.. ایک لمبی آخرت تمہارے نصیب میں ہے..

ایئر بس کی ڈم.. اُس کا آخری حصہ وادی کھنڈو کے گرد بلند ہوتی ہوئی پہاڑیوں سے ٹکرائی... ذرا ایک لمبے کا لمس ہوا.. ملاپ ہوا.. اور اُپر اُٹھتی ہوئی ایئر بس ایک گیلی ٹرلی کی طرح نیچے آ گئی..

اور اب اُس ویران وادی میں آبادی ہے..

... اگرچہ خاموش اور چُپ ہے لیکن ایک بین الاقوامی آبادی ہے جس میں رجنوں قومیتوں کے لوگ دفن ہیں.. یا اُن کی راکھ یا کچھ بھی دفن ہے.. اُن کی یاد میں ایک پارک تعمیر کیا گیا ہے... جس میں صبح سویرے اُن کی رُوہیں جاگنگ کر سکتی ہیں کہ یہ زمانے ہیں کہ رُوہوں کو بھی اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے تردد کرنا پڑتا ہے ورنہ نہیں بھی.. ہماری طرح بلڈ پریشر اور بلڈ شوگر وغیرہ کا عارضہ لاحق ہو سکتا ہے.. اگر آپ کو

یقین نہ ہو تو بے شک کسی روح سے پوچھ لیجئے... کسی ایسی روح سے جو پی آئی اور ایبڑ بس کے کریش کے بعد وجود میں آئی ہو..

یہ کیا عجب پارک تھا جس میں روحیں جاگنگ کرتی تھیں...

کم از کم ہم اس پارک میں جاگنگ کرنے کے متنی نہ تھے....

اگر ہمیں خصوصی طور پر دعوت بھی دی جاتی تو ہم یہ کہہ کر معذرت کر لیتے

جی ہمارے پاس جاگنگ شوز نہیں ہیں.. اس اُمید کے ساتھ کہ میرے ہسپانوی شوٹ کی تلاشی نہیں لی جائے گی کہ اُس میں تو جاگنگ شوز تھے..

لاحول ولا... میں ذرا سراہمہ ہو گیا تھا.. ہمک کر جانے کہاں سے کہاں نکل کر

میں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی کہ یہ تم کس اجل راستے پر جاگنگ کر رہے ہو.. واہ واہ جاؤ..

ویسے میں نہایت دانا اور سیانا شخص تھا.. میں خوب جانتا تھا کہ ایک شے لاج

ایورجہز ہوتی ہے.. اور اس کے مطابق اگر آپ کسی بھی ایبڑ کریش کے فوراً بعد اُس پر اُسی فلائٹ پر سفر کریں تو اُس کے کریش ہونے کے امکانات ناممکن کی حد کو چھ

ہیں.. اور دو چار برس تک عافیت رہتی ہے..

”جی نہیں شکریہ..“ میں نے نہایت گھمبھائی ہوئی آواز میں ایبڑ ہوسٹس کی

کش قبول کرنے سے معذرت کر لی ”مجھے پائلٹ حضرات پر پورا اعتماد ہے کہ وہ

محفوظ لینڈنگ کر لیں گے“

ایسا اکثر ہو جاتا ہے کہ مجھے مسافروں میں سپاٹ کر کے کاک پٹ میں مدعو

جاتا ہے.. میں گلگت اور سکر دو فلائٹ پر تو جان بوجھ کر اپنے آپ ایک ندیدے

طرح نمایاں کرتا ہوں کہ خذا کے واسطے مجھے پہچان لو اور کاک پٹ میں لے چلو تاکہ

کے نو اور نانگا پر بت کو ایک بلند خلاء سے.. کسی دوسرے سیارے سے اُترنے والی مخلوق

طرح دیکھوں اور اپنے سیارے کو بھول کر اس دُنیا کے خُسن کا امیر ہو کر یہ فیصلہ کر لو

میں وطن واپس نہیں جاؤں گا.. لیکن عام فلائٹس کے دوران میں اپنے آپ کو کسی اذ

سیاہ چشمے کے پیچھے اس لئے پوشیدہ رکھتا ہوں کہ کاک پٹ میں بیٹھ کر لینڈنگ کا منظر

ایک ہولناک تجربہ ہے.. جس طور آپ کی نظروں کے سامنے ایبڑ سٹریپ آپ پر اُٹنی

آپ کو ہرپ کرتی ہوئی سینکڑوں کلومیٹرز کی برق رفتاری سے بڑھتی آتی ہے اور جہاز کے بائزر جب سٹریپ کو چھوتے اور چنگاریاں نکالتے ہیں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ ٹھیک ہے آج سے پینتیس بیٹ بہ حفاظت لینڈ کر جاتا ہو گا لیکن آج یہ کریش کر جائے گا.. اسی لئے میں نے یہ پیشکش مسترد کر دی تھی کہ میں بزدل اور جان کے چھن جانے کے خوف میں بیٹا تھا..

اگرچہ میری مسکراہٹ سراہمہ تھی لیکن سفید شلوار قمیض میں لمبوس اُس چہرے بدن والی خاتون کی مسکراہٹ نہایت پُرکشش، تہذیب یافتہ اور دل پذیر تھی اور اُس کی آنکھیں بولتی تھیں.. آنکھیں بدن کا دروازہ ہوتی ہیں.. اگر وہ بولیں تو پورا بدن بولتا ہے.. میں جب بھی اپنی نشست سے اُٹھ کر ایبڑ بس کے سموگنگ ایریا میں سونا لگانے جاتا وہ بہر صورت مجھے اِس مسکراہٹ سے نوازتی.. چنانچہ میں ایبڑ کریش کے ہول کو اپنے بدن سے بے وطن کرنے کے لئے جب ایک مرتبہ پھر سگرت نوشی کے لئے جہاز کے پچھلے حصے کی جانب جا رہا تھا تو راستے میں وہی مسکراہٹ دیوار بن گئی..

کراچی ایبڑ پورٹ پر جب ہم کھٹنڈو فلائٹ میں داخل ہونے کے لئے قطار بنائے

ریختے تھے تو میرے آگے یہی خاتون تھیں بلکہ اُن کی پشت اور کٹے ہوئے بال اور گردن کا

کچھ حصہ تھا.. اور اُس کے زاویہ ہائے بدن اتنے چہرے اور چمکیلے تھے کہ وہ کپتے بانس

کی ایک ایسی میڑھی لگ رہی تھی جس پر قدم رکھنے سے وہ چمک کر دوہری ہو جاتی ہے...

یعنی ایک پنجابی لوک بولی کی تصویر کہ... میں پتلے بانس دی پوہڑی.. تے ہولی ہولی چڑھ بالما..

وہ متعدد ہینڈ بیگز، شولڈر بیگز اور پتہ نہیں کون کون سے بیگ اٹھائے اور لٹکائے ہوئے

تھی.. بانس ہاتھ میں ایک بہت بڑا تھیلا سنبھالنے کی کوشش میں تھی اور دائیں ہاتھ سے دو

شوٹ کیسوں کے حجم کے برابر ایک بیگ قطار کے ذرا سے ریگنے پر اُٹھاتی تھی اور اُس

کے بوجھ سے چمک کر دوہری ہوتی تھی اور اُس کے بوجھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے

دھڑام سے ٹرمیک پر گرا دیتی تھی.. وہ نہایت مشکل میں تھی.. مجھے خدشہ تھا کہ اس خاتون

نے اگر ایک اور مرتبہ اس بھاری پتھر کو اٹھایا جو شکل سے بیگ لگ رہا تھا تو اس کا ہاتھ

کلائی سے جدا ہو کر بیگ کے وجود کا ایک حصہ بن کر گر جائے گا.. اگرچہ میں ایک

نمر رسیدہ ٹائٹ تھا لیکن ابھی تک شولری کے آداب کو بھولنا نہ تھا اس لئے میں نے آگے

بڑھ کر اردو میں کہا ”خاتون اگر اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تو کیا میں آپ کی مدد کروں؟“

خاتون شاید ایک عرصہ دراز سے میرے جیسے ہی کسی عمر رسیدہ اور فاقہ آلود کی آمد کی منتظر تھی اُس نے اپنی مسکراہٹ کو مزید دل آویز کیا اور کہنے لگی ”اودہ اور یہ ”اودہ پلیز“ بھی نہایت توبہ شکن تھی۔

چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر اُس بیگ کے سٹریپ کو گرفت میں لے لیا اور اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ملعون ٹرمیک کے فرش کے ساتھ جڑا ہوا معلوم ہوا کہ اسے انکاری ہو گیا اور میں نے ذرا اور زور لگایا تو میری کمر رفتہ میں خطرے کی گھنٹیاں لگیں اور ٹپک پڑنے کا شدید خدشہ پیدا ہو گیا۔ میرا صاحب نے تو عشق کو اک بھاری کہا تھا اور اعتراف کر لیا تھا کہ کب مجھ ناتواں سے اٹھتا ہے۔ اگرچہ ہم جب عمر رفتہ ہوتے تھے تو ہر قسم کے پتھر آسانی سے اٹھا لیتے تھے اور پتھروں کی کوئی کمی نہ تھی اٹھائے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اب یہ زمانے جدا تھے۔ ان زوال وقتوں میں ایک کنکر اٹھانے سے بھی ریڑھ کی ہڈی میں خلل پیدا ہو جاتا تھا۔۔۔ لیکن میں نے بالآخر اُس بھاری بیگ اٹھا ہی لیا۔ ہر میٹھی کا ہفت خواں ہانپتے ہوئے طے کیا، ایئر بس کے اندر پہنچ کر اُس بے ربط سانسوں پر قدغن لگا کر اُسے بیچ کپارٹمنٹ میں رکھا اور خاتون کی تشکر مسکراہٹ کے جواب میں ”مائی پلیز“ کہہ کر اپنی نشست پر ڈھیر ہو کر تادیر بے جاں اور ہانپتا رہا۔۔۔ اُس بوڑھے کاسانودا کی طرح جو ملاپ کے بعد قریب المرگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایئر کریش کے ہول کو اپنے دل سے رخصت کرنے کے لئے سگڑا ایک اور کش لگانے کے لئے جب میں جہاز کے پچھلے حصے میں جا رہا تھا تو وہی مسکراہٹ راستے کی دیوار بن گئی۔

میں رُک گیا کہ آگے دیوار تھی۔

ذرا جھکا ”آپ کے اُس بیگ میں کیا اینٹیں بھری ہوئی ہیں جو اتنا وزنی ہے۔“

”نہیں۔۔۔“ اور جب اُس خاتون نے ”نہیں“ کہا تو میری نظر اُس کے بالوں

گئی اور میں اپنے رنگ بریز تجربے کی بنا پر جان گیا کہ وہ کونسا ہیئر ڈائی اور کس نمبر کا ہیئرڈ استعمال کرتی ہے اور مجھے کچھ اطمینان سا ہوا کہ عمروں میں اتنا بھی فرق نہیں۔ لیکن

کے باوجود وہ ایک دل کش صنف نازک تھی ”نہیں۔۔۔ اُس بیگ میں کتابیں ہیں“

”یہ آپ اتنی ڈھیر ساری اور بھاری کتابیں جن میں یقیناً کچھ ڈکشنریاں اور سائیکلو پیڈیا کی پچاس ساٹھ جلدیں ہوں گی۔ نیپال لے جا رہی ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔“

”اور پھر انہیں پڑھ کر واپس کراچی لے آئیں گی؟“

”نہیں۔۔۔ کتابیں تو نیپال میں ہی رہیں گی۔۔۔“

”یعنی آپ انہیں کسی سکول یا لائبریری میں دان کر کے واپس آجائیں گی؟“

”نہیں۔۔۔“ اُس نے کہا۔ اور جب اُس نے یہ ”نہیں“ کہا تو وہ مجھے نہیں دیکھتی

تھی بلکہ میرے پیچھے منتظر اور زکی ہوئی ایئر ہوسٹس کو اور اُس کی خوراک کی ٹرالی کو دیکھتی تھی جو مجھے راستے کی رکاوٹ پا کر قدرے بیزارگی سے دیکھتی تھی کہ یہ شخص کیوں راستہ روکے کھڑا ہے اور میرے فرائض خوراک کے راستے میں کیوں حائل ہو رہا ہے۔

”سوری۔۔۔“ میں نے ایئر ہوسٹس سے معذرت کی اور اپنے آپ کو خاتون کی

نشست سے چپکا کر اپنے موٹاپے کو سانس اندر کھینچ کر کم کرنے کی نہایت ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ فوڈ ٹرالی بمشکل میری ٹوند کو بائی پاس کرتی ہوئی گذر گئی اور اُس فوڈ ٹرالی میں اگرچہ گرم گرم لیکن نہایت بوسیدہ اور بیہودہ خوراک تھی جسے مسافر من و سلوئی کی طرح رغبت سے کھاتے چلے جاتے تھے۔

”نہیں۔۔۔“ اُس نے سلسلہ پچھلی میٹھی جاری رکھا ”یہ میری لائبریری میں رہیں

گی۔۔۔ میں ایک کانفرنس اینڈ کرنے کے لئے کراچی آئی ہوئی تھی اور اب اپنے وطن نیپال جا رہی ہوں“

”آپ نیپالی ہیں؟“ اگرچہ ایئر بس مسلسل بادلوں کے سفید گھیرے توڑتی، جھٹکے کھاتی گذرتی تھی لیکن مجھے اُس کی نسبت جو جھٹکا لگا تو ذرا شدید لگا۔

”ہیں آئی ایم۔۔۔“ اُس نے پہلی بار زبان انگریزی کا براہ راست سہارا لیا۔

ایئر بس کو ایک اور سچ کاج کا دھچکا لگا۔ حفاظتی بند باندھ لیجئے اور اپنی اپنی نشستوں پر تشریف رکھئے کے اعلانات روشن ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے اور سارنے کے لئے اُس کی نشست کا سہارا لیا اور میرا ہاتھ اُس کے ناتواں کندھے پر پھلستا

ہوا گیا اور پھر میں سیدھا ہو گیا ”لیکن آپ تو اردو بول رہی تھیں.. میں آپ کو پاکستانی تھا..“

”کیا آپ نے میرا بھاری بیگ صرف پاکستانی سمجھ کر اٹھایا تھا..“

”نہیں.. ایک ڈیزل ان ڈسٹریس.. یعنی کسی آفت میں مبتلا حسینہ سمجھ کر

تھا.. لیکن آپ تو اردو بولتی ہیں۔“

”نیپال میں سب لوگ اردو بولتے ہیں اور ہم لوگ اسے ہندی یا ہندوستان

ہیں۔ میرا نام سری جانا شرما ہے.. کھٹنڈو کے مہاراج گج میں رہتی ہوں.. یہ میرا کارڈ

اُس نے اپنے بٹے میں سے ایک کارڈ تپ کی پتے کی طرح نکال کر مجھے تھما دیا

آپ پسند کریں تو میں آپ کو اپنے شہر میں گھما سکتی ہوں“

”ہم تو پہلے سے ہی گھومے ہوئے ہیں.. مزید گھوم سکتے ہیں“ میں ایک

ناگمانی کی طرح اُس کے سر سے لٹنا تو نہیں چاہتا تھا.. بے شک اُس کے سر کے بال

ہوئے تھے لیکن ایئر ہو سٹس جس فوڈ ٹرالی کو ابھی دھکیلتی ہوئی آگے گئی تھی اب

واپس لا رہی تھی اور ایک مرتبہ پھر میری فریہ کر میں کچھ دے رہی تھی..

میں جب اپنی نشست پر ڈولتا ہوا واپس آیا.. کچھ ایئر بس کے دھچکوں کے

اور کچھ چکیلی بانس کی سیڑھی کی شہر میں گھمانے کی پیشکش پر.. تو میرے ساتھیوں کی

شکایت آمیز نظروں نے میرا سرد استقبال کیا..

وہ ابھی مجھے جانتے نہ تھے..

میں باہل کی وہ چڑیا تھی جس نے اڑ جانا تھا..

اور اُسی لمحے نیپال میں قدم رکھنے یا لینڈنگ کرنے کی انٹرنمنٹ ہو۔

”لینڈز اینڈ ہسٹل مین.. دوئی آراباؤٹ ٹو لینڈ ایٹ کھٹنڈو انٹرنیشنل تری بھون... ایئرپورٹ

براہ کرم اپنی سیٹ نیٹلس بانڈھ لیجئے اور سکرٹ بھادتجے وغیرہ وغیرہ..“

ایئر بس کے ٹائرز جب شرپاز اور گورکھاز اور ایورسٹ کی سرزمین کو چھو

میرا تیس برس کا بن باس اختتام کو پہنچا۔

تری بھون انٹرنیشنل کھٹنڈو ایئرپورٹ... بڑا سہاسا گھریلو ایئرپورٹ لگا..

جب ہماری ایئر بس لینڈ کرتی تھی تو رن وے پر ایسے طیارے کھڑے تھے جن

کے بدنوں پر ٹائٹس زبان میں اُن کی ہوائی کمپنیوں کی شناخت لکھی تھی.. ان میں ایک

جہاز پر ”بڈھا ایئر لائن“ درج تھا..

یہ شاید لارڈ بڈھا کی ذاتی ایئر لائن تھی.. اور وہ اپنے بدن کو بھوک سے ٹکھا کر

اور اسے پرندوں کی آماجگاہ بنا کر بالآخر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ نروان صرف بگ بزنس میں

ہے اور اب ایک ایئر لائن آپریٹ کرتا تھا..

کھٹنڈو ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہی ہم آریائی ٹائٹس کو سب سے پہلے چٹنی

ٹائٹس کا صدمہ پہنچا..

اور پھر ہم نے.. زرد۔ جامنی۔ سبز۔ نیلے اور سرخ رنگوں کے متحرک لبادے

دیکھے اور اُن لبادوں میں جو نیپال میں قدرے پوشیدہ تھیں، اُنہیں دیکھا.. یہ ایئرپورٹ کا

رنگین عملہ تھا جو دھیرے دھیرے حرکت کرتا تھا اور فاروق کی نظریں دھیرے دھیرے اُن

پر اور جو اُن میں ملفوف تھا اُس پر حرکت کرتی تھیں..

آس پاس کہیں بھی مردانہ پولیس کا نام و نشان نہ تھا..

صرف زنانہ.. یعنی لیڈیز پولیس تھی جو ایسی پتلونوں میں تھی جو اُن کے چروں کی

مناسبت سے بے حد پھلتے ہوئے ہنس میں حرکت کرتی تھی... ہنس کا یہ ناگ پھیلاؤ.. جیسے

ایک کو براؤن سے پیسٹر پھن پھیلاتا ہے شاید نیپال میں حسن کی ایک قدرے چوڑی اور

زہرناک ادا سمجھا جاتا ہے... عورت کے سرین... ”پرفیوڈ گارڈن“ لکھنے والے ایرانیوں

کے لئے اور ”کاماسوترا“ کے ہندوستانیوں کے لئے ایسے مقام تھے جہاں سے آئندہ نسلیں،

لذت کے زمانے اور کائناتیں جنم لیتی تھیں۔

اور جب میں نے نیپال کے مندروں میں براہمن دیویوں کے مجستے دیکھے تو وہ

بھی اتنی براؤنڈ تھیں کہ اپنے آسن سے اٹھتے نہ اٹھتی تھیں... لیکن نیپالی پولیس کی ان

دیویوں میں کوئی شہوت نہ تھی، کوئی کج ادائیگی نہ تھی.. یہ اگرچہ کاماسوترا کی تصویریں تھیں

لیکن بیجان ان کے پاس نہ پھٹکتا تھا.. یہ کم از کم میرے ”پرفیوڈ گارڈن“ میں رہائش پذیر

نہیں ہو سکتی تھیں۔

دیرا کاؤنٹر پر ہم ایک قطار میں کھڑے آہستہ آہستہ سرکتے تھے.. پھر باری آنے پر

کی ثقافت اور دیوالا کے بارے میں پی ایچ ڈی کرنے آئے تھے بلکہ.. اُس سفید سفوف کے رابٹوں کے لئے آئے تھے جس کے استعمال سے انسان ایورسٹ سے بھی بلند چوٹیوں پر پہنچ جاتا ہے.. ویسے کسی کی نیت پر شبہ کرنا بڑی بات ہے.. ہو سکتا ہے وہ تبلیغی جماعت کے ممبر ہوں.. اور یہ میرے ذہن کی کبھی ہو جو انہیں گولڈن ٹرائی اینگل سے منسلک کرتی ہو.. ایک نظر ناگہانی ڈیوٹی فری شاپ تک گئی..

ہر بین الاقوامی ایئر پورٹ کی طرح یہاں بھی ایک ڈیوٹی فری شاپ تھی جس میں شیشے کا سامان بہت تھا.. اور ان شیشوں میں رنگین پانی پھلکنے کو آتا تھا..

”تارڑ صاحب اس ڈیوٹی فری شاپ میں کیا کیا ملتا ہے؟“ ضیاء صاحب اُس شاپ کے شیشوں میں گم تھے اور ایک حسرت کی نظر کرتے تھے..

”سگرٹ.. چاکلیٹس.. سوئس وغیرہ..“

”اور کچھ نہیں ملتا؟“

”کو کو کولا کے ٹن.. مزید سگرٹ.. مزید چاکلیٹ..“

”ان کے سوا اور کچھ نہیں ملتا؟“

”آپ کو اور کچھ کیا چاہئے..“

”مجھے تو اور کچھ نہیں چاہئے..“ وہ آنا فنا سیدھے ہو کر ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذرا افسر ہو گئے..

”ضیاء صاحب اس ڈیوٹی فری شاپ میں سانس بھی لے آہستہ کا بورڈ آویزاں ہے..“

”مطلب؟“

”وہاں شیشہ گری کا کام بہت نازک ہے.. ساغرو مینا اتنے نازک ہیں کہ سانس لینے سے بھی ٹوٹتے ہیں.. اگر حکم کریں تو بندہ.. ان شیشوں میں قید بادہ رنگیں کو چھڑا لائے؟“

”تارڑ صاحب کیا بات کرتے ہیں..“ ضیاء صاحب نزوس ہو گئے ”ڈنیا بھر کے جرنلسٹ ہمارے ساتھ ہیں.. واپسی پر رپورٹ کر دیں گے.. اور یوں بھی ہم یہ شغل نہیں کرتے.. آپ کرتے ہیں؟“

فارم بھرتے تھے پاسپورٹ نمبر لکھتے تھے اور نیپال یا ترا کا جواز درج کرتے تھے.. اب ہم یعنی مرد حضرات نیپال میں آمد کا مقصد براڈ ہیڈ دیویوں کی زیارت اور ویزا بارہ امریکی ڈالر کے عوض اپنے پاسپورٹ پر ٹچہ لگوا کر وصول کیا.. ویزا کاؤنٹر کوئی بد نظمی نہ تھی کوئی ہنگامہ نہ تھا ہر کام ایک خاص سستی اور دھیرج سے ہو گیا.. اسی ویزا کاؤنٹر پر.. دو چھان برادر شلوار قمیض اور نسوار میں ملبوس ہمارے منتظر تھے..

”تم پاکستانی ہو؟“ انہوں نے نہایت تحکمانہ اگرچہ برادرانہ انداز میں پوچھا..

”ہاں..“

”تو پھر ادھر ہمارا فارم لکھ دو..“

”آپ خود لکھ لو..“

”ہم خود لکھ سکتا تو تم کو بولتا.. لکھو..“

”جی تو خان صاحب کھٹنڈو میں آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے..“ میں نے فارم شروع کر دیا..

”ہم سیر کرے گا..“

”کدھر سیر کرے گا؟“

”اوسے یارا تمہیں اس سے کیا تم لکھو..“

”ایورسٹ پر جائے گا؟“

”کدھر؟“

”ایورسٹ..“

”یہ کون ہے؟.. یارا تم لکھو ہم ٹورسٹ کرے گا.. لکھو..“

چنانچہ میں نے اپنے پیارے خان بابا کے لئے فارم فل کئے اور میں جانتا تھا کہ وہ ادھر کسی کونینشن کے سلسلے میں آئے ہیں.. اور یہ کونینشن گولڈن ٹرائی اینگل کے ملکوں سے جڑا ہوا ہے جو جنوبی امریکہ کے بعد ڈرگ ٹریڈ کا سب سے بدنام ترین راستہ ہے.. ایورسٹ کے بیس کیمپ تک ٹریکنگ کرنے کے لئے نہیں آئے تھے.. اور یہی وہ نیپال

”اگر آپ نہیں کرتے تو ہم بھی نہیں کرتے۔“
 اور تب وہ بیگ کے بھاری پتھر والی پتلے بانس کی چکیلی سیڑھی اپنی مسکراہ
 فل تھرا مل دیتے ہوئے ہمارے پاس سے گذر گئی ”سی یو ان کھنڈو۔“
 ”یہ اس نے آپ سے کہا ہے؟“ ضیاء صاحب تو جیسے خفا ہو گئے۔
 ”ہاں۔۔“

”اور یہ اُس نے آپ سے کچھ کہا ہے؟“

”آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟“

”ہاں“ ضیاء صاحب چمک کر بولے ”اُس نے آپ کے سفید بال بے زہ
 جسم اور عُمر نہیں دیکھی... اندھی ہے کیا؟“

”سَر میں ایک سینئر سٹیزن ہوں۔ کھنڈو کی آئندہ شاموں پر میرا بھی کچھ
 ہے۔ اور اگر وہ اندھی ہے تو آپ جانتے ہیں کہ اندھے کو بعد میں گھر بھی چھوڑنا پڑتا
 آفٹر آل ہم نے اس اندھی کا بھاری پتھر بیگ اٹھا کر اپنی کمر رفتہ کے ٹوٹے کارسکا
 تھا۔“

خالدہ بی بی جو اپنے تئیں مجھ ایسے ”دانستور“ کی رفاقت میں انجائے کرتے
 میری حکمت کے موتی چننے آئی تھیں مجھے اتنا دل لگر اور معمولی پا کر نہایت دل گرفتہ
 تھیں۔ اُنہوں نے دھیسے لہجے میں کچھ کہا جو مجھ تک نہیں پہنچا۔

طاہرہ بی بی نے فلائٹ کے دوران مجھ پر ایک کڑی نظر رکھی تھی اور
 سیڑھی پر جھکے ہوئے بہ نظر غائر میرا مسلسل معائنہ کیا تھا اُنہوں نے اپنی عینک درست
 اور مجھ پر ایک قاہرانہ نظر ڈالی۔

فاروق البتہ کھل کر مسکرایا... اگرچہ زیر مونچھ مسکرایا...

ہم اپنا سامان.. اُس ہسپانوی نویں کور سوٹ کیس سمیت.. جس میں اب
 اشالی پینٹنکس کیمرہ نہ تھا.. ٹرایلوں پر لادے.. اُنہیں دھکیلتے ایئر پورٹ سے باہر آ گئے۔

”بھاگ متی اور بھاگ بھری... بڑھتی جاتی دھند ہے
 اور اُس کے پیچھے شہر ہے“

”یہ تو ایبٹ آباد ہے۔“

”نہیں بھائی.. وہ سبزہ و گل یہاں کہاں.. ایبٹ آباد کی تو کیا بات ہے.. ذرا جھانک

کے دیکھیں.. وہ بات نہیں ہے۔“

”یہ مری کا نچلا بازار ہے.. اگرچہ بہت بڑا ہے۔“

”بھئی ہم نے ٹورسٹ بروشرز میں پڑھا ہے کہ ادھر برف ہی نہیں گرتی... اور
 یہاں وہ سمانے چرچ اور چرچ کے درخت بھی نہیں ہیں جو برفباری کے بعد دیوانوں کے
 خواب ہوئے جاتے ہیں۔ اگرچہ داؤی کھنڈو سوا چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے.. تو یہ مری
 نہیں ہو سکتا۔“

”تو پھر یہ کیا ہے؟“

”یہ کھنڈو ہے۔“

کھنڈو کی وسعت اور وسیع شہریت مجھے پریشان کرتی تھی... جیسے میں پہلی بار
 سیدو شریف گیا تھا تو واڈی سوات کے اس قصبے یا شہر میں رکشوں اور ٹیکسیوں کو ددڑتے
 اور پرائم دہی، می آکس کریم، شیزان کے جوسوں اور برگرز اور شیکر میں شیک کی گئی لسی
 اور برگر کلچر کی موجودگی سے پریشان ہوا تھا..

سیاح ہمیشہ قصبوں اور واڈیوں کو پس ماندہ اور اور جمل دیکھنا چاہتا ہے... کیونکہ وہ

بہت مشکل سے وہاں پہنچتا ہے۔ اور جب وہ وہاں اسی تہذیب کے مظاہر دیکھتا ہے؟
 سے وہ فرار ہو کر وہاں پہنچتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی مشق
 رائیگاں گئی۔ اگر یہی کچھ دیکھنا تھا تو وہ اپنے لاہور یا کراچی سے کیوں فرار ہوتا۔ بہت
 میں۔ جب سیدو شریف کے بازار میں بجلی کی تاروں پر براجمان ہزاروں ابا بلیوں کو
 اپنے ذہن سے فراموش کرتا تھا۔ میں سحری اور احمد داؤد کے ہمراہ سوات گیا۔ ہم
 شریف سے باہر فضا گھٹ کے پارک سے پرے دریائے سوات کے کناروں پر بلند
 ہوئی ایک چٹان پر ایتادہ ایک ریست ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ ریست ہاؤس کے اندر
 آسائشیں تھیں کہ ہم بقیہ غمروں میں بسر کرنا چاہتے تھے لیکن یہ احمد داؤد کی بھیڑ
 بے چینی اور وحشت تھی جو ہر صبح میرے دروازے پر دستک دیتی تھی۔ ”تارڑ۔ باہر ہو
 کی دیوالیائی صبح ہو رہی ہے یار۔ جاگ جاؤ“

اور پھر ہم دونوں ریست ہاؤس سے اتر کر سیدو شریف سے بحرن اور
 جانے والی سڑک پر آجاتے۔ اُس سے وہاں کوئی ٹریفک نہ ہوتی۔ گہرائی میں دریائے سوات
 ایک مطیع اور صبر شکر کرتی گونج کے ساتھ بیدار ہو رہا ہوتا۔ ابھی اُس کے کناروں
 پنجاب کے میدانوں سے گرمی کے ستائے ہوئے لوگ اپنے تریبوز اور آموں کی پٹیوں
 کر نہ پہنچے ہوتے۔ جب ہم دونوں بحرن اور کلام جانے والی سنان سڑک پر
 دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے چلتے جاتے۔

اگر ہمیں اُس لمحے جس کا کوئی مغربی محقق دیکھ لیتا تو یقیناً ہمیں ”گے“ قرار
 دیتا۔ جو کہ ہم نہ تھے۔

ہم دونوں پر صنفِ موافق کی بجائے صنفِ مخالف گہرا اثر کرتی تھی۔
 اور اگر ہم ”گے“ ہوتے تو ہرگز نہ جھجکتے اور فی الفور اقرار کر لیتے۔ کہ
 دونوں۔ معاشرتی دباؤ کی وجہ سے جھجکنے والے نہ تھے۔ اقرار کرنے والے تھے۔

وہ کہتا ”تارڑ۔ دریائے سوات جو اس سویر میں ابھی دھیما اور خاموش ہے
 اُن زمانوں میں بھی تو ہمیں تھا۔ اور ایسا ہی تھا۔ جب اس کے کناروں پر بدھ بھکشو کو
 آسن میں دھونی رمائے گیان دھیان میں گم ہوتے تھے۔ اس نے سکندر یونانی کو بھی
 تھا اور محمود غزنوی کو۔ اور اب ہمیں دیکھ رہا ہے۔ تارڑ ہم اُن زمانوں میں کیوں

ہوئے۔“
 ”ہم اُن زمانوں میں بھی ہوئے۔ لیکن ہمیں اُن کی خبر نہیں ہے۔ ہم جیسے لوگ
 ہر زمانے میں ہوتے ہیں جو صرف موجود کو نہیں مانتے۔ اور ہم اُن زمانوں میں بھی ہوں
 گے جو آئیں گے۔ اور ہمیں اُن کی بھی خبر نہیں“
 وہ ہنستا۔ تبتے لگاتا۔ اُس کا غیر تہذیب یافتہ چہرہ۔ کبھی کسی بدھ بھکشو کی شانتی کی
 جھلک دکھلاتا اور کبھی اُس میں وہ خون آشامی آجاتی جو سکندر اور محمود کی سپاہ میں تھی۔
 ہم دونوں کا مزاج ملتا تھا۔ اس میں آوارگی بہت تھی۔ ہم کسی ایک عہد، کسی
 ایک زمانے پر یقین نہ رکھتے تھے۔

چونکہ وہ اس ایک عہد، اس ایک زمانے پر یقین نہ رکھتا تھا اس لئے وہ مجھ سے
 کم عمر ہونے کے باوجود مجھ سے پہلے کسی آئندہ عہد اور آنے والے زمانے میں نکل گیا۔
 مومن پورہ کے قبرستان میں اُس کی قبر پر بیٹھے بے زوح درختوں پر جو پرندے ہیں اور سیاہ
 کتے ہیں اُن کی بیٹ اُس کی قبر کو سیاہ کرتی ہے۔
 ہم واپس اُس چٹانی ریست ہاؤس کی آسائش میں آتے تو سحری بریک فاسٹ
 نیبل سجائے ہمارا انتظار کر رہا ہوتا ”تارڑ صاحب۔ اٹھ فل فرائی پسند کریں گے یا ہاف
 فرائی؟“

کھنڈو سے سیدو شریف۔ وہاں سے بحرن روڈ پر دریائے سوات پر ابھی تک نیم
 سیاہی میں ایک سویر میں احمد داؤد تک۔ اور پھر کھنڈو واپس۔ جہاں ہماری نیکی دریائے
 وشنومتی پر سے گذر رہی تھی۔

”یہ وشنومتی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا جو نیپال کی کسی نہایت گھریلو اور ارزاں
 شراب کے مناسب نئے میں خوش ہوتا تھا۔
 وشنومتی ایک نہایت اداس اور پڑمردہ سانپ کی طرح آبادیوں میں گھرا بل کھاتا۔
 ہمارے گندے نالوں سے کہیں گندا دریا۔ بمشکل بہتا تھا۔

ٹیکسیاں۔ رکشے۔ کاریں۔ شاہراہیں۔ فٹ پاتھوں پر کھڑے بسوں کے منتظر نیپالی۔
 ہوٹل جن کے نام ہم پڑھ نہیں سکتے تھے اور چوٹی نالوں والی مخلوق خدا۔
 میرا خیال تھا۔ اور یہ ایک اور خیال خام تھا۔ کہ شہر کھنڈو میں چند پگڈوے ہوں

نیپال بھی ایک اندھی ملاقات تھی۔
میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی آنکھیں گدلی اور بے نُور سی ہیں یا اُن
میں ایورسٹ کی برفوں کے کوہ نور دکتے ہیں۔

”یہ بھاگ متی ہے۔“ خوش باش شراب سے پُر ڈرا یور نے کہا۔

”بھاگ متی ہے یا بھاگ بھری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.. بھاگ.. متی.. ہے“

بھاگ متی اور بھاگ بھری اصل میں دونوں ایک ہیں۔

بھاگ متی، کھنڈو کے بیج میں بہتی ہے۔

اور بھاگ بھری.. وارث شاہ کے دل میں بہتی ہے اور وارث میرے دل کے
اندر ایک چناب کی طرح بہتا ہے۔ جس میں سوہنی کے گھل جانے والے کپے گھرے کی
منک بھی ہے اور میری یہ ذات بھی ہے جو کہیں بھی اپنی مٹی اور اپنے چناب سے جدا
نہیں ہوتی۔ چناب میں جب سیلاب آتا تھا تو اُس کے پانی میرے دادا چوہدری امیر بخش کی
کچی قبر کو چھو کر واپس جاتے تھے اور اپنے ساتھ اُس کی کچھ کچی مٹی بھی لے جاتے تھے۔
جس دریا کے پانیوں میں سوہنی کے گھرے اور میرے دادا کی قبر کی مٹی گھلی ہو اُسے میں
اپنے آپ سے کیسے جدا کر سکتا ہوں۔ قلق صرف یہ ہے کہ جس روز اجل آئے گی تو شاید
اسی شہر لاہور میں آئے گی اور میری قبر کی مٹی تک چناب کے پانی نہ آسکیں گے۔ قلق
صرف یہی ہے۔

وارث شاہ نے اگر قصہ ہیرا رانجا بھاگ بھری کے عشق میں ڈوب کر قلمبند کیا تو
اُس میں وہ وحشت عشق تھی جو اُس بھاری پتھر کو اٹھا لیتی ہے جو اُس ناتواں سے یوں
کب اٹھتا۔

اور ہم جیسوں کی بھاگ بھریاں منتظر رہتی ہیں کہ ہم وارث شاہ ہوں اور اُن کا
قصہ بیان کریں۔ بے شک ملکہ ہانس کے حجرے میں گوشہ نشین ہو کر نہ کریں۔ شہرت، نام
داری اور دولت کے سستے اور عارضی بازار کے بیج بیان کریں۔ لیکن کریں تو سہی۔

اور ہم بیان نہیں کر سکتے۔

اور ہماری بھاگ بھریاں دم توڑ دیتی ہیں۔

گے، کچھ مندر ہوں گے، زرد لبادوں میں گنجنے بھکشو ہوں گے اور اُنق پر ماؤنٹ ایور
کی سفید برفیں ہوں گی اور یقیناً وہاں کچھ پپی ہوں گے اور ہم سرشام ذرا ٹھلنے کے
نکلیں گے اور ماؤنٹ ایورسٹ کے دامن تک ہو آئیں گے۔

یہ ایک ایسے سیاح کا خیال خام تھا جو اُن آبادیوں کو جہاں وہ بمشکل پہنچتا ہے
ماندہ اور اور جمل دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے بُت پر دیس دیکھا۔

دور کے دیس دیکھے۔

اُن کے بارے میں اُن تک جانے سے پہلے جو کچھ تحریر میں اور تصویر میں تھا
پڑھا اور دیکھا۔ اُن تک جب پہنچا تو وہ، وہ نہ تھے جو میرے علم اور خواب کے خیال
تھے، وہ ہمیشہ کچھ اور تھے۔

کچھ ایسے تھے جو صرف تحریر میں اور تصویر میں ہی خوش نظر تھے۔

اور بیشتر ایسے تھے جنہیں دیکھنا ہی یقین کرنا تھا۔

کوئی بھی نئی سرزمین ایک بلائینڈ ڈیٹ کی طرح ہوتی ہے۔

ایک اندھی ملاقات۔

انگلستان میں.. میرے زمانوں میں اگر آپ کے کسی عزیز دوست کی گرل
آپ کی تنہائی اور اکلاپے پر ترس کھا کر یہ آفر کرتی تھی کہ میری ایک سہیلی ہے۔ اپنے
از لولی.. تو میں اُس کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں گی تمہارے دوست کے لئے۔ اور یقیناً
سہیلی بھی تنہا اور اکیلی ہوتی تھی اور اتنی لولی بھی نہ ہوتی تھی ورنہ تنہا اور اکیلی نہ ہوتی
تو یہ ان دیکھی ڈیٹ بلائینڈ ڈیٹ کہلاتی تھی.. ایک اندھی ملاقات۔

وہ سہیلی نہایت بھدی اور بھورے رنگ کے بالوں والی ایک صرف شراب
خانوں میں خوش رہنے والی، گدلی آنکھوں والی اور ایسی موٹی ٹانگوں والی جن پر نیلی رنگ
اُبھر رہی ہوتی ہیں.. بھی ہو سکتی تھی اور اکثر ہوتی تھی۔

اور کبھی کبھار لاٹری بھی نکل آتی تھی.. اور وہ ایک کالج کے بدن کی ایسی گلیاں
ہو سکتی تھی جو مسکراتی تھی تو اُس کا بدن کچیوں میں ٹوٹتا تھا اور پھر جڑتا تھا۔

اندھی ملاقات کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

بے شک وہ میر جو پیننگ کی پتلی تھی اور سوہنی جس کا نام ہی حُسن کا آخری
اُن کی نسبت کہیں حسین اور دُش جانے والی ہوں لیکن اُن کا تذکرہ نہیں ہوتا اور وہ
ہو جاتی ہیں.. وہ بھاگ بھریاں دم توڑ دیتی ہیں..
دریائے بھاگ متی کا پل ہم نے شتابی سے عبور کیا کہ ڈرائیور ایک دن
خمار میں تھا اور گذر گئے..

عمارتوں کی بجلی کی تاروں کے اوپر واڈی کھٹنڈو جب کبھی دکھائی دیتی اُس پر
اور بے رُوح سی دُھند دکھائی دیتی.. اُس کے پہاڑ اس کی سفیدی میں روپوش تھے..
میں اُن پرندوں کا ہم سفر تھا جو میری ڈار کے نہ تھے..
وہ تو نہیں جانتے تھے کہ چونچ بند کئے پڑ سیمٹے یہ جو عمر رسیدہ پرندہ ہے..
کے پڑ جھڑنے کو ہیں اور چونچ بوسیدہ ہو چکی ہے اس کے اندر ابھی تک اُڑان کی ہوا
ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اس کا گھونسلہ جانے کس جھیل کینجھر کے سرکنڈوں
ہے... یہ جانے زوس کی کسی جھیل بیکال سے آیا ہے اور قطعی طور پر ایک معزز اور
پرندہ نہیں ہے.. وہ تو نہیں جانتے تھے..

ایک اور دھچکا لگا.. جیسے ایئر بس بادلوں میں جگہ بناتی ہو... اور ٹیکسی رُک گئی

ہوٹل سولتی ہائرڈے اِن..

ہماری ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ اس کے پورچ میں رُک گئی..

کھٹنڈو کا سب سے مٹکا، تک چڑھا اور پوش ہوٹل.. ایسی قیام گاہ کہ ہم اگر
خرچ پانی پر انحصار کر کے ادھر اُنکے تو اس کا کرایہ من کر پتہ پانی ہو جاتا اور ہم
ہمشیرہ طاہرہ کے بس جھانک لیتے اور رُخصت ہو جاتے..

اس کے اندر وہی بنے رُوح اور بے آرام کرنے والی صفائی ستھرائی تھی جو
بھر میں ایسے ہوٹلوں میں ہوتی ہے اور اُس میں کام کرنے والی خواتین.. میزبان..
پر اکڑے کھڑے کلرک اور دیگر اہلکار دراصل انسان نہیں ہوتے جو آپ کو دیکھتے
بلکہ اپنے اندر فیڈ کیا ہوا ڈیٹا.. فرفر.. پنچ پنچ بولتے چلے جاتے ہیں.. سر ہم اُمید
ہیں کہ آپ کا قیام خوشگوار ہو گا.. سر ہمیں اُمید ہے کہ یہاں آپ خوب انجانے کر

گے.. سر کیا میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں.. جناب یہ رہی آپ کے کمرے کی چابی..
بیٹ دروم اِن ہوٹل سر.. صرف آپ کے لئے.. سر ہمارے ہاں سومنگ پول.. بارز..
کیسینو اور شوٹا ہاتھ کی بھی سہولت ہے.. اور ہاتھ کے لئے ہوٹل کی انتظامیہ کی جانب
سے خصوصی طور پر آپ کے لئے ایک کھلی میسنری ٹلٹ ہے.. نو چارج.. تھینک یو سر..
اور اس دوران آپ کے سامنے وہ ایک مرد ہو یا عورت اُس کے چہرے پر
ایورسٹ کی برفوں سے زیادہ منجد اور مرگ صفت ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور اُس میں
اگر آپ کو اُن کے ساڑھے تیرہ دانت نمایاں نظر آ رہے ہیں تو مجال ہے کہ دس منٹ بعد
بھی اُن دانتوں کی نمائش میں آدھے دانت کی نمائش بھی کم ہو جائے..

ہوٹل سولتی کسی پاکستانی یا جنوبی امریکی ڈرگ بیرن کی سیٹھ کی طرح بے پایاں
وسعت کا اور اس کی چار دیواری سے باہر گزرنے والے غریب دہقان کو اُس کی غربت
کے کچوکے دینے والا تھا.. ہم اگرچہ دہقان تھے لیکن غیر ملکی ڈرگ بیرن نے کمال شفقت
سے ہمیں اس کے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی..

ہوٹل کا طرز تعمیر نیپال کے کوستانی گھروں سے مستعار لیا گیا تھا جو کم از کم مجھے
اور میرے دل کو سرمایہ برفوں کے اندوہناک تسلسل اور تاریکی سے بھرتا تھا، خوشی نہ دیتا
تھا..

جیسے کوئٹہ کا سرینا ہوٹل بلوچستان کی خشک اور لامتناہی کشادگی میں موسموں کی
تختیاں جھیلنے والے کچے گھروں کی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا.. اور اُن گھروں میں رہنے والا کوئی
ہول بلوچ اس ہوٹل کے اندر جھانکنا بھی انورڈ نہیں کر سکتا تھا... کہ اُس کے ایک برس
کی کمانی اگر وہ خوشحال ہے تو یہاں ایک شب کے کرائے کے لئے بھی کافی نہ تھی.. یہاں
بھی ہوٹل سولتی کے آس پاس کوئی ایسا کوستانی نیپالی پھڑک بھی نہیں سکتا تھا جس کے گھر
کے طرز تعمیر کو چوری کر لیا گیا تھا اور وہ صرف یہی کہہ سکتا تھا کہ.. کبھی اُن کو کبھی اپنے گھر
کو دیکھتے ہیں..

ہوٹل سولتی کے لان اتنے وسیع و عریض علاقے پر پھیلے ہوئے تھے کہ وہاں
انسانی سے ایک اولپک کا انعقاد ہو سکتا تھا.. پھولوں کی الپاسی اور نیپالی قسموں کی بہتات
نی.. متعدد ریسٹوران.. ایسے وی آئی پی سویٹس جن کا کرایہ اور ایک شب کا کرایہ لاکھوں

ویسے ہم نے.. گندھارا کے باسیوں نے بدھ کو زیادہ تعظیم دی ہے..
ہم نے انہیں کبھی کمرشل نہیں کیا..
اگرچہ ہم ان کے مجسموں کو سگل کر کے اپنی قسمت بناتے تھے لیکن انہیں کبھی
اتنے ارزاں اور بازاری نہیں کیا۔ جتنا.. ہوٹل سولتی یا نیپال نے کیا..
یہ ایک تاریخی حقیقت ہے.. یا شاید میں اسے ایک تاریخی حقیقت سمجھتا ہوں
کہ.. جو سمش اور کمال بدھ کے گندھارا مجسموں میں ہے اس کی ایک رمت بھی نیپال۔
تبت چین اور جاپان میں دکھائی نہیں دیتی.. ان کے مجسمے عقیدے کی دیومالائی فیٹسی..
اسے آپ مقامی بنیاد پرستی کہہ لیں.. کے مظہر ہیں.. اور ہمارے گندھارا کے بت اور صنم..
انسانی حُسن کے ایسے شاہکار ہیں.. ایسے متناسب اور ستواں بدن کے.. اتنے انسانی کہ ان
کے عشق میں جتلانہ ہونا دشوار ہو جاتا ہے..

یہاں.. نیپال.. تبت یا چین جاپان میں.. جو بدھ کے مجسمے ہیں ان میں خوف اور
ہندومت کی دیومالائی ڈوری تو ہو گی لیکن ان میں وہ محبت اور بدن کے یونانی آثار کا طلسم
کا کوئی نشان نہ ہو گا.. انسان ان کے آگے مجبور اور نہ سمجھتے ہوئے تو جھک سکتا ہے کہ یہ
خدا جانے کونسا عذاب نازل کر دے لیکن گندھارا کا بودھی ستوا ایک ایسا محبوب صنم ہے
جس کے ساتھ دوستی کرنے اور اس کے یونانی خدوخال کی محبت میں گرفتار ہونے کو جی
بے اختیار چاہتا ہے..

ہوٹل سولتی میں داخل ہوتے ہوئے البتہ تین درخت ایسے تھے جو اس ظلمت
کدہ میں نقش فریادی تھے..
چیری کے درخت..

شگوفے ایسے شوخ اور سلگتے دکھتے رنگوں والے کہ ان سے نظر نہ ہنتی تھی..
جیسے آتش کدہ ایران پھر سے روشن ہو گیا ہو اور رنگوں کے الاؤ آنکھیں چند ہیاتے
ہوں.. میں اگر قدیم لُح کا کوئی آتش پرست ہوتا تو ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا.. شگوفوں
سے بوجھل یہ تین درخت ان روپائش اور کمپیوٹر کی ”تھینک یو سر۔“ آئی ہو پ یو ول
انجائے یورٹے سر.. تھینک یو ویری جی سر“ دنیا میں تین باغی تھے جنہوں نے میکاکی
جدیدیت کی ان آسانشوں میں مدغم ہونے سے انکار کر دیا تھا.. وہ آپ کو نہیں، آپ ان کو

تک پہنچتا تھا اور باغوں میں جگہ جگہ جاپانی اور نیپالی طرز کے گوشوں میں مہاتما بدھ
مجسموں کی سجاوٹ.. جو آلتی پالتی مارے اس ہوٹل کے عیش کو تکتے تھے کہ انہوں نے
اپنے راج محل کے عیش کو اپنے گھوڑے کن تھکا پر سوار ہو کر خیرباد کہا تھا لیکن وہ
مزتہ پھر واپس لا کر ایک جدید راج محل کے باغوں میں نصب کر دیئے گئے تھے..
ہوٹل سولتی کے باغوں میں اور نیپال کے تمام فائوینٹار ہوٹلوں کے برآمدوں
ناٹ کلبوں میں لارڈ بدھا جیسے صرف نمائش کے لئے اور ڈالروں کے حصول کے لئے
کمرشل آب جیکٹ بنا دیئے گئے تھے اس نے مجھے دیگر سیاحوں کی نسبت زیادہ دکھ دیا
اس لئے کہ میری اور مہاتما بدھ کی ایک تاریخی رشتہ داری تھی..
میں مہاتما بدھ کے سب سے دلکش روپ رکھنے والے وطن، گندھارا سے
تھا..

اگرچہ میرا عقیدہ.. اس عہد میں الگ تھا لیکن میں نے ایک یا تری کی طرح
مقامات کی زیارت کی تھی جو مہاتما کے نام سے منسوب ہیں.. ٹیکسلا.. شہباز گڑھی۔
ہائی۔ نوگرام۔ چلاس۔ گلگت، چارسدہ.. پشاور.. جمان آباد.. عالیگے.. طوطا کان.. سری
تل اور کافرکوٹ.. میرے پاس شگردر سٹوپے کا ایک حصہ ہے جس میں مہاتما بدھ کی
دفن کی گئی تھی.. میرے پاس تو مہاتما بدھ کے ایسے راز دفن ہیں جنہیں ان کے پاس
بھی نہیں جانتے..

میری کپل وستو کے اہل شہزادے سے بہت گورھی دوستی اور شناسائی ہے
لارڈ بدھا کہا جاتا ہے..

یوں بھی یہ ایک عجیب و غریب، نہ سمجھ میں آنے والا وقوعہ تھا کہ جوں جوں
گذرتی ہے انسان مہاتما بدھ کی قربت میں آتا چلا جاتا ہے..
نیپال اگرچہ ایک اندھی ملاقات تھی۔

لیکن اس کے اندھیاروں میں صرف دو جگنو تھے جو لودیتے تھے.. ایک ابور
کی سفیدی اور دوسری مہاتما کی جنم بھوی کپل وستو.. اگرچہ بہت بعد میں کھلا کہ
ہمارے ہاں پہلا بچہ ننھیال میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح ملکہ مایا مہاتما کو جنم دینے کے
کپل وستو سے دُور لومبینی... گئی تھیں۔

”تھینک یو ویری مچ سر“ کہتے تھے۔ انکار کے باعث شاید وہ کفر کے مرتکب ہوئے اور کفر ہمیشہ حسین ہوتا ہے۔

یہ وادی کالاش میں ہو یا وادی نیپال میں۔

مجھے شک ہے کہ میرے سوا ان اُبلتے ہوئے رنگوں کے تین آتش کدو کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ اگر کوئی دیکھتا تھا تو وہ ہوٹل سولتی کے شاندار سومنگ پُول میں اور کناروں پر ٹانگیں پھیلائے کہ یہ اُن کی عادت تھی بن چکی تھی گوریوں کو۔ اُس قمار خانے کو دیکھتا تھا جو چوبیس گھنٹے خمار اور قمار میں مبتلا رہتا تھا۔ شیشہ گری۔ بندوبست کو دیکھتا تھا جس کا نام اطالوی شراب خانہ تھا اور جس کا ساقی ایک بدنام تھا۔ یا پھر اُن ہندوستانی دوشیزاؤں کو دیکھتا تھا جو نیلی جینوں اور کھلی ٹی شرٹس میں دیہاتی بدن چھپائے ماڈرن ہونے کی کوشش میں ناکام ہوتی تھیں۔ کوئی بھی ان تین درختوں کو نہیں دیکھتا تھا۔

آتش کدہ ایران روشن تھا اور سیاح اُس کے برابر میں سے گذرتے جاتے ڈرگ بیرون کے انتظامات پر فیکٹ تھے۔ ہمارے وفد کے لئے ایک فلور پر ایک بک ہو چکے تھے۔

”میرے کمرے کی کھڑکی کس منظر پر کھلتی ہے؟“ میں نے کاؤنٹر کی چینی اپنی جانب پھسلتی ہوئی کمرے کی چابی روک کر ڈیسک کلرک سے پوچھا۔

”جی سر؟“

میں نے چونکہ اُس کے روبرو فقروں اور جو ابوں سے الگ ایک سوال کرنا اس لئے اُس نے چونک کر ”جی سر“ کہا تھا۔

”آپ نے جو کمرہ مجھے تفویض کیا ہے اُس کی کھڑکی کھولنے سے سامنے کیا کا آتا ہے؟“

”ہوٹل سولتی کا پورا کامپلیکس سر۔ سومنگ پُول۔ لازم۔ بہترین ویو ہے سر“

”کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے کوئی ایسا کمرہ عنایت کر دیں جہاں سے کھینڈو کاٹم اور وادی کی پہاڑیاں وغیرہ نظر آئیں۔ اگر یہ ممکن ہے تو۔“

”یس سر۔“ اُس نے سومنگ پُول اور لازم کی بجائے مکانوں اور پہاڑیوں کی

خواہش کی جہالت پر مسکراتا مناسب نہ جانا کہ یہ کسی بھی کمپیوٹر کی شان کے منافی ہے۔ میں بھی ایک کمپیوٹر کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی مسکراہٹ میں صرف ساڑھے تیرہ دانت ہی نمایاں ہو سکتے تھے۔ ”اگر آپ اسی قسم کا منظر چاہتے ہیں تو۔۔ لیں سر“

میں اسی قسم کا منظر چاہتا تھا۔

میں اُسے تو نہیں بتا سکتا تھا کہ سر میں تو منظر کا ڈسا ہوا ہوں۔

میرے سر پر ایک کوبرا سانپ کا سایہ ہے۔

یہ کوبرا اُس کو برے سے کہیں زیادہ زہرناک اور بڑا ہے جو آپ کے بھگتا پور کے

ایک خشک تالاب میں پھن پھیلائے کھڑا ہے۔

آپ بھگتا پور کے تالاب میں سے بلند ہوتے اُس عظیم کو برے کے سنہری پھن کے سامنے سر جھکاتے ہیں جس کے پس منظر میں دور دور تک ہمالیہ کی برقیں ہیں اور میں اپنے اُس کو برے کا پجاری ہوں جو کہ۔۔ منظر ہے۔ میں اُسی کا ڈسا ہوا ہوں۔

فیزی میڈو سے پہلی ملاقات کی رات میں رائے کوٹ گلیشئر اور برف ملکہ نانگا پربت کی جانب سے پھونکی گئی برفیلی ہواؤں میں اگرچہ میں بھی برف ہو گیا تھا اور سو نہ سکا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر مولوی رحمن کے مشوروں کے باوجود وہیں، فیزی میڈو کے بلند ترین مقام پر خیمہ اسی لئے نصب کیا تھا کہ اُس کے دروازے کا پردہ اُٹھتا تھا تو مجھے نانگا پربت کبھی پہلی کرنوں کے سفید پکھلتے سونے میں اور کبھی آخری شعاعوں کے تانبے میں ڈھلتی نظر آتی تھی۔

مجھے منظر دکھائی دیتا تھا۔

اطالیہ میں دریائے آرنو کے کنارے جو پہاڑی خیمہ گاہ تھی اُس کی ڈھلوان صرف اس لئے خالی تھی اور آس پاس بے شمار خیمے ڈبکے ہوئے تھے کہ وہاں رات کو ہوا بہت تیز ہو جاتی تھی اور خیمہ ملیو یا بخار میں مبتلا مریض کی طرح بے تحاشا کپکپانے لگتا تھا لیکن میں نے اپنا خیمہ وہیں نصب کیا۔ وہاں سے مائیکل اسنجلو کا شہر فلارنس۔ ڈومو اور مونٹیزا کی مسکراہٹ پردے کے پار دکھائی دیتی تھی۔ میں وہاں بھی اگرچہ بہت بے آرام ہوا۔ اور بہت صدیاں پہلے۔ ایک ڈسٹرکٹ میں جھیل ونڈر میر کے کنارے۔ جھیل جنیوا کی

بلندی پر۔ روم اور سناک ہوم میں.. بلیک فارسٹ کے کنارے اور بیس میں، جب بھی خیمہ لگایا تو اُسے ایسے لگایا کہ اپنے سلیڈنگ بیگ میں لیٹے ہوئے... دیکھا دے.. اگرچہ رات بے آرامی میں کروٹیں بدلنے گزرے.. صرف منظر کے منظر کا ہی یہ پتھیر سانپ ہے.. کو برا ہے.. جو مجھے اُن موسموں میں ڈستا۔ برقیں پکھلتی ہیں۔ یہی میرے بدن میں وہ زہر بھرتا ہے جو غم اور وقت پر حاوی ہے۔

رائیڈر بیگڈ کے کردار عائشہ کو مقدس آگ میں بھسم ہو کر پھر سے جو ہے، عمر اور وقت فنا ہو جاتے ہیں.. اور مجھے منظر کا ناگ ڈستا ہے تو میں ایک نئی زب ہوں اور پھر سے نواں نکور ہو جاتا ہوں۔ وہ آگ میں جل کر نوخیز ہوتی تھی اور میرے زہر سے ڈسے جانے کے بعد.. غم۔ خاندان۔ معاشرے اور آس پاس سے لاپرواہی کی آوارگی میں مست اور جوان ہو جاتا تھا۔

میرے سر پر منظر کے کوبرا سانپ کا سایہ ہے..

میں اُن پرندوں کی ڈار میں سے نہ تھا جو سولتی ہائیڈے اِن ہوٹل میں گھوم کر.. بلکہ ایک ریڈی میڈ گھونسلے میں اتر کر چھمانے لگتے ہیں.. بلکہ مجھے تو آوارگی۔ تنکے چن چن کر کسی منظر کے سامنے اپنا گھونسلہ بنانا تھا.. شاید ماؤنٹ ایورسٹ کے ساتھ شاید انا پورنا کے دامن میں..

مجھے تو سمندری پرندے، لونگ ستون سی گل کی مانند حدود کو عبور کر جانا تھا.. شاکیہ شہزادے، سدھارتھ گوتم کی جنم بھوی لومینی تک پرواز کرنا تھا جہاں بھی اشوک اعظم کا نصب کردہ... آج سے بائیس سو برس پیشتر کا نصب کردہ وہ ستون ہے جو اشوک نے اُس مقام کی زیارت کرنے کے بعد وہاں المستادہ کیا تھا جہاں گوتم بدھ سے 1998ء سے چھبیس سو تیس برس پیشتر پیدا ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہاں اشوک قدموں کے نشان آج تک موجود ہیں جیسے حسن ابدال میں گورونانک کے ہاتھ کا نشان صاحب موجود ہے۔ وہ پکارنی نام کا تالاب اب بھی موجود ہے جس میں آس پاس برفوں کے سائے سفید عکس میں لرزتے ہیں جس میں ملکہ مایا نے مہاتما کی پیدائش پہلے غسل کیا تھا۔

میں نے کلورکوٹ کے کھنڈروں میں کسی ایسے پتھر کو چھو کر دیکھا تھا جو اُس مشرقی دروازے کا ایک حصہ تھا جس میں سے مہاتما اپنی راجدھانی کو تیاگ کر اپنے گھوڑے پر سوار باہر آیا تھا۔

اور مجھے ایورسٹ کے بیس کیمپ تک پہنچنا تھا اور نیشنل پارک کی سویر میں سفید گینڈوں کی نایاب نسل اور نیپالی ٹائیگرز کو دیکھنا تھا.. ایک ہاتھی پر سوار ہو کر.. پکھورا جھیل کنارے ایک رات کرنی تھی..

نگرکوٹ میں طلوع آفتاب پر موجود ہونا تھا جب ماؤنٹ ایورسٹ اور اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان پر پہلی کرن اُترتی ہے اور پھر وہ دھیرے دھیرے روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔

میں اُن پرندوں میں سے ہرگز نہیں تھا جو سولتی ہائیڈے اِن ہوٹل کے ریڈی میڈ گھونسلے میں اتر کر چھمانے لگتے ہیں..

لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میں اُنہی پرندوں میں سے ہوں..

کرہ نمبر ۵۵ کی چوکر کھڑکی سے پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا..

بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اُس کے پیچھے شہر ہے۔

بڑھتی جاتی دُھند ہے اور اُس کے پیچھے شام ہے۔

دُھند لے دُھند لے لوگ ہیں اور باغ ہیں اور شام ہے۔

اگرچہ ابھی دوپہر تھی لیکن بڑھتی جاتی دُھند، کھڑکی سے پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا، وادی کھنڈروں پر تھی اور لگتا تھا کہ شام ہے۔

میں نے بہت دیر اس منظر کو اپنے اندر جذب کیا..

یہ دل کو سکھ دینے والا تھا..

اس میں اجنبیت کی رعنائی، پہلی نظر کی گردیدگی اور دل رباعی تو تھی لیکن.. منظر کے اس کوہرے میں وہ زہر ہرگز نہ تھا جو مجھے ڈس کر شانت کر سکے.. جیسے بلونت سنگھ کے کردار گاؤں سے باہر ٹوڑھی کی دسی شراب پی کر بدست ہوتے تھے اور اُن پر کوئی اور بڑھیا سے بڑھیا درآمد شدہ شراب اثر نہیں کرتی تھی اسی طور.. میں نے پاکستان کے

سے خانہ شمال کی جو تیز اور تیکھی شراب پچھی تھی اُس کے بعد مجھ پر اس تمذیب
نیپالی منظر کی سے اثر نہ کرتی تھی۔

شاید یہ اپنے محبوب کمرے کی بدائی کا سوگ تھا کہ مجھے کوئی منظر بھی بھلا
تھا کہ میں اُسے صرف دیکھ سکتا تھا، محفوظ نہ کر سکتا تھا۔

شاید میں اُس عاشق کی مانند تھا جسے شاہ گوری کی گوری برفوں پر اُبھرتے
دھبوں، سنولیک پر رواں بادبانی کشتیوں اور جھیل کرومہر کے پانیوں میں اُترنے کی
ہو چکی تھی اور اب مجھے اُن کے سوا اور کچھ بھلا نہ لگتا تھا۔

اگرچہ یہ زیادتی تھی۔

گلگت کے منظر کو دیکھ کر... راکا پوشی کا خیال نہیں آتا تھا۔

سکرود موٹل میں براجمان ہو کر شاہ گوری اور سنولیک کا گمان بھی نہ ہوتا
تو کھٹمنڈو میں بیٹھ کر بھی.. تو ایورسٹ اور اناپورنا کا خیال یا گمان نہیں ہو سکتا
اور اس کے باوجود..

میرے سامنے بڑھتی ہوئی دُھند تھی.. اور اُس کے پیچھے شہر تھا..

میں نے اپنے ہسپانوی سوٹ کیس کو کھولا.. جیسے محمود غزنوی کا ایاز ہر شب
پُرانا صوفی کھول کر اُس میں پوشیدہ اپنی گڈریا پوشاک دیکھ کر اپنے حال کی شہنشاہی
اپنے ماضی کو فراموش نہیں کرتا تھا..

میں نے بھی اپنی معزز پوشاکوں تلے پوشیدہ اپنی کوہ نوردیوں اور آوارگی
گڈریا لباس نکالے.. سنو جیکٹ کی نیلاہٹ کو اپنے بدن سے آشنا کیا.. اور پاؤں میں جو
پہن کر اُن کے تھے باندھنے لگا۔

یہ مجھے ایورسٹ کے چہین کیمپ تک لے جائیں گے۔

لارڈ بدھا کی جائے پیدائش تک لے جائیں گے۔

یہ مجھے اپنے آپ تک لے جائیں گے۔

”دکھٹمنڈو کا دھوکا دو بار... جھانک لینے میں کیا حرج ہے“

ایمزبس کے بھٹکوں.. نیپالی مزدوروں کی بوئے بدنی اور میڈم شرما کی پھیلی بانس
کی سیڑھی مسکراہٹوں کے درمیان ہم پانچوں نے یہ طے کر لیا تھا.. اور یہ ایک عجیب اتفاق
تھا.. شاید حُسن اتفاق تھا کہ ہم پانچ تھے.. یعنی پنجہ صاحب بھی تھے... عجیب اتفاق تھا.. تو ہم
نے طے کر لیا کہ کل سے تو سینسار کی قید شروع ہو جائے گی چنانچہ صرف آج کا دن ہے
جس میں ہم کھٹمنڈو یا ترا کر سکتے تھے..

چنانچہ ہم پانچوں لُچ کے بعد کمر بستہ تھے.. اگرچہ اُن میں صرف میں تھا جو کمر شکستہ
تھا..

نئی نئی آشنائی تھی اس لئے ہر کوئی چوکنا اور احتیاط پسند تھا..

البتہ لُچ کے دوران ایک سانحہ ہو گیا..

میں کھانے سے فارغ ہو کر ایک نہایت بد ذائقہ سویٹ ڈش نگل رہا تھا جب
ظاہرہ ہمشیرہ.. منظر پر طلوع ہوئیں.. پہلے اُن کی عینک طلوع ہوئی اور پھر اُن کا ورود ہوا..
”مارڈ صاحب.. ہم بھی ذرا کھانے کی جانب جھانک لیتے ہیں لیکن آپ نے کیا کیا
کھلایا ہے؟“

”جناب میں نے ایک بے رُوح اور بے سُر اچکن کھلایا ہے.. مٹن گوشت نوش
کیا ہے جو شاید ربڑ گوشت تھا.. جلی ہوئی ایک چپاتی کھائی ہے..“

”آپ نے..“ ظاہرہ ہمشیرہ نے ایک دردناک ہنسی بھر کر کہا اور اس ہنسی کے زور

سے اُن کی ٹینک ناک پر سرک آئی ”آپ نے گوشت کھایا ہے؟“

”ہاں..“

”حلال ہے؟“

”جی؟“ میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ ”وہ پتہ نہیں“

”حرام کھاگئے؟“

”نہیں جی.. قطعی طور پر نہیں جی..“

”تارڑ صاحب.. آپ نیپال میں ہیں۔ چیک تو کر لیتے... ادھر جھکا ہوتا ہے۔“

”یعنی ادھر..“

”ہاں جی.. چکن کا ٹینٹو دبا کر اُسے ہلاک کیا جاتا ہے اور بھیڑ بکری کی گردن“

کر اُنہیں جاں بحق کیا جاتا ہے.. آپ چیک تو کر لیتے..“

یہ حلال اور حرام کا قصہ بہت پرانا تھا..

یہ اُسی پنکھوں والے جہاز پُر کانٹیلیشن کی اُسی پرواز کا قصہ ہے جو انگلستان

راستے میں قاہرہ رکی تھی اور اُس کا اگلا سٹاپ روم تھا..

اور روم میں ایک اطالوی دوپہر تھی.. گرم بھی سنسناتی ہوئی بھی۔

کراچی میں فلائٹ پر سوار کرتے ہوئے میری کم عمری کی وجہ سے مجھے

مولوی صاحب کے حوالے کر دیا گیا تھا حالانکہ کم عمری اور مولوی صاحب کو یکجا کر دینا

ہی ہے جیسے گیدڑ کو خربوزوں کی راکھی پر متعین کر دینا.. والد صاحب نے کہا تھا ”میرا

صاحب بچتے ہے۔ راستے میں خیال رکھئے گا“ اور اُنہوں نے یہ خیال اس طرح رکھا کہ

مختلف ایئر پورٹس پر اُن کے لینڈنگ فارم بھرتا رہا، اُنہیں راستے بتاتا رہا کیونکہ وہ اُن

سے ناواقف تھے اگرچہ انگلستان میں گوروں کو تبلیغ کرنے جا رہے تھے اور جب میں

دریافت کیا کہ آپ گوروں کو تبلیغ کیونکر اور کیسے کریں گے کہ وہ تو صرف انگریزی

ہیں تو انہوں نے نہایت تيقن سے کہا تھا ”اللہ تعالیٰ سبب پیدا کر دے گا..“

تو روم ایئر پورٹ پر اترتے ہی ہمیں لُچ کوپن ایٹو کئے گئے تاکہ ہم ایئر پورٹ

ریستوران میں دوپہر کا کھانا تناول فرمائیں.. اب جو ویٹرس جسے میں آئی وہ انگریزی

نہیں جانتی تھی چنانچہ مینو کارڈ پر جہاں ”پولے“ کا لفظ دیکھا اُس پر اُننگی رکھ دی کہ

میں ہوٹل بازی کے دوران میں جان چکا تھا کہ چکن کو فرانسیزی میں پُولے کہا جاتا ہے..

مولوی صاحب نے مینو پر سے جھانکتے ہوئے مجھے پوچھا ”برخوردار کیا منگایا ہے؟“

”مغربی کا آرڈر دیا ہے مولوی صاحب“

”حلال ہے؟“

میں گڑبڑا گیا کہ عمر کی نوخیزی تھی پاکستان سے باہر پہلا قدم تھا اور اُن دنوں باہر

ابھی کم کم پاکستانی قدم رکھتے تھے ”پتہ نہیں جی..“

”تم میرے لئے سبزی کا آرڈر دے دو لیکن تلی ہوئی نہ ہو.. اُپلی ہوئی ہو“

میں نے بمشکل ویٹرس کو.. تلی ہوئی نہ ہو، اُپلی ہوئی ہو.. کا فرق اشاروں کنایوں

میں سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد ریستوران میں ایک ٹرائی داخل ہوئی جس پر ایک سلور ٹرے

میں ایک پورا چکن ابھی تک سلگ رہا تھا اور اُس کے گرد رسیلی سبزیوں کے انبار تھے اور

طرح طرح کے ساس اُس کی سنہری جلد کو چمکلاتے ہوئے ہمارے بھوکے ہتھوں میں ایک

ایسی پاگل مہک پہنچاتے تھے کہ ہمارا بس چلتا تو ہم ٹرے کے اپنے تک پہنچنے کا انتظار نہ

کرتے بلکہ شوٹ لگا کر اُسے راستے میں ہی جا لیتے اور سالم ہڑپ کر جاتے.. خدا خدا کر کے

وہ گرم شوٹ شوٹ کرتی لذت ہماری ٹیبل تک آئی اور اُسے میرے سامنے سجایا گیا.. پھر

ویٹرس نے اُسی ٹرائی کے نچلے خانے میں سے ایک چھوٹی سی پرچ نکالی اور مولوی صاحب

کے سامنے رکھ دی۔ اُس پرچ میں حسب آرڈر دو تین پڑمردہ سے گاجروں اور آلوؤں

کے قتلے اور چند مٹریں مڑگشت کرنے کو تھے..

میں نے چکن چکھا تو وہ میرے بھوکے حلق میں ہر جانب زندہ باد کے نعرے لگاتا

ہوا گھل گیا.. مولوی صاحب نے مٹروں کے دودانے منہ میں ڈالے.. انہیں بمشکل نگلا اور

پھر کہنے لگے ”برخوردار یہ چکن کیسا ہے؟“

میں نے شرمندہ ہو کر اقرار کیا کہ ستر نہایت شریلا اور ڈالتے دار ہے..

کہنے لگے ”ویسے یہ شکل سے حلال لگتا ہے.. میرے لئے بھی یہی آرڈر کر دو“

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جب یورپ میں تو بمشکل کوئی پاکستانی یا مسلمان ہوتا تھا

اور انگلستان میں صرف میر پور کا گاؤں آباد تھا اور اہل کتاب کا گوشت حلال ہی سمجھا جاتا

تھا.. کو شرمیٹ اور اسلامی ذبیحہ کا کانسپٹ ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی نوخیزی اور

جمالت کے دن تھے لیکن اب تو میں جماندہ گرگ اور بنیاد پرست ہو چکا تھا لیکن خیال ہی نہ رہا تھا۔ میں تیس برس بعد گھر سے نکلا تھا اور میرے ذہن میں ہی نہیں کہ گوشت کسی اور قسم کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس حرام وقوعے کے بعد میں نے اپنی توجہ سبزیوں اور دالوں پر ہی مرکوز رکھی لیکن اُن کی کوالٹی بھی ایسی تھی کہ چند نو نکلنے کے بعد طبیعت سیر ہو جاتی تھی۔ اُن میں کسی ایسے تیل کی بو تھی جو شاید وہی نیپالی بھائیوں نے کھٹنڈو فلائٹ کے دوران اپنے سروں پر تھوپ رکھا تھا۔ چنانچہ اکثر کی طرف رجوع کیا جاتا۔ لیکن اُن کی سبزیاں بھی پڑمرده اور ڈھیل اور بے کیف ہوتی پاکستانی تَرَکریوں کی طرح اُن کے ذائقے تازہ اور ہرے نہ ہوتے اور نہ اُن کے رُ میں تازگی کا نکھار ہوتا۔

چنانچہ ابھی ہم پانچوں کھٹنڈو کی سیر کے لئے کمر بستہ تھے اور صرف میں تھا جو کی وجہ سے کمر شکستہ تھا۔

نئی نئی آشنائی تھی اس لئے ہر کوئی چونکا اور احتیاط پسند تھا۔

”میں ابھی حال میں ہی۔ یعنی صرف سترہ برس پیشتر کھٹنڈو آچکا ہوں اس میں آپ کو آج کی شام گائیڈ کر سکتا ہوں۔“ ضیاء صاحب نے پیشکش کی۔

چونکہ ہم میں سے کوئی بھی حال ہی میں یا ماضی میں بھی کھٹنڈو نہیں آیا تھا لئے ہم سب نے اُنہیں ایک ایسے پیر و مُرشد کی طرح عقیدت سے دیکھا جو راہبر و راہنما ہو سکتا تھا اور سب جانتا تھا۔ یوں بھی ضیاء صاحب کی داڑھی... اُن گولڈن بیئرڈ ایک ”میوٹی آن دی باؤٹی“ کے ملاح کی طرح چمکتی تھی اور ہم سب بے متاثر ہوئے جب اُنہوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیا کہ... نیو روڈ چلے گا۔

میر نیازی صاحب بے حد خود پسند ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اور جیسا وہ کہتے ہیں اُنہیں خود پسندی کا حق حاصل ہے۔ ایک تخلیقی فن کار خود کو ناپسند کیسے کر سکتا ہے انہوں نے مختلف ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کو کچھ نام دے رکھے ہیں جو قدرے ظالمانہ ہیں لیکن ایسے ہیں کہ یادداشت کے ساتھ چپک جاتے ہیں تو اُنہوں نے بابا ظہیر کا شہیرا کو جنہیں خبر تھی کہ وہ چراغِ آخر شب ہیں اور اُن کے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے اُن کی سنہری فرنج کپڑا داڑھی کی نسبت سے اُنہیں ”سنہری بچھو“ کا خطاب دیا تھا۔

ظاہر ہے میں ضیاء صاحب کی گولڈن بیئرڈ کے حوالے سے اُنہیں یہ خطاب دے کر گستاخی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن... اُنہیں سنہری بابا کہنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ضیاء صاحب نے اگرچہ ہوٹل سولتی کے پورچ میں ٹیکسی ڈرائیور کو ”نیو روڈ چلے گا“ کا حکم دے کر ہمیں متاثر کر لیا تھا لیکن ٹیکسی ڈرائیور ہرگز متاثر نہ ہوا اور ایک بڑا سا غار نما منہ کھولے ہمیں دیکھتا رہا۔

ضیاء صاحب نے پہلے تو اپنی انگریزی جیسی بھی تھی آزمائی پھر تنگ آ کر اپنے پشاوری لہجے میں کہنے لگے ”اوئے کافر کے بچے چلے گا؟“

اور حیرت انگیز طور پر کافر کے بچے نے پہلے تو زور زور سے سر ہلایا اور جواب میں ایک انگریزی۔ ہندی۔ سنسکرت۔ ہندوستانی۔ اردو اور شاید پنجابی میں بھی ایک ایسی لمبی تقریر کی کہ اُسے فل سٹاپ لگانا مشکل ہو گیا۔

”چپ کرو یارا۔“ ضیاء صاحب نے ڈانٹ پلائی۔

یارا فوراً چپ ہو گیا۔

”چلے گا؟“

”کہاں چلے گا؟“ اُس نے پوچھا ”دھوکا دربار چلے گا؟“

”دفع کرو جی۔“ طاہرہ بی بی نے عینک اور ناک بیک جنبش چڑھائی ”یہ ہم سے دھوکا کر رہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کسی ایسے دربار میں جہاں دھوکا ہوتا ہو“

”ویسے دُنیا میں کونسا ایسا دربار ہے جس میں دھوکا نہیں ہوتا ہمیشہ...“

ہمیشہ کے مرتبے پر فائز ہوتے ہی طاہرہ بی بی نہایت خوش ہوئیں اور مجھے پہلی بار تو قہری نظر سے دیکھا۔

”یارا ہم نیو روڈ جائے گا۔“ ضیاء صاحب نے پھر اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کیا۔

”چلے گا“

ہم سب ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

وہ ٹیکسی جس میں ٹریفک زولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہم پانچوں سوار تھے اُن آتش کدہ ایران کے سلگتے سرخ شگونوں والے درختوں کی قربت میں سے ہو کر نکلی جن کو صرف میں دیکھتا تھا۔

ڈرائیور ہمیں پھر نیو روڈ کے صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی کوشش میں جنر
 ”اچھا اچھا تو آپ پشوپتی ناتھ چلے گا۔ سب لوگ اڑھر جاتا ہے۔“

”یہ.. یہ.. کوئی نہ تھتھ ہیں؟“ فاروق نے مونچھوں کو ایک بے وجہ بل دیا۔
 ”یہ تو ہندوستان سے آنے والے ہندو لوگ کا سب سے بڑا مندر ہے۔ آپ
 ہیں ناں؟“

”لا حول ولا..“ طاہرہ بی بی اپنے عقیدے پر یہ براہِ راست یلغار برداشت نہ
 سکیں ”ہندو ہوں گے تمہارے ہوتے سوتے۔“

”ہم تو ہندو ہیں۔“ ڈرائیور نے دانت نکال کر کہا کہ ہم ہیں جو کچھ کرنا ہے کر
 اور مت بھولو کہ تم ہمارے دیس میں ہو اور نیپال دنیا کی اکلوتی ہندو سلطنت ہے۔۔۔
 طاہرہ بی بی عرف ہمشیرہ فوراً بیک آؤٹ کر گئیں۔ ”اللہ آپ کو ہندو ہونا مہار
 کرے۔ ہم بھی کسی زمانے میں شاید ہندو ہوا کرتے تھے لیکن اب اللہ کے فضل
 مسلمان ہیں۔“

”تو مسلمان پشوپتی ناتھ جی کو نہیں مانتا؟۔ کیا مسلمان ہے“ ڈرائیور ادا کا
 نہیں کر رہا تھا اُس کی حیرت بجا تھی۔ جیسے ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی شخص
 صاحب.. پیر عبدالقادر جیلانی یا امام رضا کو کیسے نہیں مان سکتا۔ اُس کی سمجھ میں یہ
 آ رہا تھا کہ کوئی پشوپتی ناتھ جی کو کیسے نہیں مان سکتا بے شک وہ مسلمان ہو۔

”ہم کسی بھی ناتھ وغیرہ کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ ہیں کون۔“ خالدہ سرگوشی سرگ
 میں بیدار ہوئیں۔

”پشو کا مطلب ہے جانور.. جانتا ہے؟“

سب نے انکار میں سر ہلایا لیکن میں نے اجتناب کیا۔ صرف اس لئے کہ میں
 تھا۔ بچپن میں جب میری بڑی خالہ جان ہمیں جھانویں سے رگڑ رگڑ کر اور کانوں میں
 تک انگلیاں چلا کر لائف بوائے صابن کو منہ اور آنکھوں میں بھی لگا لگا کر گاؤں کے گھر
 کھرے میں سنلاتی تھیں تو ہمیشہ کہتی تھیں ”تم پشو ہو یا بندے ہو اتنے گندے ہو“
 اور خالہ جان کی ایک رگڑائی سنلانی کے بعد بچہ صاف ستھرا اور لٹ لٹ کر
 لگتا تھا۔ اُس کے کان لمبے ہو جاتے تھے۔ اور بدن پر اتنی خراشیں ہوتی تھیں کہ وہ اُن

آفریشیو لوشن لگانے کا ریسک نہیں لے سکتا تھا۔
 ”یہ جانور لوگ کا بھگوان ہے۔ بندر لوگ کا۔ بھینس کا اور گنوا ماما کا۔ اور پگ

لوگ کا“
 ”اوائے تمہیں ہم سب کی شکل میں کہیں کوئی اس قسم کے پشو کا شکل دکھائی دیتا
 ہے کہ ہمیں اس قسم کے بھگوان کی ضرورت ہے“ ضیاء صاحب تاکا میں آگئے ”بس تم
 ہمیں نیو روڈ لے چلو۔“

ٹیکسی ڈرائیور پھر بھی پشوپتی ناتھ جی کے گن گاتا رہا ”اڑھر ہندوستان سے بڑا بڑا
 سینٹھ آتا ہے اور لاکھ روپے دان کر کے کتا ہے کہ ہماری طرف سے روزانہ پشوپتی ناتھ
 جی کو گائے کے دودھ میں منلاؤ۔“

”تم بھی درشن کو جاتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”صاحب پیسے والا لوگ درشن کو جاتا ہے۔ ہم غریب لوگ ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھا
 بیٹھا پر نام کر لیتا ہے۔ صاحب ہمارے پاس اتنا دودھ ہو تو ہم بھگوان کو منلانے کی بجائے
 اپنے بچوں کو پلائے۔“

اس ڈرائیور پر اگرچہ ہنک پشوپتی ناتھ جی کا مقدمہ دائر ہو سکتا تھا لیکن شاید
 نیپال میں اس قسم کا کوئی قانون نہ تھا ورنہ ہم فوراً رپورٹ کر دیتے۔

حیرت ہے۔ ہندوؤں میں بھی بے دین اور ملحد عناصر پائے جاتے تھے۔
 ٹیکسی دریائے بھاگ متی کے پل پر سے گذر کر ذرا اونچائی پر پڑانے شہر کے گلی
 کوچوں میں دندناتی ہوئی داخل ہو گئی۔

ہم دم بخود تھے کہ ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ اتنی تنگ گلیوں میں موچی دروازے
 اور ہیرا منڈی کی گلیوں میں سے کوئی ٹیکسی یا کار بھی گذر سکتی ہے۔

یہ علاقہ میرے لئے نہایت نایاب، دلکش اور دل پذیر تھا اور میرے عقیدے کے
 لئے نہایت مخرب الاخلاق تھا۔ یہاں بھی جگہ جگہ بھگوان اور بھگوانیاں آسن جمائے بیٹھے
 تھے اور کتنے بھلے لگتے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر میرے اندر کا ہندو کروٹیں لیتا تھا اور چاہتا
 تھا کہ اُن بچاریوں میں شامل ہو جائے جو انہیں زعفرانی چاول اور دودھ بھینٹ کر رہے
 تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو ہماری خیریت نیک مطلوب تھی اس لئے نیپالی ٹیکسی ڈرائیور ذرا

ممکن نہ تھی.. اور یہ ہماری خواہش بھی نہ تھی۔
اس لئے دو ٹیکیاں تھیں جو نیو روڈ کے چوراہے پر رکھیں۔
”کتنا پیسہ؟“ ٹیکسی سے اترتے ہوئے خالص صاحب نے اپنی سنہری داڑھی پر ہاتھ
پھیرا..

”پچاس روپیہ“ جواب آیا..
ہم نے اُسے پچاس روپے نیپالی عطا کئے تو ڈرائیور جو ابھی تک اس ناکبھی میں
تھا کہ یہ لوگ پشوتی نا تھ جی کے مندر کی یا ترا کو کیوں نہیں گئے کئے لگا ”آئی سی..“
ہم نے کہا ”بالکل آئی سی.. بلکہ یو سی..“ ہم بھلا انگریزی بولنے میں پیچھے رہ سکتے
تھے اور آئی سی یو سی کا مطلب نہیں جانتے تھے۔
لیکن وہ ملعون مسلسل بضد رہا ”نہیں.. آئی سی.. آئی سی“

بالآخر یہ کھلا کہ نیپال کی راجدھانی میں ایک تو اُن کا اپنا نیپالی سکتہ روپے کی
صورت میں چلتا ہے اور اُس کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی روپیہ بھی رائج اور افضل ہے
جسے.. آئی سی.. یعنی انڈین کرنسی کہا جاتا ہے.. اس آئی سی بحث کے بعد سنہری بابا جہاں بھی
جاتے، کسی دوکان، ہوٹل یا فٹ پاتھی بازار میں تو کسی نہ کسی شے کی جانب اشارہ کر کے
بہ آواز بلند پوچھتے.. آئی سی میں کتنا؟.. ہم پوچھتے آپ خریدتے تو کچھ ہیں نہیں پوچھتے کیوں
ہیں؟ کتنے پوچھنے میں کیا حرج ہے..

نیو روڈ کے چوک میں لمحدین اور کافرین کی ایسی زبردست رونق تھی کہ ہم دنگ
رہ گئے.. ”اب کدھر جائیں؟“

”اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے اور مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر
جائیں گے..“ سنہری بابا نے ایک بلند آہنگ قہقہہ داغنے ہوئے جواب دیا۔

ہم اس شعر اور اس قہقہے کے معانی کی گہرائی تک ہرگز نہ پہنچ سکے.. سنہری بابا کو
غالب کونٹ کرنے کا خط تھا اور یہ خط ہمیشہ بے موقع ہوتا۔

”ادھر یہ سامنے ہومان دھو کا ہے تارڑ صاحب، کھٹنڈو کے قدیم مندروں کا سب
سے بڑا مجموعہ... ادھر چلتے ہیں“

یعنی ہمارے ساتھ پھر دھو کا ہو گیا تھا..

دیرج سے اور تھل سے ٹیکسی چلاتے تھے.. اگر ان گلیوں میں کوئی پاکستانی ڈرائیور آ
اُس کی گردن پر ہمارے علاوہ درجنوں بھگوانوں کا خون ہوتا..
ٹیکسی نیو روڈ کے چوک میں کھٹنڈو کی شام میں رُکی...
لیکن اس سے پیشتر ہماری ناقص عقل میں یہ نہ آتا تھا کہ اتنے تنگ راستہ
یہ ڈرائیور مندروں۔ دیوی دیوتاؤں اور لوگوں کو بچاتا ہوا کیسے گذرتا ہے۔
ویسے میں نے اہل کھٹنڈو کو نہایت ملحد اور بے دین پایا۔

یہ سب کے سب ایئر پورٹ والے ٹورسٹ خان صاحب کے بقول سب
سب کافر کے بچے تھے اور اُن کی بخشش کا کوئی امکان نہ تھا۔
ٹیکسی میں سے میں دیکھتا تھا کہ وہ اپنے پتھر کے خداؤں کے سامنے نذر نیازا
تھے اور سر جھکاتے تھے..

میرے لئے یہ ایک شدید قسم کا کچھل شاک تھا..
میں اپنے تئیں ایک صاف ستھرے نھرے ہوئے وحدانیت پر متمم یقین
والے معاشرے سے آیا تھا.. اور یہاں خداؤں کی کلینٹرنس سیل لگی ہوئی تھی۔ کہیں
دیوی گلے میں کھوپڑیوں کا ہار سجائے براجمان ہے.. کہیں مہاراج گنیش اپنی سونڈھ لہرا
ہیں اور کہیں ہومان جی اپنی ڈم اٹھائے کھڑے ہیں اور کہیں.. خواتین اُس رنگ کو
ہیں.. بوسے دیتی ہیں۔ پھول چڑھاتی ہیں اور تیل بھینٹ کرتی ہیں۔ دشمنو مہاراج کے
ایستادہ لنگ کو جس کا تذکرہ ہم پاکیزہ رُوحوں کے لئے ممنوع ہے..

چنانچہ ٹیکسی رُکی اور ہم نیو روڈ کے روشن جگمگاتے چوراہے میں اتر گئے۔
البتہ میں یہاں ایک تصحیح کرنا چاہتا ہوں.. ٹیکسی ایک نہ تھی.. دو تھیں.. ا
میں کہہ چکا ہوں کہ ہم پانچوں ٹریفک کے رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ہی
میں سوار ہوئے تھے لیکن.. یہ تو ہماری پاکستانی خواہش تھی کہ اسی طرح گذر اوقات
جائے لیکن بے دین ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کر دیا... ویسے بھی ایک ہی ٹیکسی میں گذر
کرنے کی خواہش کی زد میں عمدہ اخلاقیات بھی آتی تھیں.. ایک ٹیکسی میں.. ہم
ہم پہلو اور ہم آغوش ہو سکتے تھے.. ذرا جڑ کر بیٹھ سکتے تھے.. لیکن ہمارے ساتھ
تھیں.. خالدہ سرگوشی تھیں اس لئے ہمارے لئے اس قسم کی غیر شرعی اور غیر محرم رفا

”کدھر چلتے ہیں؟“ خالدہ سرگوشی جو حسب عادت یا روایت گم سم تھیر کر بولیں۔

”ہنومان دھوکا۔“

”نہ جی۔“ طاہری دی گرل گائیڈ جو آج صبح تک محض ایک عام سی گرا تھیں اپنی عبادت گزاری اور خوشگوار کلامی کے باعث اب ہمیشہ کے رُتبے پر فائز تھیں اُنہوں نے سر ہلا کر ”نہ جی“ کہا۔

”کیوں نہ جی؟“ فاروق نے فوراً کہا کہ وہ نیو روڈ کی چہل پہل میں ایک کرنت کی طرح دوڑتی زندگی کی گرفت میں آچکا تھا۔

”ہمیں کسی قسم کے کافرانہ دھوکے میں نہیں آنا چاہئے۔ اپنا ایمان سلامت بے حد امپارنٹ ہے۔“

”یا تو آپ اپنا ایمان سلامت رکھئے یا اسے کھنڈو کے دھوکے میں آکر پڑے“ چلئے یہ دھوکا بھی کھا کر دیکھتے ہیں۔“ ہمیشہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے پس عینک اُن کی آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ وہ ہماری ٹانگ کھینچ رہی ہیں۔ انہوں نے اس کا نام دھوکا دربار کیوں رکھا ہوا ہے۔ کوئی ٹیک ہے“

”ہمیشہ لاہور کے قریب ہم نے بھی ایک قصبے کا نام دھوکا منڈی رکھا ہو اُس کی کیا ٹیک ہے؟“

”لو ہم تو مسلمان ہیں جو جی آئے کریں۔“ ہمیشہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ہنومان دھوکا میں کوئی بھی کار۔ ٹیکسی کوئی میکاکی ٹرانسپورٹ داخل نہیں سکتی۔ صرف سیاح، یاتری اور سائیکل رکشا داخل ہو سکتے ہیں۔

اور ہمیں دائیں جانب وہ چوٹی محل تھا جس کی کھڑکیاں جھلکی جاتی تھیں اور کے در ہم پر اُڑتے تھے۔ انہی کھڑکیوں کی آرائشی کاریگری لاہور کے قدیم شہر وکوں اور بالکونیوں کو شرمندہ کرتی تھی۔ میں ان کی اثر انگیزی کو کیسے قبول کر لیتا کسی اور عقیدے کا آسمانی حُسن تھا اور مجھے کہا جاتا تھا کہ بنیاد پرستی میں ہی عافیت ہے ہم سب اپنی اپنی دنیاؤں اور عقیدوں میں ہی مست رہتے ہیں۔ ادھر ادھر؟

منع ہے۔ بس یہی ایک دنیا ہے، یہی ایک راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے ہم جنت میں جا

ہوں گے۔

اور جب ایک اور دنیا۔ ایک اور راستہ دکھائی دیتا ہے تو ہم فوراً آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور ناراض ہو جاتے ہیں، رنجش میں چلے جاتے ہیں۔ ہمارا دل دکھتا ہے۔ ہم مفاہمت نہیں کر سکتے۔ اور یوں بھی کفر کے ساتھ مفاہمت کرنا اپنی عاقبت کو گنوا ہے۔ لیکن یہ محل ایک معجزہ ہے۔ کسی دوسرے یقین اور ایمان میں بھی تو معجزہ رونما ہو سکتا ہے۔

بنت پور چوک میں۔ اُس کے پتھر لیلے فرش پر تاحد نظروہ سب کچھ سجا تھا جو کسی غیر نئی سیاح کی جیب میں سے اُس کا آخری ڈالر نکلا لینے پر قادر تھا۔ بنت پور چوک نیپالی، ہندوستانی اور ہانگ کانگی اور کہیں کہیں پاکستانی اور کشمیری بینڈی کراٹس کی ایک وسیع اور اوپن ایئر نمائش تھی۔ اور یہاں کے دوکاندار اور دوکانداریاں سیاحوں کو پھانسنے میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔

جونہی۔۔۔ بدھ کے مجستے۔ لکڑی کے شیر اور ہاتھی۔ وشنو کے نقاب۔ شد کے پیالے۔ گل دان۔ تاترک آرٹ کے نمونے۔ شطرنج کے مہرے۔ بھینسے۔ جناب شیوا کے ٹنگ۔ منقش کھڑکیاں، مور کے پڑ، پینٹ کئے ہوئے چروں والی گڑیاں، تبت کے ظروف۔۔۔ سامنے آئے تو خالدہ سرگوشی کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ گم ہو گئی۔

نیپال کے قیام کے دوران کسی جگہ، کسی شوکیس میں یا فٹ پاتھ پر جب وہ کوئی ایسا شے دیکھ لیتی جو ”شاپنگ“ ہو سکتی تھی تو اُس پر یہی پتھرا جانے والی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ دنیا و مافیہا سے کٹ کر کسی اور جہان میں چلی جاتی، اور کبھی اس دوکان کے اندر اور کبھی اُس سٹال پر اور کبھی فٹ پاتھ پر سچے نمونوں پر نظریں بچھائے جھلکی چلی جاتی اور غائب ہو جاتی۔۔۔ اکثر ہم آگے نکل جاتے اور یکدم احساس ہوتا کہ خالدہ ندارد۔ اس کے بعد ایک سرچ پارٹی ترتیب دی جاتی جو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر اُسے کسی تبتی دوکاندار کے ساتھ کسی بدھ راہب کے پیالے کے بارے میں مول تول کرتے تلاش کرتی اور تقریباً زبردستی واپس لے آتی۔۔۔

”شاپنگ“ دیکھتے ہی وہ حسن بن صباح کی جنت میں چلی جاتی۔

”نہیں چاہئے۔“

”چلو دس ہزار نیپالی تو ڈرٹ چپ ہیں... میں تمہیں ایک اچھی قیمت دے رہی ہوں.. اس پر بڑے پتھر پلاسٹک کے نہیں اصلی ہیں.. آخری قیمت پانچ ہزار ہے.. کیا تم دشمنوں کے لئے اتنی قیمت بھی نہیں دے سکتے..“

”نہیں..“ میں اُس کی چرب زبانی کو انجائے کر رہا تھا۔ ”میں دشمنوں کے ماننے والوں میں سے نہیں ہوں..“ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن ذرا ڈرا بھی کہ کہیں دشمنوں ایک اور سچ نہ ہو.. اور اگر ہوا تو میری پوزیشن بہت آکورڈ ہو جائے گی۔

”انڈین ہو؟“

”نہیں، پاکستانی۔“

اُس بچی خاتون نے مجھ پر ایک نظر حقارت ڈالی کہ خواہ مخواہ میں اپنا نام پھوکت میں خراب کیا اور فوراً ایک گورے سیاح پر دشمنوں کے ڈورے ڈالنے لگی۔

خلدہ سرگوشی بار بار ایک موٹی جیتی عورت کے پاس جاتی تھی، کچھ بینڈی کراٹھس اٹھاتی تھی انہیں حسرت سے دیکھتی تھی، جیتی خاتون کو کچھ کہتی تھی جواب میں وہ سر ہلاتی تھی اور وہ واپس آجاتی تھی۔

”تارڑ صاحب ادھر آئیں..“

تارڑ صاحب ادھر چلے گئے۔

اُس نے سیاہ رنگ کے منقش دو گلدان اٹھائے اور کہنے لگی ”یہ پانچ سو نیپالی میں منگے ہیں؟“

خلدہ دی شاپنگ گرل نے واقعی پورے بسنت چوک میں بکھرے جعلی نوادرات میں سے دو ایسے گلدان سپاٹ کر لئے تھے جو یونیک تھے..

”اگر تمہیں منگے لگتے ہیں تو میں خرید لیتا ہوں۔“

”جانے دیں تارڑ صاحب.. میں اس مائی کو دو ہزار روپے سے پانچ سو تک لائی ہوں، میں ان گلدانوں کو جانے دیتی ہوں“

خلدہ کی شاپنگ میں ایک اور شاپر کا اضافہ ہو گیا..

بسنت پور چوک کے پہلو میں ایک اور پُرونیق سیاحوں کی آماجگاہ بازار تھا جس

وہ کوئی ہیر، کوئی صاحبان، کوئی جولیت ہو جاتی جو ”شاپنگ“ کے عشق میں جاتی۔ وہ ایک بے خود شاپر تھی جو رہ نہیں سکتی تھی۔

کوئی ایک جھکا۔ ایک مجسمہ۔ ایک لیپ شیڈ۔ ایک شال... اُسے ہم سے دیتے۔

چونکہ وہ اکثر گم ہو جاتی تھی اس لئے عوام الناس نے اُسے گمشدہ حسینہ دے دیا۔ ہم نے اگلے چند روز کے دوران اپنا نصف وقت سیر سپاٹے میں گزارا اور نصف وقت اُسے تلاش کرنے میں گزارا..

لیکن یہ ”وینڈو شاپنگ“ کی بیماری ایسی متعدی تھی کہ اُس کی رفاقت کی وجہ ہم سب بھی آہستہ آہستہ مبتلا ہو گئے.. اور شاپنگ مینی ایک ہو گئے۔

بسنت پور چوک میں سحر انگیزی ہی ایسی تھی کہ میں خود اس میں گم ہو گیا.. ”میں تمہیں بہت اچھی قیمت دوں گی... دشمنوں کا نقاب ہے اس پر جڑاؤ کا

اصلی پتھروں کا ہے اور دو سو سال پُرانا ہے..“ ایک نوخیز اور قدرے کایاں نیپالی بچی میرے چہرے کے آگے وہ نقاب یوں دکھاتی تھی جیسے آئینہ دکھا رہی ہو.. اور آئینے میں کیا ہوں کہ یہ بڑے بڑے دانت اور سُرخ زبان.. میں نے فوراً اپنے آپ کو تسلی دی کہ یہ یہ شکل تمہاری نہیں نقاب کی ہے.. اگرچہ چند برسوں میں تقریباً ایسی ہی ہو جائے گی.. ابھی نہیں..

”تو یہ دو سو برس پُرانا ہے..؟“

”دو سو برس سے بھی زیادہ پُرانا.. میں تمہیں بہت اچھی قیمت دوں گی..“

”لیکن میرے ٹورسٹ کمانچے پر درج ہے کہ کوئی سیاح نیپال سے باہر کوئی ا

شے نہیں لے جا سکتا جو سو برس سے زیادہ قدیم ہو..“

”تم پورا دھوکا دربار اٹھا کر لے جاؤ تو بھی تمہیں ایئر پورٹ پر کوئی نہیں روکے

یہ تو ایک چھوٹا سا نقاب ہے... لے جاؤ تمہارے گھر میں اس کی برکت سے جن برس میں تمہیں ایک اچھی قیمت دے رہی ہوں“ وہ ایک ریمارکبل سیلز گرل تھی۔

بولتی چلی جا رہی تھی۔ میں اُسے صرف بولتے دیکھ رہا تھا اور وہ بولے چلے جا رہی

”صرف پندرہ ہزار نیپالی میں ایک جینوئن اینٹیک...“

میں ٹورسٹ ایجنسیاں تھیں۔ سستے ہوٹل اور شراب خانے تھے اور ایک ریسٹوران بھی تھا جس میں جھولتے بجلی کے رنگ برنگے بلبوں تلے ایک فوارے میں سونڈھ ملنے ایک مہاراج بھی تھے۔

یہاں جگہ جگہ ”انٹرنیشنل فون کال۔ فیکس“ کے پتھر چسپاں تھے۔ شیڈ دروازوں کے پیچھے سیاح اپنے اپنے دیسوں سے بات کرتے تھے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم آج کی شام ہنومان دھوکا میں اترتی شام کے دھوکے پل دوپل کے لئے نکل کر اُس شام میں پہنچ سکیں جو ہمارے گھروں میں بھی اترتی ہوگی یہ ممکن تھا۔

متعدد ٹیلی فونوں پر حکومت کرتی ایک ستھری مسکراتی نیپالی لڑکی نے جب فراہم کردہ نمبر گھمایا۔ چند لمحے سنا اور پھر فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں یقین نہ کر سکا کہ اس کے آخری سرے پر عینی ہو سکتی ہے۔

”ہیلو بیٹی میں اٹو بول رہا ہوں۔“
”ابو۔“ اُس کی آواز میں شگوفے کھلنے لگے اور اُن کی منک مجھ تک پہنچی ”

”کھٹنڈو سے۔۔ دھوکا دربار سے۔۔ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ آپ کیسے ہو؟“
”اٹو مجھے فریالوجی میں کنگ ایڈروڈز کی بہترین طالبہ کا گولڈ میڈل ملا ہے 96-97 کی بہترین طالبہ کا۔ تقریب میں آپ کو بھی بلایا گیا ہے۔“

”کیا بات ہے عینی بیٹی کی۔“
”اور سلجوق بھائی کو ابھی سول سروس کی کال نہیں آئی اور سمیر نے اس بار کالج میں ٹاپ کیا ہے۔“

لگتا تھا کہ تمام اچھی خبریں۔۔ ایسی خبریں جن سے والدین خوشی سے بیوقوف جاتے ہیں۔۔ میری کھٹنڈو روائگی کی منتظر تھیں۔۔ عینی کی آواز ایک گونج کے ساتھ دور آتی تھی۔

”امی کہاں ہیں؟“
”وہ کچن میں کچنار گوشت پکا رہی ہیں۔“

”ام نہیں بلاؤ۔“
”امی۔۔ ابو کا ٹیلی فون۔۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ اگر میں فون تک آؤں گی تو ہانڈی جل جائے گی۔“

”کچنار گوشت مجھ سے زیادہ اہم ہے۔“ میں نے جل کر کہا۔۔ لیکن فوراً ہی مونا لائن پر تھی۔۔ ”ہیلو۔۔ کی حال اے؟“

اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا لائن کٹ گئی۔ کیونکہ میں نے ہی نیپالی نار کو کہا تھا کہ تین منٹ بعد اُس کو نیکٹ کر دینا تاکہ۔۔ خرچہ زیادہ نہ ہو۔

گھریات کی تو فون لائن میں رچی ہوئی کچھ اڈاسی بھی بدن میں اُتری۔ اس بازار میں۔۔ اس کی چہل پہل اور ٹورسٹوں کی چہل قدمی میں میں نے ایسے متعدد ریسٹوران دیکھے جن میں کوئی بھی شام خمار اور خوشی کی شام ہو سکتی تھی۔۔ اور وہاں ایسے سیاح بیٹھے تھے مہماندہ اور ہنومان کے مجسموں کی قربت میں اور اُن کے چرونوں میں چراغ جلتے تھے اور وہ خمار اور خوشی میں تھے۔

اور یہیں اسی بازار میں میں نے دوسری منزل پر واقع ایک ریسٹوران کی کھڑکی میں اُس لڑکی کو دیکھا تھا جو اپنے پرجوش نیپالی بوائے فرینڈ کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اُن لوگوں پر جو نیچے بازار میں چلتے تھے اک نظر کرم کرتی تھی۔۔ اور اُس کے بال سنہری اور بے پرواہ تھے اور جہاں کہاں اُس کے بال تھے وہاں بھی سنہری ہوں گے اور اُس کا جوانی سے دکھتا چہرہ ایک مستی کی مسرت میں نیچے دیکھتا تھا جہاں ہم تھے مگر ابھی ہم اُس سپاٹ تک نہیں پہنچے تھے جس پر وہ اپنی نظر کرم کرتی تھی۔۔ اور جب میں اُس سپاٹ میں داخل ہوا جس پر اُس کی گونا بے خودی آنکھیں مرکوز تھیں تو میں نے مسکرا کر ہاتھ بلایا۔ وہ قدرے متعجب ہوئی اور پھر ذرا آگے جھک کر ایسے کہ اُس کے بدن کا بالائی بوجھ بھی جھکا اُس نے ایک مست مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلا کر اپنی سرخوشی کا اظہار کیا۔۔ یہ حسینہ اگرچہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں تھی بلکہ اُس کا نیپالی بوائے فرینڈ اُسے بعد میں سنبھالنے کی مصیبت میں شاید مبتلا تھا لیکن اُس نے ایک غم ریسیدہ نائٹ کو ہاتھ بلایا تھا جو شولری کے تمام تر آداب سے واقفیت کے باوجود اُس کھڑکی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

”یہ آپ ہر کس و ناکس کو ہاتھ ہلاتے چلے جا رہے ہیں؟“ ہمیشہ طاہرہ نے بہت

تیش کے چروں میں بیٹھے ایک بچاری کے پاس دریافت کر لیا گیا اور وہ بچاری کے گلے میں جو ملائیں تھیں ان کا سودا کر رہی تھیں۔

وہ عزیز از جان چیکو گائیڈ ابھی تک ہمارے آس پاس منڈلاتا چلا آ رہا تھا۔
”نساء صاحبہ! اس کردار کو رخصت کر دیں۔ اسی میں بہتری ہے“
”تم رخصت ہو جاؤ“ سنہری بابا نے فوراً کہا۔

وہ نہیں ہوا۔

”یہ تو نہیں ہوتا۔“ انہوں نے بے چارگی سے کہا۔

”تم کیوں رخصت نہیں ہوتا؟“ میں نے ذرا تمکنت سے کہا۔

”ہارٹ صاحبہ! فاروق آگے آ گیا“ یہ دیوی دیوتاؤں سے ملائے گا۔ یعنی دیویوں سے بھی ملائے گا۔“

”آپ صرف چائے پلا دیتا۔ اور کچھ نہ دیتا“ وہ لجاجت سے بولا ”ہم ہسٹری بتائے

گا“

”صرف چائے؟“

”یس سر۔ میرا نام پرکاش ہے“

دھوکا دربار میں شام اترنے لگی۔

ایک ایسے مندر کے سامنے جس کی آہنی جالی کے پیچھے شیوا کا نقاب ڈھلتی شام میں زندہ ہوتا لگتا تھا۔ اور جس کے منہ سے خاص موسموں میں شراب کی آبشار بہتی تھی، وہاں ایک بہت بڑی گھنٹی لگتی تھی۔ اور ہر نیپالی پہلے اُسے پر نام کرتا تھا، سینے پر ہاتھ باندھ کر سر جھٹکاتا تھا اور پھر ہاتھ بلیند کر کے اُسے حرکت دے کر ٹن ٹن بجاتا تھا اور ایک شام کے لئے مناسب ثواب کما کر رخصت ہوتا تھا۔ جیسے ہم سلطان باہو اور بہاؤ الدین زکریا کے مزاروں پر بھی سبز چادروں کے کناروں پر رکھے رنگین لٹوؤں کو اٹھا کر چومتے ہیں اور ثواب کما کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر اُس گھڑیال میں سے لٹکتی آہنی زبان کو تھام کر اُسے جھولایا اور دھکیل دیا۔ ایک گہری گونج والی ٹن ہوئی اور مجھے یوں لگا جیسے دھوکا دربار کے تمام مندروں کی گھنٹیوں کے در کھل گئے ہیں اور وہ ایک مترنم تسلسل کے ساتھ ٹن ٹن۔

مانڈ گیا۔

”یہ کس دن کس نہیں، ایک پریٹی گرل ہے۔“

”آپ اسے جانتے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ جب کبھی کوئی کھڑکی کھلتی ہے اور اُس میں کوئی دل نزا چہرہ ہوتا ہے اُسے میں جانتا ہوں“

”معیوب حرکت ہے ویسے۔۔۔ آپ کو اپنی شہرت اور سٹیٹس کا خیال رکھنا چاہیے یوں لفتگوں کی طرح اشارے نہیں کرنا چاہئیں۔“ ہمشیرہ نے ذرا رنجیدہ ہو کر کہا۔
درمندانہ مشورہ دیا ”اور تارڑ صاحبہ! میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ جب کبھی آپ کوئی سردار جی نظر آتے ہیں تو آپ آپ سے باہر ہو جاتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں سردار جی کی ہو رہیا اے۔۔۔ لوگ کیا سوچیں گے آپ کے بارے میں۔۔۔ آپ کو پاکستان وقار کا کم از کم خیال رکھنا چاہئے۔“

”یہی تو تیش کا مقام ہے ہمشیرہ۔۔۔ کہ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں پہچانتا میں یہاں وہ ہوں جو آج سے تیس برس پیشتر ہوا کرتا تھا۔۔۔ ایک گناہ آوارہ گرد۔ جو من موج میں جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ کسی کو بھی اشارے کر سکتا ہے۔ وہاں میں ایک حما میں قید رہتا ہوں۔ اپنی اوجھی اور بازاری شہرت میں قید۔ یہاں میں ایک آزاد پرندہ ہوں بہت سارے پرندوں میں ایک پرندہ۔“

”لیکن ہم لوگ تو آپ کو جانتے ہیں ناں؟“

”آپ وطن واپس جا کر بے شک میری ان کرتوتوں کے بارے میں ایک پرندہ کانفرنس طلب کر لینا اور میں نہایت دانشورانہ بردباری سے سوچی ہوئی سنجیدہ ہوتی ہوں۔ ان الزامات کی تردید کر دوں گا۔ آپ کی رپورٹ پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔“
”ویسے مجھے اور میرے خاوند کو کبھی یقین نہیں آئے گا کہ آپ ایسے بھی ہوتے

ہیں“

”ہم نہ صرف ایسے بلکہ ایسے ویسے بھی ہو سکتے ہیں ہمشیرہ۔“

”خالدہ کہاں ہیں؟“ یکدم کسی نے چونک کر کہا۔

”وہ پھر لاپتہ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ایک سرچ پارٹی ترتیب دی گئی اور اُسے بلا کر

اکٹھے ہوئے تھے اور ہماری شناسائی چند گھنٹوں اور ایک آدھ گھنٹی بجانے پر محیط تھی اور اس کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ یہ آشنائی برسوں کی ہے اور ہم ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔

مجھے ہمیشہ اپنے پروٹونائپ ایج کو شکستہ اور تاراج کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس ہوتی ہے کہ یہ مجھے، میرے اصل، کو نہ بیان کرتا ہے اور نہ میری نمائندگی کرتا ہے۔ نہ میری صورت اور روپ اور کردار کی تصویر کشی کرتا ہے۔ میں اپنے جعلی ایج سے بالکل جدا شخص ہوں۔ مجھ میں شک اور شونی بہت ہے جو اکثر بے محل ہوتی ہے۔ اور میرے چاروں ساتھیوں نے یہ جان لیا تھا اور قدردیش برہان درویش کے مصداق۔ مجھے جو کالوں میں جس حالت میں بھی تھا، مجھے مجبوراً قبول کر لیا تھا۔

یہاں کچھ فرشی خدا بھی تھے۔ جن کے تقدس اور پوجا پاٹ کے لئے کوئی عمارت لہتادہ نہ کی گئی تھی۔ یہ ڈیرنڈہ اینٹ کے الگ مندر تھے۔ مختصر چار دیواری کے اندر ایک ہموار پتھر۔ جو خدا تھا۔ اور اُس پر اُبلے ہوئے چاول، زعفران اور گھی۔ جو بھینٹ کئے گئے تھے۔ اور اُن پر کھیاں عیش کرتی تھیں۔

”یہ کیسے ناعاقبت اندیش لوگ ہیں تارڑ صاحب۔ یا شاید بھولے بادشاہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ خوراک دیوتاؤں تک پہنچ رہی ہے۔ اور اس پر کھیاں بھنھناتی ہیں۔“

ہمیشہ نے ایک ایمان افروز اعتراض کیا۔

”ہمیشہ طاہرہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور اس کہنے پر ہمیشہ مطعون کیا جاتا ہوں کہ برصغیر کے مسلمان کو اُس کے ہندو صنم بہت ستاتے ہیں۔ جماعت کی آستینوں میں واقعی ایسے بت ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن وہ اُن سے چھکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ ہم جو نذر نیاز کرتے ہیں، دیکھیں چڑھاتے ہیں۔ داتا صاحب کے مزار پر پنے کے پلاؤ کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ وہ کیا ہے۔ فوئیدگی ہوتی ہے تو ہر جمعرات کو مردے تک پہنچانے کے لئے مسجد میں کھانا کیوں بھیجتے ہیں۔ ہر منگل کے روز لاہور کی سڑکوں پر صبح سویرے کالے بکسے کی جو سرپاں نظر آتی ہیں۔ باغ جناح میں ثرت مراد کی قربت میں جو پانچ سو برس پُرانا برگد کا درخت ہے اس کی کوکھ میں دیئے کیوں جلاتے ہیں اور اُس کی ٹہنیوں کے ساتھ اُمیدوں کے دھاگے کیوں باندھتے ہیں۔ گھوڑے شاہ کے مزار پر سونے چاندی اور

ٹان۔ بھتی چلی جا رہی ہیں۔ جیسے کسی کنویں میں مقیم کوئی بھگت نروان پا جانے کی خڑک گھنٹیاں بجانے لگے اور اُن کی آواز کنویں کی گولائی میں گردش کرتی ہوئی گونجتی ہوئی آ جائے۔ جیسے گھنٹیوں کا ایک معنی آرکسٹرا حرکت میں آ گیا ہو۔ یہ کیا ہے کہ اگر ایک اسی گھنٹی کو بجاتا ہے تو وہ دو چار بارن کرتی خاموش ہو جاتی ہے اور اگر میں نے اُسے لگایا ہے تو وادی کھنڈ میں اُس کی گونج تیرتی ہے اور اُس کا تسلسل ختم ہونے نہیں آتا۔

شاید اس کا کوئی جواز ہو۔

شاید وہ ماننے والے کے لئے ایک بار بھتی ہو۔ اور کسی ”کافر“ کے ہاتھ لگ سلسل احتجاج کرتی چلی جاتی ہو۔ ویسے گھنٹی کیا جانے کہ میں ماننے والا ہوں یا نہیں۔ ”سَر یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ گھنٹیاں بجاتے چلے جا رہے ہیں۔“

بابا ذرا نروس ہو گئے ”نیپالی لوگ مانند کر جائیں گے۔“

”سنہری بابا ایک تو یہاں آپ ٹیلی ویژن کے فرعون نہیں ہیں کہ مجھ پر اپنی مسلط کر سکیں اور دوسرا یہ کہ نیپالی لوگ تو تب مانند کریں گے اگر ہم ان گھنٹیوں کے سے خالی گذر جائیں۔ حجر اسود کو بوسہ دینے کا امکان ہو اور کوئی حاجی ایسا نہ کہ مشکوک ہو جائے گا۔“

”میرے ذہن میں آپ کا جو ایج تھا وہ تباہ و برباد ہو گیا ہے۔“

”میرے ذہن میں بھی۔“ ہمیشہ بھی شامل ہو گئیں۔

”ہاں تارڑ صاحب ذرا زیادہ ہی ادور ہو گئے ہیں“ خالدہ جو دستیاب ہو چکی اُس نے بھی سرگوشی کی ”ویسے کسی بچاری سے پوچھتے تو سہی کہ یہ گھنٹی کتنے مہیاں جائے گی۔“

”تارڑ جی۔“ فاروق نے ایک دوستانہ دھپ میرے کندھے پر رسید کی

پلیز ادور ہو جائیے۔“

فاروق صرف ایسا تھا جو میری اس جذباتی فراوانی اور لبریز رد عمل کو خوب تھا کہ وہ عمر کے اُس حصے میں تھا جسے میں پچیس برس پیشتر گزار چکا تھا۔

یہ ایک نہایت نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ ہم پانچوں زندگی میں

”بس ٹھیک ہے۔“ سنہری بابا مطمئن ہو گئے ”پوچھنے میں کیا حرج ہے“
لاہور میں امریکن ایکسپریس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے نیپال سے ملاقات کے لئے
اروں کا زاد راہ وصول کرتے ہوئے میرے برابر میں براجمان ایک شکل اور مزاج دونوں
سے اچھے کاروباری نے اپنے موبائل کو کان سے الگ کیا اور مجھ سے پوچھا ”تارڑ صاحب
نہاں جا رہے ہیں۔؟“

”نیپال۔“

”بیوی کے ساتھ جا رہے ہیں؟“

”نہیں۔“

”تو پھر نیپال کیوں جا رہے ہیں۔ سنگاپور یا بنکاک کیوں نہیں جاتے۔ نیپال تو ہمیشہ
بوی کے ساتھ جلیا جاتا ہے۔“

”کیوں؟“

”وہاں کوئی شاپنگ نہیں ہے۔ مجال ہے کوئی ایک چیز ایسی دکھائی دے جائے جسے
خریدنے کو توجہ چاہے۔“ وہ صاحب نہایت پُرسرت ہوئے ”میں جب بھی اپنی بیگم کو ہمراہ
لیا جاتا ہوں تو وہ شاپنگ کرتے کرتے میرا بھرکس نکال دیتی ہے چنانچہ کچھلی مرتبہ میں
بان بوجھ کر بے حد اصرار سے اُسے کھٹنڈو لے گیا۔ وہ پاگل ہو گئی گھوم گھوم کے اور
میرے زرمبادلہ میں ایک ڈالر کی بھی کمی نہ کر سکی۔۔۔ لیکن یہ خوشی عارضی تھی وہ مجھے
زبردستی سنگاپور لے گئی اور ایک ہی دن میں پورے سال کی کسر نکال دی۔ لیکن آپ نیپال
کیوں جا رہے ہیں؟“

”اس لئے کہ ٹکٹ آ گیا ہے۔“

اس دوران یونیٹکو کے ایک سینیٹار میں ثروت محی الدین سے ملاقات ہو گئی
”نیپال؟ ہاں وہاں تو خریدنے کو کچھ نہیں۔ البتہ وہاں کا پشینہ بہت کمال کا ہوتا ہے۔ ہالیوڈ
کی بلندیوں پر جو بھیرس پالی جاتی ہیں اُن کی اُون سے نبتے ہیں اور بہت گرم ہوتا ہے اور
ستا بھی۔“ ثروت کا میں اعتبار نہیں کرتا کیونکہ وہ نام کے علاوہ بھی اہل ثروت میں سے
ہے اور اُن کو پاکستانی روپوں کی بجائے ڈالروں میں سوچنے کی عادت ہوتی ہے۔ لیکن اب
یہاں ڈھلتی شام میں اور اُس کے دھوکے میں جتلا دھوکا دربار کے فل چوک کے نزدیک

مٹی کے گھوڑے کیوں نذر کرتے ہیں۔ اگر وہ سب کچھ پہنچتا ہے تو یہ اُبلے ہوئے
زعفران اور گھی بھی پہنچتا ہے۔“

”آپ پر تو کفر کا اثر ہو گیا ہے۔“

سارے میں کسی تیل کی مک تھی اور کئی کے دانوں کی گرم خوشبو تھی
پاتھ پر بیٹھی دیہاتی عورتیں ٹورسٹ لوگوں کے لئے آگ پر بھونتی تھیں۔

خالدہ پھر آگے پیچھے ہو چکی تھیں۔

چنانچہ ہم اُس کی تلاش میں سرگرم ہو گئے۔

وہ فل چوک میں سے نکلے ہوئے ایک بازار میں رگھوناتھ کی دوکان پر
ٹوشینے کی ایک شال اوڑھے ہوئے یہ اندازہ لگا رہی تھیں کہ یہ کتنی گرم ہے
صاحب آجائیں۔ زبردست شاپنگ ہے۔ اپنی بیگم یا بیٹی کے لئے کچھ تو خرید لیجئے۔
”سستی ہے؟“

”پتہ نہیں۔ اس نے پانچ ہزار نیپالی مانگے تھے اور میں نے ایک ہزار کی آڑ
ہے پتہ نہیں مانتا ہے یا نہیں۔“

ہم سب بڑبڑاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ہم سب اس آسانی سے گم ہو جا
والی حسینہ سے عاجز آ چکے تھے لیکن جب بھی ہم اپنے غصے کے اظہار کے طور پر اُن
خونخوار نظروں سے دیکھتے وہ اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر نہایت کومل سُروں میں کہتی تھی
دیکھیں تو سہی۔ نہایت زبردست شاپنگ ہے۔ تو ہم موم ہو جاتے تھے۔

یہاں بھی۔ رگھوناتھ کی مختصر دوکان میں ہم موم ہو گئے۔ اور اس موم کے
قطرے باقاعدہ اُن شالوں پر گرے جو نیپال کے ٹوشینے سے ہاتھ کی کھٹیوں پر بنی
تھیں۔ اور یہاں بھی سنہری بابا نے دوکان کے اندر داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا ”آئی سی
کتنا؟“

رگھوناتھ تو قدرے سراپد ہو گیا کہ شاید چھاپہ پڑ گیا ہے اور ہکلا کر بولا
”شال سر؟“

”کوئی سی شال۔“

رگھوناتھ نے کوئی سی ایک شال کی قیمت انڈین کرنسی میں بتائی۔

خالدہ اسی شیشینے کو انگلیوں میں سرکاتی گمشدہ کستی تھی ”بے حد نرم ہے تارڑم
آپ بھی خرید لیں“

ہم جب رگھوناتھ کی دوکان سے باہر آئے تو وہ سیٹھ رگھوناتھ ہو چکا تھا اور
کی تجوری میں ہمارے دس ہزار نیپالی ہمار دیتے تھے...

”تارڑ صاحب یونیسف کی جانب سے جو دعوت نامہ بلکہ حکم نامہ آیا تھا،
درج تھا کہ قیام کے دوران ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہمارے ذمے ہے لیکن ڈنر کا بند
آپ خود کریں گے۔ چنانچہ شام ہو رہی ہے۔ لوگ بھگوانوں کی پوجا کر رہے ہیں،
پوجا کر لیتے ہیں“

”تو پھر کسی پتھر کے خدا کے چرنوں میں پڑے ہوئے زعفرانی چاولوں اور گم
ہی یہ پوجا کر لیتے ہیں۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”توبہ کریں تارڑ صاحب غیر اللہ کے نام پر کی گئی قربانی کا گوشت بھی حرام
ہے یہ تو پھر دال چاول ہیں“ ہشیرہ فوراً میرے ایمان کے دفاع کے لئے کمر بستہ ہو گئی
”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اتنا بے وقوف ہوں کہ زمین پر پڑے کھیتلے
بھنبھناتے یہ چاول ڈنر کے طور پر نوش کر جاؤں گا؟“ میں نے بھٹا کر کہا۔

”آپ کا کچھ پتہ نہیں ویسے...“ وہ ابھی تک مجھے بہت مخدوش جانتی تھیں۔
رگھوناتھ کی دوکان سے باہر آ کر ہم ایک مرتبہ پھر دربار چوک کے بندر
بھول بھلیوں میں گھومنے لگے۔ پرکاش جو گانڈ کے رتبے پر اپنے آپ کو اپنی من
سے فائز کر چکا تھا مختلف مندروں اور صنم خانوں کے حال سنا رہا تھا۔

اور ہمیں مجھے خیال آیا کہ اردو شاعری میں بخت کدوں اور بخت پرستی اور
خانوں اور صنم چروں کی جو بھرمار ہے یہ شاعر اگر دھوکا دربار میں تشریف لا کر بہ نفس
ان صنم چروں اور نجان نیپال کو دیکھ لیں تو زندگی بھر کسی دل نریا چہرے کو صنم سے
نہ دیں اور اُسے بخت کتنے سے شدید پرہیز کریں۔

کسی ایک چوبلی محل کے دروازے پر ایستادہ ہنومان جی کی موجودگی میں اور ڈ
شام میں پرکاش میرے نزدیک آیا اور ایک خالدہ گمشدہ ٹاپ سرگوشی میں بولا ”سا
جگن ناتھ مندر ہے اسے دیکھے گا؟“

”نہیں دیکھے گا۔ میں نے زندگی بھر کے لئے آج کے دن میں کافی مندر اور

بجوان دیکھ لئے ہیں۔“
”لیکن جگن ناتھ کا مندر تو نہایت سچیش ہے۔ اسے دیکھ کر گوری لوگ بہت

ایکساٹ ہوتا ہے۔“

”کیوں ایکساٹ ہوتا ہے؟“

”دیکھے گا تو پتہ چلے گا۔“

شب کی تاریکی شام میں اُترتی تھی اور دھوکا دربار میں کھٹکتی گھنٹیوں کی آوازوں
کو ایک سیاہ ردھم سے آشنا کرتی تھی، میں پرکاش کے پیچھے پیچھے جگن ناتھ مندر کی جانب
بلا اور چونکہ تاریکی بڑھتی جاتی تھی اس لئے کسی ٹائینا کی طرح احتیاط سے چلا کہ کہیں کسی
نرشی پتھر صنم کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ جگن ناتھ مندر ایک چوکور پلیٹ فارم پر ڈھونی
رہائے بیٹھا تھا۔

اُس کے چاروں اور ایک گیلری تھی اور اُس کے نیچے جو چھوٹے چھوٹے چوبلی
بٹمنے تھے انہیں غور سے دیکھتا ہوں تو اوسان خطا ہو جاتے ہیں بلکہ چودہ طبق روشن ہو
جاتے ہیں۔ ایک طبق روشن ہونے سے ہی سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے تو اکٹھے یک مشت
چودہ طبق روشن ہو جائیں تو رات کو دن کر دیتے ہیں اور اندھیرے میں گم شیخ کو اس
طرح چکاچوند کر دیتے ہیں کہ ان کی روشنی میں آپ ایک ٹیلی ویژن ڈرامہ آسانی سے
ٹوٹ کر سکتے ہیں۔ تو میں یہاں جگن ناتھ مندر کی چندھیادینے والی روشن شیخ پر جب میں
اپنی آنکھوں کے کیرے سے ایک مجسمے پر ڈوم ان کرتا ہوں تو اُس کی حرکات دیکھ کر پسینے
پھوٹ جاتے ہیں۔

جو کچھ ہوس خواہش کرتی ہے۔ جو کچھ آپ کر چکے ہوتے ہیں۔ اُس میں کہیں نہ
کیس ایک آج ایک آسن کی کسر رہ جاتی ہے۔ اور وہ ایک آج وہ ایک آسن ان مختصر
مجسموں میں نمایاں تھے۔

یہ ایک عجیب وقوعہ ہے۔ ایک حیرت انگیز اور نادر امر ہے کہ ہر پچیس پچاس
اور ہر صورت میں سو برس بعد اخلاقیات اور مذہب کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ لباس
متروک ہو جاتا ہے۔ رہنے سنے اور کھانے پینے کے انداز جدا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ

شاعری اور سخن کی تفسیر بدل جاتی ہے لیکن ہزاروں برسوں میں جو شے آج تک ہم وہ جنسی عمل ہے۔

وہ غاروں میں رہنے والے ہمارے بھائی بند یا ہمیں ہوں۔ باہل کے باہر فرعونوں کے بستر ہوں یا مغل منی ایچر تصاویر ہوں۔ جگن ناتھ ایسے مندر ہوں۔ وہی ڈھنگ اور وہی چلن ہوتا ہے جو آج کے مین ہٹن۔ شانزے لیزے یا لائبر روڈ یا موچی دروازے کے باسیوں کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کوئی نئی ترکیب کوئی نئی سائنس ایجاد نہیں ہوتی۔

انسان جب لباس کے بغیر خلوت میں اس عمل کے لئے ہوتا ہے تو وقت اور کی شناخت ممکن نہیں ہوتی۔

وہ انسان غاروں کا مکین بھی ہو سکتا ہے اور آج کے خلائی عہد کا بھی۔ اہم پہچان ممکن نہیں ہوتی۔

جگن ناتھ مندر کی چوٹی گیلری کے مجسموں میں کاماتورا کے وہی اندازہ ابھی تک نہیں بدلے۔ اور نہ بدلیں گے۔ بے شک ہم کلوننگ کے زمانوں تک آہیں۔

ہماری خواتین یعنی ہمیشہ اور خالدہ گشدہ ایک مختصر لنگی میں بندھی نیاپال ساتھ مصروف گفتگو تھیں۔ اور سنہری بابا اور فاروق اگرچہ یہاں مقدس لیکن گائیوں کی طرح ادھر ادھر گشت کر رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو فوری طور مشاورت کے لئے طلب کر لیا۔

”کیا ہے؟“

”کچھ ہے تو بلا رہا ہوں۔ چپکے سے چلے آؤ۔ خواتین کو خبر نہ ہو۔ وہ چلے آئے۔ اب جو انہوں نے جگن ناتھ مندر کے چوٹی مجسموں کو دونوں

بلکہ اب تو رات دہاڑے جو اختلاط دیکھا تو ان کے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اور تینوں کے مل ملا کے بیالیس طبق روشن ہو چکے تھے۔ البتہ ان کی باجھیں بھی کل تھیں ”بھئی تارڑ صاحب یہ تو سخت بے شرم لوگ ہیں۔ یعنی حیا کا کوئی کانسٹنٹ ہے۔ ذرا قریب ہو کر دیکھیں اور ان کی اخلاق باختہ اقدار پر مزید لعن طعن کریں۔“

”سلمان ہے“ وہ دونوں عبرت کے سلمان کا نزدیکی مطالعہ کرنے کے لئے مزید نزدیک ہوئے اور

ان کے چروں پر وہی شرمندگی اور سرخوشی تھی جو کسی نامحرم سینما ہال میں بیٹھے تماشائیوں کے چروں پر ”ٹوٹے“ دیکھتے ہوئے طلوع ہوتی ہے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری دونوں خواتین اُس لنگی پوش نیپالی حسینہ سے فارغ ہو کر ہماری جانب بلا۔ جگن ناتھ مندر کی جانب لپکتی چلی آتی ہیں۔

میں نے فوراً شدید سراسیمگی کے عالم میں ’مندر کے پلیٹ فارم سے اتر کر ان کی جانب اپنی بوڑھی کمر میں چمک پڑ جانے کا خطرہ منول لیتے ہوئے ایک سپرنٹ لگائی اور

انہیں راستے میں ہی جالیا۔ ”شاپ۔“ میں نے کسی نیو کلیئر پلانٹ کے باہر متعین ایک گارڈ کی طرح ان کا راستہ روک لیا۔

”ہم بھی تو دیکھیں کہ آپ لوگ اتنی دیر سے کیا دیکھ رہے ہیں۔ اور بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔“ ہمیشہ اپنی عینک سمیت ایک فاتح سپہ سالار کی طرح آگے بڑھتی چلی

جاری تھیں۔

”خبردار جو آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو۔ وہاں خواتین کے لئے کوئی ایسی شے نہیں ہے۔ جسے آپ دیکھ سکیں“

”ہم تو دیکھیں گے۔“ ہمیشہ نے یہ فقرہ اسی لے میں کہا جیسے اقبال بانو، فیض کا کلام الاپتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہم دیکھیں گے۔ اور وہ لپکی چلی جا رہی تھیں اور ان کے پیچھے خالدہ بھی اگرچہ لپکتی نہ تھی ذرا سستی سے چلتی تھی لیکن وہ دونوں خطرناک حد تک

جگن ناتھ مندر کی قربت میں پہنچ چکی تھیں۔

تب میں نے ایک منوبانہ اور لجاجت آمیز گرج کے ساتھ کہا ”ہمیشہ آپ نے اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو مجھ سے بڑا کوئی نہ ہو گا۔ اگر آپ نے وہ کچھ دیکھ لیا جو ہم

دیکھ رہے تھے تو آپ فی الفور میری ہمیشہ نہیں رہیں گی، کچھ اور ہو جائیں گی“

”لیکن کیوں؟“ وہ ذرا ٹھنک گئیں ”بھانگ لینے میں کیا حرج ہے؟“

”شدید حرج ہے۔ نہایت غیر اسلامی مجتہدے ہیں اور ایسے ہیں کہ مجھے خود بھی بڑی

کھڑکی اگرچہ بند ہو چکی تھی مگر ہم اُسے دیکھتے تھے۔
 اُس زندہ دیوی، لوگ گاڑیں، کماری کے شاہے جو ہمیں شک میں مبتلا کرتے
 تھے کھڑکی کے بند کواڑوں پر رات جو اُترتی تھی اُس کی سیاہی کے باوجود اُس کے شاہے
 کواڑوں پر نقش ہوتے تھے، دکھائی دیتے تھے۔
 ”کماری..“ پر کاش تو یہ نہ دیکھتا تھا کہ کھڑکی بند ہو چکی ہے اور سر جھکائے بیچ
 کے دانوں کی طرح ”کماری.. کماری“ کے دانے گراتا چلا جاتا تھا۔

شرم آ رہی ہے۔ آپ میرے کانوں کی لویں دیکھ رہی ہیں.. سُرخ ہو رہی ہیں۔
 ”آجائیں“
 خواتین چونکہ تجربہ کار تھیں اس لئے فی الفور باز آگئیں اور وہ بھی تڑپ
 سُرخ ہو گئیں.. مجھے دیکھ لیتیں تو پتہ نہیں کیا ہو جاتیں..
 میں نے سوچا ابھی بہت دن ہیں، کسی فارغ وقت میں ان خواتین سے چوری
 دوبارہ ادھر آئیں گے اور تفصیل سے ان بے حیا لوگوں کی بے حیائی سے لطف اندوز
 گے، ان کافروں کی کرتوتوں پر لعنت بھیجیں گے اور لاجول پڑھیں گے..

اور یہی وہ لمحہ تھا جس کا ذکر میں پہلے باب میں کر چکا ہوں۔ جب دھوکا دریا
 ڈھل چکی شام کے بعد اُترتی رات میں، پر کاش دی گاڈ کی بھڑکا دینے والی، تپک اور
 پیدا کرنے والی موجودگی سے میں عاجز آ گیا اور میں نے کہا ”تم اپنے آپ کو گم کیوں
 کر دیتے“ وہائی ڈونٹ یو گیٹ لاسٹ..“

”صاحب.. یہ ہمارا شر ہے۔ ہم اس میں گم نہیں ہو سکتا..“

”تو خدا کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑ دو..“

”کون سے خدا کے لئے.. دشمنو کے لئے۔ ہنومان جی کے لئے۔ شیوا کے لئے؟“

”یار کسی بھی مناسب خدا کے لئے..“

تب اُس نے کہا تھا کہ ”دیوی دیکھو گے؟“

”کس قسم کی دیوی..“

”لوگ گاڑیں.. زندہ دیوی..“

”ایک اور دیوی..“

کماری بھائی کے نیم تاریک مندر میں.. اُس نے صرف چند لمحے اپنے جھو
 میں براجمان ہو کر اپنے درشن دیئے.. لیکن ہم پر زمانے گذرے..

اور پھر ہمارے کفر اور الحاد سے مایوس ہو کر.. وہ ذرا پیچھے ہوئی، کھڑکی سے

اور کواڑ بند ہو گئے..

اور وہ ایسے لمحے تھے کہ ہم اُس کے پیاری بھی ہو سکتے تھے.. لیکن ہم اُس سے کہیں زیادہ خوش نصیب تھے کہ وہ ہماری ہمسائی مندر کی تنگ چھتوں والے ایک کمرے میں قید تھی اگرچہ پوتر اور پرستش کے قابل تھی.. لیکن قید تھی اور ہم اُس کی یا ترا کرنے والے آزاد تھے اور بیکری کینے کے کھلے صحن میں، چینی لائینوں اور خوراک کی خوشبو میں اور کمنڈو کی رات میں اُترنے والی بدن کو نیم سرد بوسے دینے والی رات میں، آزاد تھے.. اور اِس آزادی میں پرکاش کی ایک بس گھولنے والی زہر آلود اور لاطعلق آواز آئی ”گومی دی منی..“

”منی؟“ سنہری بابا چونکے کیونکہ پرکاش کے وہ گاڈ فادر تھے ”نیپالی یا آئی سی؟“

”آئی سی“

”بٹ آئی ڈو ناٹ سی.. تمہارے ساتھ چائے کا وعدہ کیا تھا، وہ پلا دیتے ہیں.. بلکہ چکن سینڈویچ بھی کھلا دیتے ہیں“

لیکن پرکاش طوطا ہو گیا.. ڈھیٹ ہو گیا ”نیپالی ٹورازم ڈیپارٹمنٹ نے گائڈز کے لئے ریٹ مقرر کیا ہے.. گومی دی منی..“

”لیکن پرکاش بھائی آپ تو اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ منتھی ہو گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ صرف چائے پلا دینا..“

”آپ لوگ اگرچہ سنتے نہیں تھے لیکن میں نے دھوکا دربار کی ہسٹری بتائی.. آپ کے ساتھ ساتھ چلا.. جگن ناتھ مندر دکھلایا.. کماری کو اگر میں نہ بلاتا تو وہ نہ آتی.. گومی دی منی..“

”یار اسے کچھ دے دلا کے رخصت کرو.. یہ بڑی بٹوٹھ قسم کی شے ہے“

ہم نے بہت ترس کھا کے اور ذرا جبر کر کے اُس غریب کے بال کو پورے سو روپے عنایت کر دیئے اور ہمارا خیال تھا کہ وہ اس زبردستی کے حصول کے بعد فوری طور پر نزدیک ترین خوشی خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر شکرانے کے نفل ادا کرے گا لیکن وہ نہایت ناشکرانہ نکلا اور مکر گیا ”دو سو روپے..“

”اوسے تو جاتا ہے کہ نہیں.. نامہ نیم کی اولاد..“ فاروق ذرا غصیلا ہو گیا اور اُس کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔

”بیکری کینے.. فارہوم دی بیل ٹولز“

”بیکری کینے“ یونہی دریافت ہو گیا..

ہم کوئی اور پوچھا کرتے نہ کرتے.. اپنے اندر کے بچوں پر سو سو پردے ڈال کر کی پرستش کو کفر جانتے لیکن پیٹ کے بٹ کی پوجا ہماری مجبوری تھی بے شک ہم کاٹے جاتے..

”بیکری کینے“ کا بورڈ دیکھ کر ہمیشہ جو ابھی تک سرخ تھیں کینے لگیں ”جھانک لینے میں کیا حرج ہے؟“

سنہری بابا نے فوراً کھانس کر کہا ”پوچھتے ہیں کہ آئی سی میں کتنے کاہے“ ”میرے شاپنگ بیکر اب اٹھائے نہیں جاتے.. تھوڑی دیر بیٹھ جاتے ہیں، صاحب..“ خالدہ سرگوشی.. اپنی سرگوشی میں تھیں۔

”اندر ناریاں وافر تعداد میں بیٹھی ہیں تارڑ صاحب..“ فاروق نے جھانک لیا اور اندر کی رونقیں دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

یہ ”بیکری کینے“ کماری کے مندر کے عین پہلو میں تھا.. یہ عین ممکن تھا کہ کماری بھی کبھی کبھار سب سے چھپ چھپا کے ہمیں برگر پیس کھانے کے لئے آتی ہو۔

لیکن ہم سب ابھی تک کماری کے طلسم میں تھے.. ہم اُس کے مندر سے تھے اور اس کینے میں آگے تھے..

آنے لگتا ہے جو کسی اور کو نظر نہیں آتا اور مجھے برابر کی میز پر دو چپٹی ناک والیاں رکھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے ”چائے تو پلا دو.. اور چکن سینڈویچ بھی“ اگرچہ وہ دوران بیکری کیفے کے ویٹرز اور دیگر مہمانوں کو بہ آواز بلند ہماری شقی قلبی اور ڈرز کے قہقہے سنا تا چلا جا رہا تھا..

وہ بمشکل رخصت ہوا تو ہم نے جانا کہ یہ عجیب جادوئی اور بت پرستی کے بارے میں ڈوبی ہوئی شب تھی..
فرچ فراتز- چکن سینڈویچز- پیزا- میکس اور برگرز اور آپ جو کے جو با تھے وہ ہماری آنکھوں کو جگمگاتے تھے..
عجیب جادوئی شام تھی..
جس میں انسان بے خود اور آزاد ہو جاتا ہے..

”آریو ٹورسٹ؟“

”ہی.. نو..“

”گڈ.. گڈ.. نو پرابلم..“ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکتی تھیں، لیکن جھکتی چلی جاتی تھیں.. اور اُن کے ”نو پرابلم“ سے اور جھکتے چلے جانے سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ”ٹی ہاؤس آف آگٹ مٹن“ کی جاپانی دو شیزا میں ہیں۔ جیمز مشنر کے ”سایونارا“ کی گیشا گرتز ہیں.. یا پھر میرے پسندیدہ جاپانی ناول نگار یوکیو شیمیا کے ناخوش کردار ہیں.. چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ادیب کے طور پر متعارف کروانے کے لئے ایک ادیب کا ہی سہارا لیا ”یو نو شیمیا.. رائٹ.. ناولسٹ؟“

”آ..“ اُنہوں نے زور زور سے جاپانی تحظیم کے مطابق ایک ہی ردھم میں سر ہلائے.. ”اشیما.. یوکیو ماشیما..“

”آئی..“ میں نے اپنے سینے پر ہتھیلی جمائی ”میں.. اُس کا بھائی ہوں.. ہر برادر..“
”آ..“ اُنہوں نے ایک مرتبہ سروں کو زور زور سے ہلانے کی ورزش کی.. اور پھر جھکتی چلی گئیں۔ اُن کے گھٹے تلے نہیں پڑا تھا کہ میں نے کیا کہا تھا.. عام جاپانیوں کی نسبت وہ قدرے دراز قد تھیں اور نیلی جینوں میں اُن کے بدن ورزشی اور متناسب تھے.. اور میں سانس اندر کھینچ کر اپنی بے ہنگم توند کو ظاہر ہونے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا تھا..

”آپ.. وہی.. کہاں جا رہی ہیں؟“

”آ.. آ.. ایورسٹ..“ اور ایورسٹ کے تقدس میں وہ اور زیادہ جھکیں.. اور اُن کے جھکنے سے مجھے کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا کیونکہ اُن کے بلاؤزز کے گلے کھٹے نہ تھے..

پرکاش نے سوکانوٹ اپنی جیب میں جمع کیا اور پھر فاروق کے تن و توش کو روکا رکھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے ”چائے تو پلا دو.. اور چکن سینڈویچ بھی“ اگرچہ وہ دوران بیکری کیفے کے ویٹرز اور دیگر مہمانوں کو بہ آواز بلند ہماری شقی قلبی اور ڈرز کے قہقہے سنا تا چلا جا رہا تھا..

وہ بمشکل رخصت ہوا تو ہم نے جانا کہ یہ عجیب جادوئی اور بت پرستی کے بارے میں ڈوبی ہوئی شب تھی..

فرچ فراتز- چکن سینڈویچز- پیزا- میکس اور برگرز اور آپ جو کے جو با تھے وہ ہماری آنکھوں کو جگمگاتے تھے..
عجیب جادوئی شام تھی..

جس میں انسان بے خود اور آزاد ہو جاتا ہے..

اور یہاں میں ہمشیرہ اور خالدہ گمشدہ کی فراخ دلی کا بہت متعترف ہوا.. ہم نے سے بھد ادب دریافت کیا کہ اس شام میں.. اس کو دھوکا باز اور کفر کی رات میں.. ہم اپنے آپ کے ساتھ کچھ دھوکا کر لیں.. کچھ کفر کی ریت کی پیروی کر لیں.. وہ کھائیں پیئیں جو یہ رات چاہتی ہے تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا.. اگر ہو گا تو ہم بھوکے پیاسے ہو جائیں گے آپ کے سامنے جسارت نہ کریں گے..
”پلیز گواہیڈ..“ ہمشیرہ نے کہا..

”پلیز انجائے یور سیلف تارڈ صاحب“ خالدہ گمشدہ نے اعتراض کیا نہ بہتان لگایا۔

”اگر تارڈ صاحب انجائے کرتے ہیں تو ہم اُن کے مرید ہیں“ سنہری بابائے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور نہایت مسرت سے لہریز ہوئے۔

”اور جو مرضی امام کی وہ ہماری..“ فاروق کی اگرچہ وہی مرضی تھی جو امام کی لیکن وہ امام کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتا تھا..

چنانچہ ہم نے اُس فریب آلود دھوکا باز شام میں.. دھوکا دربار کے ”بیکری“ کے صحن میں اُترتی ہوئی رات میں اپنے آپ کو گونا بے خودی سے خوب لہریز کیا..

اور جب انسان لہریز ہوتا ہے تو اُس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اُسے وہ چاہتا ہے

اور یہاں.. کھنڈر ہونے سے پہلے کیسے کیسے شہر تھے جو آباد تھے..
 کیسی کیسی بستیاں تھیں جن کے کوچے محبت اور خانہ بدوشی کے وہ لمحے تھے
 جن کے موزیک سے میری زندگی کی نامکمل تصویر ابھرتی تھی۔ جانے اس تصویر میں ایسے
 لمحوں کے مزید کتنے ٹکڑے فٹ ہونے تھے۔ وقت کی کتنی کترنیں ابھی باقی ہیں جن کے
 جرنے سے یہ تصویر بالآخر مکمل ہوگی اور لمحہ فنا سے راکھ کر دے گا.. اُس راکھ میں سے
 اگر میری صورت لالہ و گل میں نمایاں ہو بھی گئی تو کیا.. وہ میں تو نہ ہوں گا.. شاید اگلے
 لمحے.. جب میں ہوٹل سولتی کے کمرہ نمبر 550 کی کھڑکی بند کروں گا تو بستر تک بھی نہ پہنچ
 پاؤں گا.. عمر کی سوئی یک لخت تھم جائے گی اور اجل میری تصویر کو مکمل کر دے گی.. لیکن
 ابھی اُن گم گشتہ شہروں اور بستیوں کے کھنڈروں پر دھوکا دربار میں بجائی جانے والی گھنٹی کی
 گونج زور تک جاتی تھی... اور کچھ صنم تھے جو ٹوٹے تھے، اور کچھ بت تھے جن کے عشق
 میں میں جتلا نہیں ہو سکتا تھا.. لیکن ایک لونگ گاڈیس کا درشن سرشام تھا.. وہ کماری تھی یا
 شاہ گوری تھی..

گھنٹی کی صدا عمر کے کھنڈروں پر بھی گونجتی تھی..

اور یہ گھنٹی کس کی فنا کا اعلان کرتی تھی.. فارہوم دی نیل ٹولز..

وہ دونوں ایورسٹ کے دامن تک جا رہی تھیں اور اُن کا قیام اس دم
 بستی میں صرف ایک شب کا تھا۔

اور اُس لمحے یکدم مجھ میں جو تیس برس پیشتر کی شوخی اور لاپرواہی ڈر آئی
 وہ رخصت ہوئی اور میں ایک شہزادے کی بجائے ایک بوڑھا گداگر ہو گیا کہ میں
 بین الاقوامی کانفرنس کی بے معنویت میں کھٹنڈو میں قید تھا اور یہ دونوں وہاں جا رہی تھیں
 جہاں مجھے جانا چاہئے تھا.. لیکن میں نے ابھی کوچہ نہیں کھولی تھی.. میں انتظار کر رہا تھا
 میری سنو جیکٹ اور جاگرز بھی انتظار کر رہے تھے.. مجھے ابھی کھٹنڈو میں چند
 حق نمک ادا کرنا تھا.. اور پھر میں نے بھی اپنی ڈار کو چھوڑ کر پرواز کر جانا تھا.. اور
 بلندیوں کی جانب کشور ہندوستان کی برفوں کے دامن میں جدھرٹی ہاؤس آف آگسٹ
 کی یہ دو شیرازیں جا رہی تھیں..

”کیا میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں؟“ میں نے صرف اپنی محرومی کو ذور کر
 کے لئے اپنی اداسی سے پیچھا چھڑانے کے لئے یونہی اپنا رانچھا راضی کرنے کے لئے کہا
 وہ پھر جھکیں.. ”آ.. نوپراہلم.. شور شور.. ٹریکنگ ابجنسی.. وہ بندوبست کر
 گے.. ہمارے گروپ میں آٹھ لوگ.. آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں.. ہاں.. شورا!“
 اور میں کیسے شامل ہو سکتا تھا..

میں نے اُنہیں سایونارا کہا اور اپنی میز پر واپس آ گیا اور سب سے شکایت
 عینک سمیت شکایت کرتی ہوئی الزام لگاتی نظرس ہمیشہ کی تھیں ”تارڑ صاحب..“ انہوں
 نے صرف اتنا کہا۔

”نہ..“ میں نے شہادت کی انگلی بلند کر دی ”مجھے پلیز کوئی طعنہ نہ دیجئے گا..
 کے سب آوارہ گرد اور کوہ نور ایک ہی عمر کے ہوتے ہیں... عمر آشفٹہ سری کے..“

ہوٹل سولتی ہائیڈے ان کے کمرہ نمبر 550 کی کھڑکی میں سے نصف شب
 بعد کاجو منظر تھا اُس میں وادی کھٹنڈو پر ڈھند تھی اور اُس ڈھند پر تیرتی اُس گھنٹی کی آوا
 تھی جسے میں نے بجایا تھا اور اُس کی آواز نہ صرف اُس وادی پر مسلسل سن کر کرتی تھی بلکہ
 میری عمر کے کھنڈروں پر بھی گونجتی تھی..

کوشش میں ایک ”ہائے“ کر کے پھر سے سمٹ گئے ”میں دراصل سوانا ہاتھ لے کر آ رہا ہوں یعنی بھاپ کا غسل... رات جھنگ کروا دی تھی۔ آج سویرے اُس بھاپ کے غسل خانے میں داخل ہوا ہوں تو چند دو شیزاؤں نے دبوچ لیا...“

”کیسے دبوچا...“ فاروق فوراً دلچسپی لینے لگا۔

”وہ... خیر دبوچا تو نہیں.. بازو تھام کر ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا جو ایک تنور کی طرح دہکتا ہوا گرم تھا اور میں گندم کی روٹی کی طرح آہستہ آہستہ سرخ ہو کر پکنے لگا۔ پسینے پھوٹ گئے... میں نے کچھ خفیف سی دوہائی دی، ہلکا سا احتجاج بھی کیا لیکن اُس غسل خانے میں ٹوٹی کی آواز کون سنتا تھا.. پھر ایک اور کمرے میں دھکیل دیا گیا جس میں کچھ بھائی نہ دیتا تھا.. بھاپ ہی بھاپ تھی اور میرا دم گھٹنے لگا.. یس یوں سمجھ لیجئے کہ گرمی کی شدت سے چڑی اُدھر گئی اور... آخر میں ٹھنڈے ٹھار پانی سے نسلا کر فارغ کر دیا... ہائے...“ اُن کا چہرہ لال بھبھو کا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں رگیں سرخ ہو کر پھٹنے کو آئی تھیں..

”آپ کو تکلیف کیا تھی سوانا ہاتھ لینے کی؟“

”وہ دراصل..“ سنہری بابا ذرا جھل سے ہو کر بولے ”... وہ.. مفت میں تھا.. ہو ٹل کی جانب سے سپیشل گیسٹس کے لئے کمپلی میٹری.. میں نے سوچا، ہو جائے...“

میں چونکہ ایک مدت پہلے ناروے میں ایک اور جمل سوانا ہاتھ کے تجربے میں سے گذر چکا تھا.. اور وہاں بھاپ اور گرمی میں روسٹ ہونے کے بعد، اپنے آپ کو پتوں سے بھری شاخوں سے زد و کوب کرنے کے بعد ایک برفانی جھیل میں دھکیلا جا چکا تھا.. اس لئے میں اُن کی حالت زار کو خوب سمجھتا تھا..

”بدن کے کسی نازک حصے کو تو ضعیف نہیں پہنچا..“ فاروق نے منو تجھیں سنواریں..

”آہم..“ سنہری بابا نے بہت مانتا کیا اور موضوع فوراً بدل دیا ”ناشتے میں کیا ہے؟“

”بہت کچھ ہے.. فرائی انڈے بھی ہیں!“

”حلال مرغی کے ہیں؟“

”مرغی انڈے دینے کے بعد حلال یا حرام ہوتی ہے ضیاء صاحب..“

”نینا اور طوطے... کس کس کو بلاوا آیا تھا“

اگلی صبح ناشتے کی میز پر سب سے آخر میں سنہری بابا آئے اور گرتے پڑتے آپ کو بمشکل سنبھالنے ایک سستی شراب پینے والے اُن بابا کی طرح ڈولتے پھرتے کر سیوں کا سہارا لیتے ہوئے آئے اور ہمارے سامنے صوفے پر ڈھیر ہو گئے.. پیچھے لوگ گاڈیس کے ساتھ شب بسر کر کے آئے ہوں اور اب خلاص ہو چکے ہوں.. سب چہروں پر اُن کے لئے فکر مندی تھی کہ کہیں وہ تبدیلیء آب و ہوا کے باعث کھٹکتا موسم کا شکار نہ ہو گئے ہوں..

”ضیاء صاحب خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں ہاں—“ انہوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا جو پھرنے لگی۔

”بھئی آپ اتنے سرخ سرخ کیوں ہو رہے ہیں؟“ ہمیشہ کو تشویش لاتی

گئی۔

”آپ کو میرا تو نہیں ہو گیا ضیاء صاحب..“ خالدہ اتنی دھیمی آواز میں بولی صرف اُن کے سندھی کرتے میں جڑے شیشوں نے تو ٹٹا ہو ہم نہ سن سکے۔

”آج تو سیمینار کا آغاز ہو رہا ہے۔“ ملک صاحب کو اپنی آفیشل ڈیوٹی یاد آئی

”ضیاء صاحب اگر طبیعت مشغول ہے تو ہو ٹل میں ڈاکٹر کی سہولت میسر ہے

”کیا ہوا ضیاء صاحب؟“ میں نے بھی پوچھ لیا۔

”بھئی آپ لوگ چپ کریں تو میں بتاؤں—“ وہ ذرا اکر کر سیدھے

”بالکل... لیکن آئی سی میں کتنے کا ہے؟“

سوانا ہاتھ کی گری سردی ضیاء صاحب کی قوت دانش مندی پر اثر انداز تھی اور اُسے اثر انداز ہونے کے لئے کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا ہو گا۔

”یہ جتنے کا بھی ہے... نیپالی یا انڈین کرنسی میں.. ہمیں اس کے لئے ادائیگی کرنی ہوگی“

”پھر بھی پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔“

”اگر آپ لوگ مائنڈ نہ کریں تو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شروع ہونے سے صرف تین منٹ رہ گئے ہیں.. اپنے اپنے آخری دو چار انڈے کھائیں اور ہاتھ کریں..“ ملک صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے ”دوسرے ملکوں کے ڈیلی گیٹس سے فارغ ہو کر کانفرنس ہال میں پہنچ چکے ہیں.. ہمیں پورے وقت پر پہنچ کر ایک مثل کرنی چاہئے کہ ہم پاکستانی وقت کے کتنے پابند اور منظم ہیں..“

”چلیں جی مثال قائم کر آئیں..“ فاروق کے ساتھ سب لوگ اٹھ کر ہوئے۔

ہوٹل سولتی کے شاہانہ اونچی چھت والے.. نوادرات سے سجے کانفرنس ہال عین وقت پر داخل ہو کر ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم پاکستانی وقت کے کتنے پابند ہیں.. ہمارے اس کارنامے کو کسی نے بھی نہ سراہا کہ بقیہ ڈیلی گیٹس ہم سے بہت پہلے پہنچے تھے۔

سیچ کے پہلو میں کسی قدیم مندر سے حاصل کردہ ایک چراغ دان تھا جس اُوپر ایک مٹی کا دیا روشن کر کے کانفرنس کے افتتاح کا اعلان کر دیا گیا۔

نہایت مہمانت اور بردباری سے رسمی تقریریں کی گئیں جنہیں مندوبین بنو اسرائیل کی طرح کوہ طور سے نازل ہوتے آسمانی صحیفوں کی طرح نہایت خاموشی و عقیدت سے سنا اور جب کبھی کسی مقرر نے لکھی گئی تقریر سے نظرس اٹھا کر ان کی دیکھا تو انہوں نے فی الفور تالیاں بجا کر اُس کے خیالات عالیہ کی داد دی..

پھر کانفرنس میں شرکت کرنے والے مندوبین نے باری باری کھڑے ہو کر تعارف خود کروایا..

میں.. احمد مسعود ہوں.. افغانستان سے.. تالیاں..

میں.. شمس آرا حسن ہوں.. کینز فاطمہ.. زہرا اُم حسن.. نور النہار بیگم.. میرا مترا بیگم دلش سے.. تالیاں..

مائی نیم اُوز.. دیتی گلانی.. ریو گھوش.. تیندر پر کاش.. چترا.. فرام انڈیا.. آئی ایم زدپا جوشی.. مان بہادر.. بیٹا نسبت۔ ڈرگار گئی.. نیپال سے..

اور طاہرہ۔ خالدہ۔ ضیاء۔ فاروق۔ سلمان اور تارڑ.. پاکستان پاکستان.. تالیاں! اب یہ جو ہر مندوب کے کھڑے ہونے پر اپنا تعارف کروانے کے بعد دیگر مندوبین فلک شگاف تالیاں پٹیتے تھے تو صرف ادب ادب کے لئے پٹیتے تھے ورنہ کوئی نہیں سنتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے اور کہاں سے آیا ہے..

اگر کوئی مندوب.. چلنے میں ہی سہی.. اُٹھ کر یہ تعارف کر داتا کہ خواتین و نغزات میرا نام اُلو کا کان ہے اور میں مرغستان سے آیا ہوں.. یا مجھے شتر مرغ کہتے ہیں اور میرا تعلق شتر لینڈ سے ہے.. تب بھی تالیوں میں اتنی ہی گرم جوش ہوتی.. اور ان میں زدپا جوشی بھی شامل ہوتی..

اور یہ کانفرنس کا ہے کی تھی..

اگر میں حق نمک ادا نہ کروں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارے مالکوں نے.. ہم غریب اور دانش سے عاری ملکوں کے بچوں کے لئے اور خاص طور پر بچیوں کے لئے جنہیں نامعلوم وجوہات کی بنا پر ”گرل چائلڈ“ کا نام دیا گیا ہے، عقل و دانش سے معذور کرنے کے لئے ایک کارٹون کردار جسے ہم ”میٹا“ کہہ سکتے ہیں تخلیق کیا ہے... یہ ایک ایسا کردار تھا جس میں پاکستان۔ نیپال۔ ہندوستان۔ بیگم دلش۔ افغانستان اور سری لنکا کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں..

یہ کردار ہمارے پنجاب کے بقول ایک ”پاڑی بچی“ کا کردار تھا۔ ایک ایسی بچی جو اپنی عمر سے زیادہ عقلمند بننے کی کوشش کرتی ہے... بچی نہیں رہتی نابالغ، بالغ بن جاتی ہے اور لوگ اُس کی باتیں سن سن کر عاجز آ جاتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ وہ چپ ہو جائے... اور وہ چپ نہیں ہوتی.. ہمارے گورے مالکوں کا خیال تھا کہ وہ ہماری بچیوں کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس بچی کے بارے میں کہانیاں لکھنے کے لئے یورپ سے

س کی والدہ صاحبہ نے جدائی کے درد میں پکارا ہو.. لیکن یہ نیویارک سے.. تنظیم کے بڑے کارٹر سے خصوصی طور پر ہم ”نیوز“ کو روشنی دکھانے کے لئے آئی ہوئی میری این کی ادا تھی جس نے فوراً مجھے اور میری رائے کو ناپسند کیا ”نینا... ایک معجزہ ہے.. نینا ایک بے مثل کردار ہے.. جسے دنیا کے بہترین دماغوں نے لاکھوں ڈالرز کے خرچے کے بعد تخلیق کیا ہے.. نینا.. ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی بچیوں کی قسمت بدل دے گی..“

میری این کا بدن تو ڈائٹیسٹی اور بولڈ اینڈ بیوٹی فل ڈرامہ سیریز میں پریڈ کرنے والی بے روج.. سرد اور میکانکی جسموں والی.. صرف امریکیوں کے لئے.. شہوت انگیز سیناؤں کی طرح تھا.. لیکن اُس کا چہرہ.. بقول کے.. سپاٹ اور گرمی سے پھوٹ جانے والے دودھ کی پھٹیوں کی طرح تھا.. اور اُس پر کسی کاریگر ترکھان کا رندہ پھرا ہوا لگتا تھا کہ ناک نقشہ دھوکا دہار کے کسی فرشی دیوتا کی طرح حموار ہو چکا تھا.. ایک شہوت انگیز بلی فلم دیکھنے کے بعد بھی اُس کی جانب رجوع کرنے کے لئے کسی بہت بڑے انعام کا لالچ ضروری تھا..

وہ اپنی ایک ہتھیلی اٹھا کر یوں تقریر کرتی تھی جیسے سالوین آرمی کی کوئی رگروٹ چندہ مانگ رہی ہو.. وہ ایک ناقص کمپیوٹر کی طرح.. ایک خلائی مخلوق کی مانند.. نظروں کو چباتی، ایک دل آزار کانوں کو بیزار کر دینے والے تسلسل کے ساتھ ایک رپوٹ کے لہجے میں... بلا بلا.. بابا.. نینا.. بلا بلا.. کتنی چلی گئی۔ ہر فقرے کو وہ ایک بلند تان پر تم کرتی جیسے ایک کلاسیکی گویا سُر اٹھاتا ہے اور وہیں ٹھہر جاتا ہے لیکن اُس کی آواز میں تخی سوزش اور مسلسل مکالمیت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ انسان اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے کہ بی بی اللہ رسول کے واسطے چپ ہو جاوے.. اور اگر پھر بھی چپ نہ ہو تو سے ایک جھانپڑ رسید کر دے۔ جو ہم تو نہ کر سکتے تھے کہ وہ مالک تھے جنہوں نے ہمیں بننے خرچے پر بلایا تھا۔

وہ بولتی بولتی تھی اور ناک میں بولتی تھی اور ایک موہل آئل سے عاری انجن کی طرح بولتی تھی کہ.. ہم نے نیویارک میں فیصلہ کیا ہے.. ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی گرل چائلڈ پر اہلم کے لئے فیصلہ کیا ہے.. آپ کی قسمت بدلنے کا فیصلہ کیا ہے..

امریکہ سے درآمد شدہ گورا اور گوری لوگ آئے، ہمارے کلچر اور رہن سہن کا بھروسہ کیا اور پھر ہمیں بیچ پر کھڑا کر کے بتایا گیا کہ ہمارا کلچر کیا ہے اور رہن سہن کس طرح اور ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا ہے۔ کانفرنس کا آغاز تو ہو چکا تھا۔

میرا خیال تھا کہ انہوں نے ہمیں مشاورت کے لئے بلایا ہے.. ہم سے مشورہ کر کے اس کارٹون کردار میں مناسب تبدیلیاں کر کے ہمارے رواج اور موسموں کے قریب لے جانا ہے.. لیکن کھلا یہ کہ اُنہوں نے جو باتہاں کر لیا اور بقول ہمیشہ کے ”ٹارٹ صاحب آپ زیادہ سنجیدہ ہو کر شمولیت فرمائیں۔ ان لوگوں نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ کیا کرنا ہے.. ہمیں بلا ہماری رائے سُن کر انہوں نے صرف کارروائی ڈالنی ہوتی ہے کہ فلاں مشورہ کیا ہے اتفاق کیا ہے اور فلاں میڈیا ایکسپرٹ نے بھی وہی رائے دی ہے جو ہماری آپ زیادہ سنجیدہ نہ ہوں۔“

اور ہمیشہ وہی گرل گائڈ تو اس قسم کے سیمینارز کی جہاں دیدہ نہیں کانفرنس تھیں..

گویا ہم محض ایک ریوٹ تھے اور چونکہ مالکوں نے ایئر ٹکٹ میاکیا نیپال کے مہنگے ترین ہوٹل میں ٹھہرایا تھا جہاں سوانا ہاتھ کی سہولت مفت تھی اور ہمارا فرض صرف یہ تھا کہ لہجے دار تو سفینی تقریریں کریں اور ٹھنڈے لگا دیں۔

لیکن میں ابھی اس پیچیدہ اخلاقیات سے ناواقف تھا۔ اس لئے جب متناظر کرچن نے ایک سکول ماسٹر کی طرح اُنکی اٹھا کر مجھے بولنے کا حکم دیا تو میں نے کہا.. اگر آپ نے یہ کردار تخلیق کیا ہے اور کردار نینا کا ایک طوطا ہے جو انسانوں کو بولتا ہے تو یہ کوئی عجوبہ نہیں.. ہمارے مشرقی ادب میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں جانور انسانوں کی طرف گفتگو کرتے ہیں.. کلیلہ دمنہ ایک ہزار برس پہلے لکھی گئی منطق الطیر میں پرندے گفتگو کرتے ہیں.. اور کپلنگ کی ”جنگل بک“ تو ابھی کل ہے تو یہ کردار ”نینا“..

”نینا...“ کانفرنس ہال میں ایک ایسی صدا بلند ہوئی جیسے نینا گم ہو گئی ہو..

اور یہ کارٹون کردار نینا ایسا ہے کہ دنیا بھر کے ٹیلی ویژن نیٹ ورک خریدیں گے۔

”اسے کم از کم پاکستان میں تو کوئی نیٹ ورک نہیں خریدے گا۔“ میں نے ایک گھنٹے کی سمجھ بھائی و آزاری... اور بلا بلا... کے بعد تنگ آ کر کہا۔ میں اس کے بیزار ہو چکا تھا۔ کہ کانفرنس ہال کے باہر جو میرے تین دوست درخت تھے وہ بار بار بلاتے تھے کہ اندر کیا کر رہے ہو باہر ہمارے پاس آ جاؤ۔

میری این نے اپنے پھلے ہوئے رندہ چہرے کو ایک صدمے کے ساتھ جانب گھمایا اور ابرو چڑھا کر بولی ”وہائی ناٹ؟“

”اینڈ وہائی...“

میری این نے فوراً مجھے خدا کا حرف و حشیوں تک پہنچانے والے اُس مشہور طرح دیکھا جو دریائے ایمرن کے کنارے بسنے والے انڈینز اور افریقہ کے بقول ”ہارٹ آف ڈارک نیس“ کے باسیوں کو دیکھتا ہے کہ اے نادانو! اے نیم انسان! تمہیں تہذیب سے آگاہ کرنے اتنی دور سے آیا ہوں اور تم اعتراض کرتے ہو۔

میری این کے لئے میں ایک ایسا ہی نیٹو تھا جو نہیں جانتا تھا کہ اُس کی بھلا سامان کہاں ہے۔

یہ نیٹو اپنے حال میں مست تھا۔ اور میری این اپنی سپر ہیر تہذیب اور بیرونی صلیب تھامے اُس کے سر پر سوار تھی۔

اور یہ کیسا نیٹو تھا جو اپنے نیٹو ہونے پر شرمندہ نہ تھا۔

”وہائی ناٹ...“ میری این نے مہذب حد تک اپنی آواز کو بلند کر کے جانے سے روکا ”اس لئے کہ... نینا کردار کو ایک انٹرنیشنل گروپ آف ایکسپنس تخلیق کیا ہے... اور وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ ہے۔ نینا ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی گرل چائلڈ کی قسمت ہے۔“

اور میں ہندوستان کے ڈیلی گیشن کے ممبران کو قفل مار کس دیتا ہوں کہ انہیں نے کرپشن اور میری این کو اس طرح صدق دل سے سپورٹ کیا کہ میں اُن کی ڈیلنگ جیران رہ گیا ”نینا۔ جیسے آپ نے کہا“ ایک معجزہ ہے۔ کم از کم ہندوستان میں۔ اور ہم

سزا ریاستوں میں نینا کارٹون اور تصویریں انٹرویوڈیس کی ہیں اور وہاں کے لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے، وہ تو جانتے ہی نہیں تھے کہ گرل چائلڈ کو بھی تعلیم کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ گرل چائلڈ اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ ایک بوائے چائلڈ... اور پھر ایک باتیں کرتا طوطا... یہ ایک حیرت انگیز اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں ہی کہیں گے کہ کچھ بعید نہیں کہ نینا کردار کو ایک بھگوان کی شکل مل جائے اور اُس کی پرستش ہونے لگے۔ لوگ ابھی سے اُس کے پوسٹر کے سامنے سے ہاتھ جوڑ کر گذرتے ہیں۔“

میری این کے چہرے پر جو رندہ پھرا ہوا تھا اُس کے اثرات کم ہونے لگے اور اُس کے نین نقش اُبھرنے لگے اگرچہ اُن کے اُبھرنے سے بھی اُسے چنداں فائدہ نہ ہوا۔ وہ انڈین ڈیلی گیشن کی معروضات پر مرہبانہ انداز میں سر ہلاتی تھی اور بار بار میری جانب دیکھتی تھی کہ اے مرد ناہنجار سن! نینا ایک خدا ہونے کو ہے۔

کرپشن ایک پرائمری سکول ٹیچر کی طرح نہایت اُلفت بھری نظروں سے اس اُستانی کو نکلتا تھا۔

اور اُس کے تکلے میں جو راز پنہاں تھا وہ بہت بعد میں آشکار ہوا۔

یہ سینہ گزٹ کی خبر تھی کہ کرپشن جو اتنا اچھا کرپشن نہ تھا اُس نے کانفرنس کے نول میں اپنی ہندوستانی بیوی کو نہایت اہتمام کے ساتھ کلکتہ روانہ کر دیا تھا۔

صرف اس لئے کہ میری این اُس کے ساتھ قیام کر سکے اور یہ لفظ ”قیام“ مہارت ڈومعنی ہو سکتا ہے اور ہم نیٹو لوگ اس کی معافی میں کیا جائیں۔ بلکہ ذرا ہلکے پھلکے نڈاز میں یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ یہ میلہ لگایا ہی اس لئے گیا تھا کہ دونوں پریت لڑی میں چند نول کے لئے پروئے جائیں۔

لچ کی میز پر جب ہم جھنکا گوشت اور گردن مروڑ مرغ سے پرہیز کرتے ہوئے مہارت بساند دیتی وال اور سخت چاول نگلتے تھے تو ملک صاحب اپنے خوب رو چہرے کے ہاتھ شکایت کرتے تھے۔

”سر آپ جانتے ہیں کہ آپ ہمارے ڈیلی گیشن کے نہایت اہم ممبر ہیں اور سر آپ جانتے ہیں کہ میں نے لوکل چیف کرپشن سے آپ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا کہ

اور اُن کی تعداد سینکڑوں میں تھی وہ اُنہیں کیسے بھول جاتیں.. اور کیا ہم بھولتے اگر ہمارے فیض- منیر- قاسمی- مجید امجد- عبداللہ حسین- نثار عثمانی اور مجید نظامی کو یوں فائرنگ سکوڑ کے سامنے کھڑا کر کے قتل کر دیا جاتا.. میں اُنہیں ایک گھرے ڈکھ کے ساتھ دیکھتا تھا۔ یہ ایک الگ میز پر کیوں براجمان ہیں- آج میں اور وہ ایک ہی پلیٹ فارم پر کیوں نہیں.. آپ کے غلے میں جو گئے وہ سب کے سب آپ کی نسل بدلنے کے ارادے سے تو نہیں گئے تھے.. سبھی ”ٹائیگر“ تو نہیں تھے- اُن میں ٹیگور کے گیت گانے والے بھی تھے- نذرل کے شیدائی بھی تھے.. بلوچ ایسے سپاہی بھی تھے جنہوں نے ہتھیار اٹھا کر آپ کو ہلاک کرنے سے انکار کیا تھا اور کورٹ مارشل کے سزاوار ہوئے تھے.. ہم سب تو ایسے نہ تھے..

ہم سے بات تو کریں.. کیا اتنی برساتوں کے بعد بھی خون کے دھبے نہیں مٹے.. اُن کا رویہ نہ سرد تھا اور نہ اُس میں کوئی گرم جوشی تھی.. ایک لاتعلقی تھی جو زیادہ جان لیوا تھی.. خون کے دھبے ابھی تک نہیں مٹے تھے.. ابھی کچھ اور برساتوں کی ضرورت تھی-

ہندوستانی وفد میں میڈیا کے نمائندے تھے.. انفرمیشن منسٹری اور دیگر سرکاری اداروں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے.. اور نینا پروجیکٹ میں معاونت اور ملازمت کرنے والے ایسے خواتین و حضرات تھے جنہوں نے اپنی روزی روزگار کے لئے بہر طور ان گورے آقاؤں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا تھا۔ دپتی گل دتی... نہایت گوری چٹی‘ سرمہ زدہ آنکھوں میں حیرت بھرنے والی اور قد میں بڑی طرح مار کھاتی ہوئی ایک پلی پلائی ہینڈل تھی نہایت دوستانہ رویہ رکھتی تھی اور اُس کے آباؤ اجداد سرگودھا سے آئے تھے۔

”آپ دہلی میں رہتی ہیں تو اہل زبان آپ کے شین قاف پر اعتراض تو نہیں کرتے.. ہمارے ہاں تو کرتے ہیں..“

”وہ کیوں کرنے لگے.. وہ تو لکھنؤ یا احمد آباد وغیرہ میں رہتے ہیں.. ہمارا دہلی تو پنجابی شہ ہے..“

یہ ایک اور کچھل شک تھا کہ دہلی.. غالب کا دہلی.. اب ایک پنجابی شہ تھا.. مجھے ایک عرصہ بیت چکا جب میں دہلی میں تھا اور وہاں میں نے اپنے تئیں اپنی

آپ پاکستان کے لیری لنگ ہیں..“

”اور میں نے ہنس کر کہا تھا کہ نہیں لیری لنگ امریکہ کا.. تارڑ ہے“

”سرتاتا تکبر بھی اچھا نہیں ہوتا..“

”یہ تکبر نہیں تشخص ہے۔۔۔“

”لیکن سرتا آپ ذرا یہ بھی تو دیکھیں کہ انڈین ڈیلی گیشن کس طرح اُن میں ہاں ملا رہا ہے..“

”صرف اس لئے کہ سارا پروجیکٹ اُن کے ذمے تھا اور اُن کے کارپوراٹیشن نے.. جس کا میں بھی مداح ہوں اس پروجیکٹ سے لاکھوں ڈالر کمائے ہیں.. پانچ صے میں کیا آیا ہے..“

”پھر بھی سرتا.. ہم نے آپ کو میاں مدعو کیا ہے آپ پر رقم لگائی ہے تو.. آپ پر ذرا جبر کریں اتنا سچ نہ بولیں.. وہاں ٹیلی ویژن پر بھی تو آپ مفاہمت کرتے پاکستان کی عزت کا سوال ہے سرتا..“

چنانچہ ہم سب آئٹرنل سیشن میں طوطے ہو گئے.. جو وہ چاہتے تھے وہی بول گئے اور میری این نے ہم پر اُن کفار کی طرح پاکیزگی کی نظر ڈالی جو بالآخر رلا راسا آ جاتے ہیں..

البتہ لُج کے دوران میرا دل بہت ڈکھا..

میرے بدن میں دسمبر کے جو گھاؤ تھے اُن میں پھر سے ٹیسس اٹھنے لگیں..

دسمبر جدائی کا اور رسوائی کا مہینہ تھا اور میں اُسے نہ بھولتا تھا.. اور جب ڈاکو روم میں بنگلہ دہی وفد کی خواتین داخل ہوئیں تو مجھے وہ جدائی وہ رسوائی پھر سے یاد آئی..

لُج کے دوران وہ ہم پاکستانیوں سے ایک مناسب فاصلے پر رہیں.. وہ میرے وطن کی جس کی علیحدگی میں میرا کوئی دوش نہ تھا.. میری تو آرزو تھی کہ میں اُن کے شکوے کچھ اُنہیں کہتا، کچھ اُن کی سنتا.. اُن کی گلے گزار یوں کے سامنے شرمندگی سے سرفراز ہوں..

لیکن ایک اجتماعی جرم پر ایک فرد کی شرمندگی کوئی معافی نہیں رکھتی.. اُن کے پاس کچھ کو اتنا کچھ تھا کہ وہ کیا کیا بھولتیں.. ہتھیار ڈالنے سے ایک روز پیشتر فوج نے جنرل دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کو شب کی تاریکی میں گھروں سے نکال کر ہلاک کر دیا..

اردو نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی لیکن اُس کے گلی کوچوں میں نہ تو کوئی ایسی شکل نظر آئی جو تصویر نظر آتی اور نہ شین قاف کی درستگی کا کوئی موقع مل سکتا کسی کے ساتھ میں نے زبان اردو میں رکھ رکھاؤ اور اہتمام سے بات کی تو جواب پنجابی میں آیا..

کہا جاتا ہے کہ میرے جیسے کوئی صاحب دہلی میں کوئی کوچہ تلاش کر رہے ایک صاحب سے پوچھا ”کیوں صاحب.. کوچہ باقر علی کو یہی راستہ جاتا ہے“
جواب آیا ”آہو...“

اب اُن کے کچھ پلے نہ پڑا کہ یہ ”آہو“ کیا ہے اور کیا اس کا مطلب یہ ہے۔ یہ راستہ کوچہ باقر علی کو جاتا ہے.. یا راستہ کوچہ باقر علی کو نہیں جاتا.. ایک اور صاحب دریافت کیا تو انہوں نے بھی سر ہلا کر ایک گونج دار ”آہو—“ کہا.. جب تیسرے صاحب سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا ”جی ہاں قبلہ آپ درست سمت میں جا رہے ہیں۔ راستہ کوچہ باقر علی کو جاتا ہے“ تو یہ صاحب خوش ہو کر بولے ”ابھی حضرت آپ اور اراق مصور دہلی میں پہلے شخص ملے ہیں جو ماشا اللہ نہایت تہذیب یافتہ ہیں..“
اس پر اُن صاحب نے ایک پاٹ دار آواز میں کہا ”آہو...“

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک سندھی سٹی کراچی ایک اردو سٹی بن چکا۔ قلعہ معلیٰ کی زبان اردو کار کھولا دہلی اگر ایک پنجابی سٹی بن چکا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ وہاں سیندر پر کاش بھی تھا.. پتہ نہیں کس منسٹری میں کیا کرتا تھا لیکن انگریزی بولتا تھا تو اُسے ایک ایسے مترجم کی ضرورت پڑتی تھی جو اُس کی انگریزی انگریزی میں ترجمہ کر سکے.. لیکن بے دریغ اور بے تکان بولتا تھا.. ہمارے ہاں اپنے آپ آزار میں ڈال کر اگلی ضلع قبض کا خدشہ منول لے کر منہ بگاڑ کر درست لہجے میں انگریزی بولنے کا تردد کیا جاتا ہے.. لیکن ہندوستانیوں کو اس قسم کی کوئی پرالیم نہیں ہے.. سلسلے میں کسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہیں اور جو بیان کرنا چاہتے ہیں بے دریغ بیان دیتے ہیں..

رینو گھوش.. ایک ایسی خاتون جو گوروں کی رگ رگ کو جانتی تھی.. اور رگ حمیت کو فراموش کر کے اُن کی اسی رگ پر ہاتھ رکھتی تھی جو اُن کی دکھتی رہتی

ہوتی تھی.. رینو کے بال خضاب زدہ ہونے کے باوجود اُس کی خزاں رسیدگی کا مداوا نہیں کر سکتے تھے.. کھنڈرتاتے تھے کہ کبھی عمارت عظیم نہ سہی ایسی تو رہی ہوگی کہ اُسے رُک کر صرف ایک بل کے لئے دیکھا جاسکے.. لیکن اب ان کھنڈروں کے اندر جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا..

دپتی گل دتی سے میں نے سلاہ کے پتے چباتے ہوئے اور بساند آمیز دال چاول نگلتے ہوئے پوچھا ”آپ اس کانفرنس میں کیسے آئیں؟“

”مجھے تو پیشہ جی نا تھ جی نے بلا لیا..“ اُس نے اپنے ٹھکنے قد کے باوجود ذرا اٹھلا کر کہا۔ میں چونکہ ان نا تھ جی کی کرامات کا تذکرہ اُس ٹیکسی ڈرائیور سے سن چکا تھا اس لئے فوراً متوجہ ہو گیا ”کیسے بلا لیا؟“

”نیو دہلی میں میرے گھر کے سامنے.. ایک چوکور لان ہے.. پھولوں کی کھاریاں ہیں اور کچھ گھاس ہے۔ ایک سویر میں اٹھی کھڑکی کے پردے ہٹائے تو وہاں بہت ساری گائیں گھوم رہی تھیں اور گنوماتا کی بھی مجبوری ہے کہ وہ لید بھی کرتی ہے..“
”واقعی“ خالدہ سرگوشی نہایت سنجیدگی سے حیران ہو گئی..

”سننا ہے اُن کا پیشاب بھی مقدس ہے اور اُس کے پینے سے بندہ سیدھا شورگ میں جاتا ہے؟“ فاروق نے پوچھا..

”ہم سب کا سورگ الگ الگ ہے.. میں جانتی ہوں کہ ہمارے ہاں جو مسلمان ہیں وہ اپنے پیر کی ٹھوک کو چاٹ لیتے ہیں.. تو ہم سب کا سورگ الگ الگ ہے..“
فاروق چپٹ ہو گیا..

”اور نیچھے..“ دپتی نے اپنے گورے پٹے سینے پر ہتھیلی رکھ کر کہا ”نیچھے آپ سورگ بھی دو تو بھی میں گنوماتا کے پیشاب کو پینا تو کیا سوکھوں بھی نہیں.. یہ کون آپ کو ہندوؤں کے بارے میں اس قسم کی باتیں بتاتا ہے؟“

”ہم خود ہندوؤں کے بارے میں اپنے آپ کو اس قسم کی باتیں بتاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہماری بقا اسی میں ہے..“

”تو میرے گھر کے سامنے جو لان تھا اُس میں گنوماتا لید کرتی پھرتی تھیں تو مجھے سخت بُرا لگا.. بہت گھن آئی کہ یہ میاں گندگی پھیلاتی ہیں... اور میں نے کھڑکی بند کر دی..“

مہماندہ کو جنگل سے بلاوا آتا ہے کہ اپنا راج پانچ ترک کر اور ادھر آ جا۔
موسیٰ کو کوہ طور بلاتا ہے۔

رام کو سری لنکا سے پکارا جاتا ہے۔

گورونابک کو فرید بلاتا ہے کہ اٹھ فرید استیاضح نماز گزار۔

منصور علاج کو دار بلاتی ہے کہ آ۔ اپنے نعرہ انا الحق کے ساتھ آ اور
مفتیان دیر و حرم کے فتوؤں کی پاداش میں سولی پر سج جا اور جب تیرے ہاتھ پاؤں قلم ہوں
اور تب اذان کی صدا بلند ہو تو اپنے خون سے اپنے چہرے کو وضو سے آشنا کر۔ اور نماز
گزار۔

کسی کو حسین بلاتا ہے اور وہ لکڑی کے صندوقوں میں لیٹ کر کراچی کے ساحل
سے رواں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور کبھی کوئی سلطان باہو۔ اُس پکار پر دھیان رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ... اگر
رب نہانے دھونے اور وضو کرنے سے ملتا ہو تو وہ مینڈکوں اور مچھلیوں کو مل جائے۔ اگر
وہ ذات جنگل کیلے میں گم ہو جائے تو ڈھور ڈگر اور مویشیوں کو مل جائے۔
یہ نفل نماز زانے کام ہیں اور اونچی آواز میں وہی اذان دیتا ہے جس کی نیت کھوٹی ہو۔
ہو!

اور جب میرے ایک بزرگ اور پسندیدہ شاعر موہن سنگھ کو بلاوا آتا ہے تو وہ
”سارے پتر“ میں کہتا ہے کہ رب اک گورکھ دھندا۔ جس کی گتھیاں کھول کھول کے کافر
ہو جائے بندا۔ اور لائی لگ مومن کی نسبت۔ ایک طے شدہ راستے پر آنکھیں بند کر کے
چلنے والے مومن سے۔ کھوٹی کافر چنگا۔ وہ کافر بہتر ہے جو کھوج میں رہتا ہے۔

ٹھے شاہ نے بھی یہی پکار کی تھی۔ کی جانناں میں کون او بلہیا۔

شاند میں بھی وہی کافر تھا جو کھوج میں رہتا تھا۔

تو بلاوا کس کو آتا ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے۔

اس نازک اور گورکھ دھندے لمحے میں خالدہ سرگوشی نسوانی کمزوریوں کی کمک
لے کر پہنچ گئی ”ویسے دیتی۔ اور آپ کو دیکھ کر مجھے دیتی نول یاد آ جاتی ہے۔ یہ جو پنک
سوئز آپ نے پہن رکھا ہے اس کا رنگ آپ کے رنگ سے بہت سوٹ کرتا ہے۔ اور

اور اسی دوپہر مجھے فون آ گیا کہ آپ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شریک ہونے کے
چُن لیا گیا ہے تو مجھے سخت شرمندگی ہوئی۔“
”کیوں شرمندگی ہوئی؟“

”میں نے سوچا کہ جدھر سے بلاوا آیا ہے۔ کھٹنڈو شہر سے۔ وہیں تو پشوپال پتو
کا مندر ہے جس میں جانور گھومتے ہیں۔ بندر۔ سور۔ بھیڑ بکریاں اور گائیں بھینسیں
کرتی ہیں۔ یا تری اُن کے بھی چرن چھوتے ہیں اور وہاں اُس مندر کی پوترتا میں گائیں
کرتی ہیں پیشاب کرتی ہیں لیکن پشوپال مانڈ نہیں کرتے۔ اور میں اپنے گھر کے سامنے
لان ہے اُس میں لید کرنے والی گائیوں کو مانڈ کرتی ہوں۔ اور اس کے باوجود اُنہوں
مجھے کھٹنڈو بلا لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں ناں کہ ”پشو“ کا مطلب جانور ہوتا ہے۔ پشوپا
جانوروں کو پالنے والا۔“

”جی ہاں۔ میری ماسی صاحب جب ہم بچوں کے میلے کچیلے اور گندے مند
رہنے سے اور غلیظ جوڑوں میں نہانے سے عاجز آ جاتی تھیں تو کان دیوچ کر کہتی تھیں
”اوائے تم بندے ہو کہ پشو۔“ اور اُن زمانوں میں ہمارا خیال تھا کہ ”پشو“... کشمیری پشوپا
کی کوئی قسم ہے۔“

”تو بس اسی دوپہر کو بلاوا آ گیا۔“

”اچھا۔“ میں سبزی ترکاری اور دال چاول کو نکتے ایک کھیت میں منہ مارتے
کی طرح بیزار ہو چکا تھا ”آپ کو بھی بلاوا آتا ہے؟“

”کیوں ہمیں نہیں آ سکتا؟“

”پتہ نہیں۔ لیکن آپ تو ہندو لوگ ہیں۔ بلاوا تو ادھر سے۔ کتے مدینے سے آ
ہے۔“

”اچھا۔“ دیتی کی سرمہ زدہ آنکھیں اچھبے اور بے یقینی سے پھیلتی گئیں
ہمارا خیال تھا کہ بلاوا صرف پشوپال ناتھ جی کی جانب سے ہی آتا ہے۔ ”اُس کی جرت
سے بڑی تھی۔“

بلاوا دراصل کس کو آتا ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے۔

ہر پختہ ایمان والا شخص یہی کہتا ہے کہ بلاوا صرف مجھے آتا ہے۔

آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔۔۔

دپتی اپنے فریبہ اور مختصر قد کے ساتھ سرخوشی میں جتنا ہنس سکتی تھیں، ہنس اور میں نے فوری طور پر نوٹ کیا کہ اگر وہ کھڑی نہ ہوں اور دوپہر کے کھانے کی یہ یونہی براجمان رہیں تو اُس پر کوئی ٹڈل اتج بندہ با آسانی عاشق ہو سکتا تھا۔

”ریلی۔۔۔“ دپتی اتنی ”پیاری لگ رہی ہیں“ کے کومنٹ پر ذرا بلاش کر گئیں۔ قدرے سرخ ہو گئیں اور پھر اپنے پنک سویٹر پر ایسے ہاتھ پھیرنے لگیں جیسے ایک ریچو قدرے گورا چٹا ہو اور آنکھوں میں سُرمالگاتا ہو اپنی من پسند ریچمنٹی سے تفصیلی ملاطہ کے بعد اپنی کھال پر ہاتھ پھیرتا ہو۔۔۔

چنانچہ۔۔۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا آفٹرنون سیشن میں ہم سب طوطے ہو گئے لیکن ہم کوئی نا تجربہ کار طوطے تھوڑی تھے کہ یکدم چھوٹتے ہی اُن کی ہاں میں ہاں اور میں میں ملانے لگتے۔۔۔

ہم تادیر اپنی دانشمندی واضح کرنے کے لئے سر ہلاتے رہے۔ پھر کہیں جا کر نے اپنا پہلا ”ٹیس“ کیا۔

اور پھر ذرا توقف کے بعد دوسرا ”ٹیس“۔۔۔ اب ہمیں نینا کے کردار میں وہ خوب نظر آنے لگیں جو اُسے کسی صوفی بزرگ کے رُتبے کے آس پاس لے جاتی تھیں۔ ہمیں مرحومہ ڈیانا کی کوئی گمشدہ کزن نظر آنے لگی اور نیپالی نژاد فلم ایکٹرس مینشا کورالہ نزدیکی عزیزہ لگنے لگی۔ میری این نے ہمارے سارے گناہ معاف کر دیئے اور اپنے رگڑے ہوئے چہرے کی سختی پر ایک شاباشی مسکراہٹ پھیلا لی۔ ہمیں بھی اپنی غلطی کا احساس کہ ہم بھی کیسے ناشکرے لوگ ہیں کہ اپنے مہربانوں قدر دانوں پر تنقید کرتے ہیں جن وجہ سے ہم نے پچھلی شب ایک لونگ گاڈیس کو دیکھا تھا۔ دھوکا درباد کی دھوکا شام کا سٹرا کے آسنوں کی زیارت کی تھی۔۔۔ ہم کیسے ناشکرے تھے۔۔۔

اور اس کے باوجود میری نگاہ و نیش بلا سٹنڈر سے ناپینا کی گئی اُس کھڑکی کی طرف جاتی تھی جس کے پار وہ تین شگوفہ بردار میرے برادر درخت تھے جو صرف میرے دار تھے۔۔۔ باہر کیا کیا ہے اور میں کہاں بیٹھا ہوں اور صرف حق نمک ادا کرنے کے مجبوراً بیٹھا ہوں۔

”کے ٹوکبانی“ کے ایک ساتھی عامر نے اپنے صنعتی کلچر کی جگہ بندی سے آزاد ہونے کے لئے ایورسٹ کے بیس کیمپ تک ٹریک کرنے کا پروگرام بنایا ”ٹارڈ صاحب آپ چلیں گے؟“

”میں اگرچہ اُس کوہ نور سے ذرا سی بہتر جسمانی حالت میں ہوں جو نیم معذوری کی حالت میں بیساکھیاں ٹیکتا پورٹرز کے کندھوں اور باہوں کا سہارا لیتا کے ٹو بیس کیمپ تک جا پہنچا تھا۔ تو اب سوال ایورسٹ کا ہے تو ہم کتنی ہاٹ تک جائیں گے۔۔۔؟“

”تقریباً انیس ہزار فٹ تک۔۔۔“

میں نے فوراً حساب لگایا کہ میں آج تک زیادہ سے زیادہ کتنی بلندی پر پہنچ کر زندہ بچا ہوں۔ شاید بیسپر پاس، تقریباً سترہ ہزار فٹ اور وہاں میرا سانس خیمے کے پردے سے ٹکرا کر برف کی چھوڑ بنتا تھا اور میرے چہرے پر چھڑکاؤ کرتا تھا اور سانس کبھی آتا تھا اور کبھی نہیں آتا تھا اور کبھی شاید ٹھہر بھی جاتا تھا تو اس میں اگر ہزار دو ہزار فٹ مزید جمع کر لئے جائیں تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ تجربہ کار کوہ پیادوں نے خردار کیا تھا کہ اٹھارہ ہزار فٹ کے بعد ”ڈیٹھ زون“ شروع ہو جاتا ہے اور وہاں آپ کے پچھپھڑے کسی لمحے بغیر وارننگ کے بھک سے اُڑ سکتے ہیں اور اُن کی اُڑان کے ہمراہ جو شے پر پھڑپھڑاتی چلی جا رہی ہو گی وہ آپ کی رُوح ہو گی۔۔۔ چونکہ میں اپنی رُوح کو اچھی طرح جانتا تھا اور یہ جانتا تھا کہ میری رُوح ذرا سا رُوح پرور نظارہ بھی دیکھ لے تو میرے بدن کو چھوڑ کر مائل پرواز ہو جاتی ہے جیسا کہ اُس نے واڈی سوختر آباد میں کیا تھا اس لئے قابل فہم طور پر میں ذرا دل گرفتہ اور پریشان ہو گیا ”پتہ نہیں میں اتنی بلندی سہار سکتا ہوں کہ نہیں۔۔۔“

اور عامر نے مجھے جو جواب دیا میں اُس نیک سیرت نوجوان سے اُس کی امید نہ رکھتا تھا ”ٹارڈ صاحب محبوب چاہے کتنا ہی فریبہ کیوں نہ ہو اُس کا وزن سہارا جاتا ہے“

”لیکن یہ تو۔۔۔ میرا مطلب ہے بہت مزگا سودا ہو گا۔۔۔“

”آپ نے اپنے خرچے سے صرف کھٹنڈو پہنچنا ہے اور اُس کے بعد تمام انتظامات۔۔۔ ایک گھنٹے کی ایئر فلائٹ، وہاں سے آگے چار دن کا پیدل ٹریک۔۔۔ کھانا پینا۔ خیمے، پورٹراور گاڈ۔۔۔ یہ سب میرے برنس کو نیشن کے ذمے ہوں گے۔ آپ اپنے ہمراہ صرف ایک سیلینگ بیگ لے کر جائیں گے۔“

میں نے اُس شام اپنے سیلینگ بیگ کو رُک سیک میں سے نکالا اور اپنے سینے کے ساتھ لگا کر ایک سرد آہ بھری۔

اور عین آخری لمحوں میں کیا وقوعہ ہوا۔ عامر اپنے صنعتی کلچر کی کسی مٹم میکانزم میں پھنس کر بے بس ہو گیا "تارڑ صاحب مینوں معاف کر دو۔ میرا نکلتا ہوا گیا ہے۔۔۔ لیکن آپ چلے جائیں، کھنڈو میں بقیہ گروپ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔۔۔"

میں نے اپنے آپ کو کھنڈو سے پرے ایک غیر ملک اور غیر خود پاک اور خداؤں والی سرزمین میں مکمل اجنبیوں کے ہمراہ کوہ نوردی کی مشقت کے شب و روز بتلا دیکھا تو اس تصویر کے ساتھ مفاہمت نہ کر سکا۔ "نہیں عامر۔۔۔ تمہارے بغیر نہیں" میرے گمان میں یہ تو تھا کہ میں کبھی اتنے برسوں کے بن باس کے بعد کہیں لوٹوں گا۔ یورپ۔ ایشیا۔ کہیں نہ کہیں۔۔۔ لیکن کھنڈو تو میرے سان گمان میں تھا۔

مجھے بھی بلاوا آ گیا تھا۔

میں نے سوچا اس پشوپتی ناتھ جی کا پتہ کرنا چاہیے کہ کیا یہ اپنے ماننے والوں بلاوے بھیجتے ہیں یا دیگر ہم جیسے کفار کے لئے بھی ایک الگ سیکرٹ کھول رکھا ہے۔ ضمیر جعفری کا ایک مضمون ہے کہ۔۔۔ بام تک آئے مئے کلفام تک آئے نہیں میں بھی کھنڈو کی بام تک تو آ گیا تھا۔ لیکن ایورسٹ کے دامن کی مئے تک ابھی نہیں پہنچا تھا۔۔۔ اُس مئے کلفام تک پہنچنے کا سامان میرے کمرے میں ٹوٹ کے نیچے بے آرام ہو رہا تھا۔۔۔ سٹو جیکٹ اور جو گرز۔۔۔ اُن کا بس چلتا تو وہ خود چلے کیونکہ وہ اپنی حقیقت میں نہیں تھے ایک لاجینی آرام کی عافیت میں تھے۔

مئے کلفام کا بلاوا کب آئے گا؟

سے خوار منتظر تھے۔۔۔ اُن کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور وہ زاہدوں کی مجلس میں کردار بدلتے تھے۔۔۔ اور مئے کلفام کا بلاوا نہ آتا تھا۔

نقل کفر والی بات ہے کہ کفر نہ باشد۔۔۔ ایک لاہوری مائی صاحبہ اندرون کٹری میں سے زندگی میں پہلی بار باہر نکلیں کہ انہیں بھی بلاوا آ گیا تھا اور مسجد نبوی زار و قطار روتی ہوئی پائی گئیں۔ کسی نے اُن کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر پوچھا مائی

کیوں رو رہی ہیں؟ مائی کہنے لگیں، پتر میں لاہور سے آئی ہوں۔۔۔ اور آج داتا صاحب کا عرس ہے اور میں کہاں بیٹھی ہوں۔۔۔ تو میں بھی اُس جاہل مائی کی طرح تھا۔۔۔ اور اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کہ۔۔۔ میں کہاں بیٹھا ہوں۔۔۔ یہ پوچھ رہا تھا جب کہ چچن نے پرائمری سکول بچہ زوالی انگلی اٹھا کر اُسے میری طرف سیدھا کیا "مسٹر تار تمہارا کیا خیال ہے؟"

مسٹر تار نے اگرچہ پچھلے دو گھنٹے سے کانفرنس کی پرمغز تقریروں کا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا اور اپنے سامنے رکھی آئینشل نوٹ بک پر چڑیاں طوطے بناتے رہے تھے یا کھڑکی کے باہر اپنے دوست درختوں کی جدائی کے غم میں چشم نم رکھتے تھے، ایورسٹ کے بلاوے کا انتظار کرتے تھے۔۔۔ اور پشوپتی ناتھ جی کے چرنوں کو چھونے کے ٹھکانہ عمل کے بارے میں غور کرتے تھے، ذہ کیا بتاتے کہ اُن کا کیا خیال ہے۔۔۔ لیکن ایک مکار سیاست دان کی طرح اور وہ کونسا ایسا سیاستدان ہے کم از کم ہمارے ملک میں جو مکار نہیں ہوا سوائے بابا جناح کے۔۔۔ میں نے کھانس کر اور انگلی سے اپنی ابرو سنوار کر کہا۔۔۔ "اگر ہم معروضی حالات کے ہماؤ کا تنقیدی جائزہ لیں اور صدق دل سے کائنات میں جنم لینے والی آفاقی تبدیلیوں کو بروئے کار لا کر اُن بے پایاں مسائل کا تجزیہ کریں جو تیسری دنیا کے گرد غومت، جہالت اور بیماری کی صورت میں سیاہ بادلوں کی طرح منڈلا رہے ہیں اور اُن کی تہ تک پہنچنے کے لئے ایک سعی بے مثال کریں تو انسانی جذوبوں کی توقیر صرف اُس صورت میں ہو سکتی ہے جب ہم انسانیت کی مرتی ہوئی لاش پر۔۔۔ بلکہ لاش تو پہلے سے مر چکی ہوتی ہے ہم انسانیت کے بیمار بدن پر نوحہ کننا ہوں تو پھر ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کردار۔۔۔ آپ کا تخلیق کردہ نینا کردار ہی ہمہ گیر آفاقیت کا مظہر یہ کردار ہی اُمید کی آخری کن ہے۔۔۔ اور۔۔۔"

اور یہ سب کچھ میں نے بہ زبان انگریزی ادا کیا اور نہایت دقت سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ لفظ استعمال کئے جو شاید ملکہ و کٹوریا کے زمانے میں بھی متروک ہو چکے تھے۔۔۔ میری دانشوری اور علیقت کی دھاک مندوین کی جڑوں میں بیٹھ گئی اور ہر سو ایک عقیدت آمیز سناٹا چھا گیا۔۔۔ آپ کے نظریات اور عقائد کی تائید میں کوئی دوسرا شخص چاہے کتنی ہی بے سرو پا گفتگو کیوں نہ کر رہا ہو آپ اُسے آب حیات کی طرح حلق میں اُنٹلٹے جاتے ہیں اور سر ہلاتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ اور کہچن اور میری این اور دیگر ڈیلی

گیٹ سرہلاتے چلے گئے... طوطا اگر راہ راست پر آجائے تو کیا کمال طوطا ہوتا ہے۔
 صرف باہر جو تین درخت میرے دوست اور برادر تھے وہ جانتے تھے کہ
 لایچی گفتگو کر رہا ہوں، میں نے وینشن بلاسنڈز کی ٹائینائی میں پوشیدہ اُن تینوں کی
 دیکھا اور ایک بے ایمان لفتنگے کی طرح آنکھ ماری کہ بس مٹھی بند رکھو اور چپ رہ
 کسی کو نہ بتانا کہ میں لفظوں کی سیڑھیاں چڑھتا چلا جاتا ہوں اور اُن میں کوئی مبالغہ
 ہیں۔

”شراب خانے میں قمار خانے میرے بغیر نہ جانا...“

اور شاید اُن میں سے کسی ایک کا ایک شگوفہ فٹ پاتھ پر گرا... ایک گلابی
 کی طرح جو مجھ جیسے جعلی دانشوروں کی مفاہمت پسندی اور کسرشل ازم کے مظاہر
 ہمیشہ گرتا ہے اور ایسا شگوفہ تیزاب کی طرح گرتا ہے اور فٹ پاتھ میں چھید کر دیتا ہے۔
 لیکن میں قطعی طور پر مجرم نہیں محسوس کر رہا تھا کہ میں نے حق نمک ادا
 تھا۔

ہم اُس سینار کی دل آزار قید سے شام چھ بجے رہا ہوئے...
 ہوٹل کی لابی میں سے نکل کر باہر آئے اور وسیع پورج کے سامنے چڑے کی
 آرام دہ کرسیوں پر ڈھیر ہو کر ایک لمبا سانس لیا... اور اس گہرے ناآسودہ سانس میں
 کھنڈوں کی شام کی خنک ہوا ہمارے پیچھے پھٹروں میں دور تک گئی۔ اُنہیں کانفرنس ہال کی
 آلودہ ہوا سے خالی کیا اور خود قیام کیا...

ہم ہوٹل کے اندر سارا دن ایک مصنوعی آب و ہوا میں سانس لیتے رہے تھے۔
 اُس کی عادی ہو چکے تھے جیسے مزارع ظلم کا عادی ہو جاتا ہے، غریب بھوک کا عادی ہو جاتا
 ہے اور عیاش شخص بدن کا عادی ہو جاتا ہے... لیکن ظلم، بھوک اور بدن زندگی کے نارمل
 رویے تو نہیں ہوتے۔

جیسے نایاب پودوں کو گرین ہاؤس میں ایک مخصوص طے شدہ درجہ حرارت میں
 بالا جاتا ہے۔ وہ سب اُس مصنوعی موسم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی
 زندگی ہے...

گرین ہاؤس میں نشوونما پانے والے ان پودوں کو اگر اٹھا کر باہر کھلی فضاء میں
 لے آئیں تو وہ فوراً مر جھکا جاتے ہیں۔

لیکن ہم تو وہ پودے تھے جنہیں زبردستی گرین ہاؤس میں قید رکھا گیا تھا اور اب
 جب ہم باہر آئے تھے تو اپنے موسموں میں تھے اور ہمارے پتے سرسبز ہوتے تھے اور ہم

ہے۔ اُس کے گورو دوارے میں کوئی شرک نہیں۔ کوئی مجسمہ، کوئی تصویر نہیں۔ وہ صرف گرنتھ صاحب کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اُسے کوئی کامپلیکس نہیں۔ اگرچہ ان خدیوں کے باوجود مشرقی پنجاب میں اُس کی خوبروی اور مسلمانوں کے خون کی پسندیدگی اور لاکھوں لاشوں کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میرے آبائی گاؤں جو کالیاں کے گرد دوارے میں آس پاس کے گاؤں کے سینکڑوں سکھ اپنے بال بچوں کے ہمراہ اپنی جان بچانے کے لئے آئے تھے اور میرے گاؤں کے لوگوں نے انہیں مکمل تحفظ کی ضمانت دی تھی کہ وہ اگرچہ ایک مختلف مذہب کے پیروکار تھے لیکن اُن کا جاٹ قبیلہ ایک ہی تھا۔ وہ مسلمانوں کی شادیوں میں شریک ہوتے تو اُنہیں ”موکھا راشن“ دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی خوراک اپنی مرضی اور عقیدے کے مطابق خود تیار کر لیں۔ وہ ”نیوندرا“ بھی ڈالتے اور دہی رانی کو ڈولی میں بٹھاتے ہوئے آنسوؤں سے اپنی گھنی داڑھیاں بھی گیلی کر لیتے۔ وہ بھی جھکے، چٹھے، رندھاوے، گوندل، باجوے اور تارڑ تھے۔ مولوی نور دین ہر روز مسجد سے اعلان کرتے کہ گورو دوارے میں مقیم سکھ بال بچے ہمارے بال بچے ہیں، ہمارا خاندان ہیں اور ہم نے اپنے خاندان کا خیال رکھنا ہے لیکن مشرقی پنجاب میں سرداروں کی کرپانوں سے جنم لینے والا مسلمان خون بستے بستے دریائے چناب کے کنارے۔۔۔ جو کالیاں تک بھی پہنچا۔۔۔ جن کے پیارے کرپانوں کا شکار ہوئے تھے یا جن کی مائیں بہنیں برہنہ کی گئی تھیں۔ اپنے پاگل پن اور آنکھوں میں چڑتے خون کے ساتھ جو کالیاں آئے اور گورو دوارے کو آگ لگادی۔۔۔ مقامی کسانوں نے مزاحمت کی تو اُن کو بھی اُس آگ میں دھکیل دیا گیا۔

اُونچے رُتبے والیاں سکھ سرداریاں اُس کنویں میں ڈوب مریں جو گورو دوارے کے دروازے کے پاس ہے۔۔۔

ایک عرصے تک اہل جو کالیاں نے اُس گورو دوارے کے سوختہ درودیوار کا رخ کیا کہ وہ شرمندہ تھے۔۔۔ رات کی تاریکی میں لوگ کنویں میں اتر کر سکھ سرداریوں کے مانچوں میں سے سونے چاندی کے زیور تلاش کرتے۔۔۔

وہ گورو دوارہ اب بھی اُس نیم سوختہ حالت میں موجود ہے۔۔۔ وہ مہاجروں کے لئے ایک شادی گھر کا کام دیتا ہے۔۔۔ یہ مہاجر نہ جھکے ہیں نہ چٹھے ہیں اور نہ تارڑ ہیں۔ نہ ان کو خشک راشن دیتے ہیں اور نہ یہ ہمارے ساتھ شادی بیاہ کے موقع پر ”نیوندرا“

کھلتے تھے اور اپنے آپ پر لعن طعن کرتے تھے سارا دن گرین ہاؤس میں کیوں قید فرار کیوں نہیں ہو گئے۔۔۔ آج داتا صاحب کا عرس ہے اور تم کہاں بیٹھے تھے۔۔۔

کھنڈو کی شب داتا صاحب کا عرس تھا۔۔۔ یہ آج کی شب داتا کی نگری تھا۔۔۔ یہ یہاں کے بایسوں کے لئے پشوپتی ناتھ جی کی نگری تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔ ہمارے لئے یہ نگری۔۔۔ داتا کی نگری تھی۔۔۔ اس میں پلاؤ کی دیکھیں کھکتی تھیں اور عقیدت مند ہجوم گنج بخش کی میڑھیوں کو بھرتا تھا۔۔۔ تو ہم سب کے سب کانفرنس ہال کے گرین ہال کے پودے کھلنے لگے اور ناآسودہ سفری تمناؤں کی مہک دینے لگے۔۔۔

اور تب ہم نے۔۔۔ صنم خانوں کے اس اجنبی دیار کی ہوا میں گہرے سانس ہوئے، چمڑے کی کرسیوں پر اطمینان سے براجمان۔۔۔ کسی ایک سردار کو دیکھا۔۔۔

ہر سردار ایک پرٹو ٹائپ ہوتا ہے۔۔۔ وہ پگڑی باندھتا ہے۔۔۔ ہندوستان کا پرچہ رنگین اور کشتی نما اونچی پگڑی باندھتا ہے۔۔۔ افریقہ کا ہو تو سادہ اور سیدھی باندھتا ہے۔۔۔ اور اسے کسی قسم کا کوئی احساس کمتری نہیں ہوتا۔۔۔ نہ اپنا آپ چھپاتا۔۔۔ اپنے جذبات کو چھپاتا ہے۔ میرے والد صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ دنیا میں ہر نسل اور مذہب کے فقیر ہوتے ہیں لیکن۔۔۔ پٹھان اور سکھ فقیر آپ کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں گئے۔۔۔ کسی کے آگے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کم ہاتھ ایسے ہوتے ہیں جو کسی بٹھا سکھ کے ہوں گے۔۔۔ سردار دنیا کے کسی خطے میں ہو، کسان ہو اُچھل گوار ہو یا بٹھائی گون ہو پر سردار ہی رہتا ہے اور آپ جب کبھی نعرہ لگا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ مہ جی کی حال اے؟

تو سردار ذرا چونک جاتا ہے اور پھر مونچھوں پر تاؤ دے کر خوش ہو کر کہتا ”آپاں تے عیش کر رہے آں۔۔۔ ٹسی کتھوں آئے او؟“

سردار کبھی اپنے گراس رولس کو نہیں بھولتا۔۔۔

نکانہ صاحب میں۔۔۔ سکھوں کے کتے مدینے میں۔۔۔ گرد دوارہ جنم استخان۔۔۔ اُس مقام پر جہاں گورو نانک پیدا ہوئے تھے وہاں۔۔۔ جب ایک پشتون سردار میرے شلوکا۔۔۔ باندھتا تھا اور راگی بابا فرید کے اشلوک لاپتا تھا کہ ”اٹھ فریدا ستیا جانا گندارا۔۔۔ تو مجھے احساس ہوا کہ تمام مذاہب کی نسبت سردار سب سے زیادہ توحید پر

اور جب ملک آزاد ہوا اور بہت سوں نے اُسے پوچھا کہ رانی.... ادھر سے تو ہندو اور سکھ نقل مکانی کر رہے ہیں آپ لاہور چھوڑ کر کس بدایوں یا امر وہہ کو ہجرت کریں گی؟.... تو اُس نے ایک کلاسیکل لہجے میں شاید انگریزی میں کہا ہو گا اور ظاہر ہے سکاٹش لہجے میں کہا ہو گا کہ ”میں لاہور کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں، یہ میرے دادا رنجیت سنگھ کا دارالخلافہ ہے اور میں اس سلطنت کی واحد رانی ہوں....“

وہ رانی.... جیل روڈ پر گلبرگ کے مین ایونیو پر مڑنے سے پہلے ایک عیسائی قبرستان میں مدفون ہے۔ فارسی رباعیوں اور ”ہیئر لائر پرنس بمباں سدر لینڈ گرینڈ ڈائر آف مہاراجہ رنجیت سنگھ لائن آف پنجاب ڈائر آف مہاراجہ دلیپ سنگھ“ کے کتبے کے نیچے مدفون ہے۔ اور قبرستان کے باہر شیل کے پٹرول پمپ کے بھاگتے دوڑتے اٹینڈنٹ اور پچاروز، ہونڈا اور بی ایم ڈبلیوز میں سپر پٹرول ڈلوٹے ان لکٹری کاروں کے پڑتکبر الگ یہ نہیں جانتے کہ اس پٹرول پمپ کے پہلو میں.... دیوار کے پار پنجاب کی آخری جینون پرنس محو خواب ہے....

بمباں کے والد دلیپ سنگھ کے عیسائی ہونے کا کم از کم ایک فائدہ تو تاریخ کو ہوا.... وہ سکھ ہوتی تو جل کر راکھ ہو چکی ہوتی لیکن اب وہ دادا کی سلطنت کی خاک میں ہے اور اُس کی نشانی باقی ہے۔

چنانچہ آپ دنیا کے کسی تختے پر چلے جائیں اور کسی سردار سے پوچھیں کہ.... تو میں نے اُس سینار کی قید سے آزاد ہو کر چرمی کرسی پر بدن کو ریلیکس کرتے ہوئے اس خنک ہوا کو اپنے پیچھے پھروں میں بھرا جس کا داخلہ کانفرنس ہال میں ممنوع تھا اور میں نے ایک سردار جی سے پوچھا، سردار کی حال اے؟....

تو سردار جی نے فوراً کہا ”آپاں تے اتھے عیش کرن آئے آں۔۔۔“

”تے ہور کی کرن آئے او؟“

”تے ہور جو کھینڈن آئے آں....“

میرے لئے یہ اطلاع حیرت انگیز تھی کہ ہندوستان میں تمام تر لبرل ازم کے باوجود باقاعدہ جوا ممنوع ہے۔ وہاں کوئی جوا خانہ یا کیسینو نہیں ہے.... حالانکہ ہندومت میں جوئے کی ہرگز ممانعت نہیں ہے بلکہ دیوالی کے موقع پر اسے ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا

ڈالتے ہیں اور نہ ان کی داڑھیاں ڈولی کو وداع کرتے ہوئے آنسوؤں سے بھیجی جاتی ہیں کیونکہ مشرقی پنجاب میں اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا بیان بھی ممکن نہیں.... چنانچہ آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں ایک سردار کو پکارتے ہیں کہ سردار جی.... تو.... وہ....

تو ہوٹل سولتی کے باہر کھٹمنڈو کی نیم سرد شام میں جب میں نے ایک مہتمم آسودہ سردار جی کو دیکھا اور ان کے پہلو بہ پہلو ان کا خاندان نیپال گمری کی غریب نمایاں ہو رہا تھا تو میں نے پوچھا ”سردار جی کی ہو رہیا اے؟“ انہوں نے نہایت متانت سے.... جو سکھ حضرات میں تقریباً مفقود ہوتی ہے جواب دیا کہ آپاں تے عیش کر رہیاں.... تسی کتھوں آئے او؟ ”پاکستان۔۔۔“

یہ ایک ایسا جاوٹی لفظ تھا کہ بے شک سردار آزاد خالصتان کا شدید مخالف اندر اگانڈھی کے دربار صاحب آپریشن کا بے شک حمایتی ہو لیکن وہ لفظ ”پاکستان“ ہمیشہ ٹھٹکا ہے اور رُک جاتا ہے ”پر پاکستان دے کیٹرے شروں آئے او؟“ ”لاہور....“

اور لاہور.... اُن کی اور پنجابیوں کی واحد سلطنت کا صدر مقام تھا۔ وِن آئیڈ عدل پسند رنجیت سنگھ نے حکومت کی تھی.... اندرون شہر کی بیشتر حویلیاں آسکھ سرداروں کے ناموں سے پہچانی جاتی تھیں.... حویلی دھیان سنگھ، حویلی کربال لال حویلی....

جب رنجیت سنگھ کی پوتی بمباں سدر لینڈ جو سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئی تو ایک سکاٹش کرنل اُس کا خاوند تھا اور اُس کے باپ دلیپ سنگھ نے کم سنی میں انگریزوں کے سمجھانے پر اور خفیف سی ڈھکی چھپی دھمکی دینے پر کوہ نور ایسا ناکارہ اور بیکارہ ڈاکٹوریا کو تختے کے طور پر پیش کر دیا تھا تو ملکہ وکٹوریہ نے تمام تر برطانوی آداب کی کرتے ہوئے مجبوراً یہ حقیر تحفہ قبول کر لیا تھا۔ تو اسی دلیپ سنگھ کی بیٹی ایک مکمل بلکہ سکاٹش میم تھی، کیونکہ دلیپ سنگھ کو اُس کی عاقبت کا ڈراوا دے کر عیسائی تھا.... اُس نے اپنی عمر کا آخری حصہ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں بسر کرنے کی خواہش

ہے... چنانچہ ہر جواری ہر مالدار ہندوستانی جب داؤ لگانے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ کھٹنڈو کا رخ کرتا ہے... اس شہر میں سات عظیم الشان کیسینو ان کا انتظار کرتے تقریباً بیس برس پیشتر جب یہاں انسان کے اندر جو قسمت آزمائی اور اپنے آپ کو میں امیر کرنے کی خواہش ہوتی ہے اُس کے امکان یہاں تعمیر کئے گئے... کیسینو زور آئے تو سینکڑوں نیپالی دیوالیہ ہو گئے... دیوالی آنے سے پہلے ہی دیوالیہ ہو گئے، انہوں نے اپنی جمع پونجی ہاری تو گھر فروخت کر دیئے، اپنے آپ کو بیچ دیا اور کچھ نے اپنی بیویوں دیا تو نیپالی حکومت نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا، انہوں نے قمار خانے تو نہ بند کئے اُن میں نیپالیوں کا داخلہ بند کر دیا... صرف غیر ملکی آئیں اور جو کچھ لائیں یہیں جائیں، اس سے بہتر اور منافع بخش اور کونسا برنس ذیل ہو سکتا تھا...

تو اب اچھے موسموں میں... اور یہاں ہمارے لئے ایک اور سربراہی کھٹنڈو میں اچھے موسم صرف سرما اور ہمارے تھے... گرمیوں میں یہاں دل آزار ہوتی تھی اور ایئر کنڈیشنرز کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا...

تو اب اچھے موسموں میں... جوئے کے شوقین ہندوستانی اس ہمالیائی سلطنت صدر مقام پر غول در غول اُترتے تھے... اپنی بیویوں... دوست لڑکیوں اور ادا سمیت... اور اُن میں سے بیشتر کھٹنڈو پہنچ کر نہ ہماری طرح کسی دھوکا دربار میں دیتے ہیں، نہ کسی زندہ دیوی کے درشن کو جاتے ہیں اور نہ ایورسٹ کے دامن میں کے لئے آہیں بھرتے ہیں... وہ سالان ہوٹل کے کمرے میں رکھ کر براہ راست ترین قمار خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہ اُدھر ڈوبتے ہیں تو کسی اور کیسینو اُبھرتے ہیں۔ وہاں ہارتے ہیں تو ایک اور جوئے خانے میں جا پہنچتے ہیں... انگلستان ”پب کرائنگ“ نام کا ایک نہایت شریفانہ رواج ہوتا تھا... پندرہ بیس دوست اور دو لڑکیاں کسی ایک شب کاروں میں ٹھنسی کر اپنی کاؤنٹی کے مختلف قدیم شراب خانوں قدم رنجہ فرماتے تھے... حسب توفیق حلق سے آبِ جو یا ڈخترز کو اُتارتے تھے صرف ایک جرعہ اُتارتے تھے اور پھر کسی اور سے خانے کا رخ کر لیتے تھے... کم درجن بھر شراب خانوں میں حاضری مستحسن ٹھہرتی تھی اور اس کے بعد ہر نام چراغوں میں روشنی نہ رہتی تھی اور وہ خمار میں گم گھروں کو لوٹ جاتے تھے...

طور کھٹنڈو میں ہندوستانی جواری بھائی ”کیسینو کرائنگ“ کرتے ہیں... ادھر ڈوبے اُدھر نکلے اور پھر قمار میں گم ہوٹل کو لوٹتے تھے...

اب اس شام کھٹنڈو میں ہمیں کچھ تو کرنا تھا... خمار اپنی جگہ... لیکن قمار کی کشش نے مجھے کبھی بھی اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا سوائے اُن دنوں کے جب میں سکھ دیپ سنگھ راگی کے سامنے بیٹھ کر تاش کے تین پتوں کو اپنے ہاتھوں میں ایک کلی کی طرح کھلتے دیکھتا تھا اور پھر اُنہیں پھینک دیتا تھا... داؤ پر لگائی ہوئی رقم اتنی معمولی ہوتی تھی کہ ہم بعد میں جو کوئی بھی جیتتا تھا... اُس کے پلے سے ایک ایک اطالوی کافی پیتے تھے... لیکن اب اس شام کھٹنڈو میں ہمیں کچھ تو کرنا تھا...

اور یہاں رسم نیپال بھی تھی اور دستور بھی تھا کہ جوا کھیلا جائے... میں نے شہری بابا سے رجوع کیا ”کیوں جناب... کیا خیال ہے... ہو جائے؟“

”یارا ہمارا تو آئینٹل معاملہ ہے... ہم سرکاری طور پر اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے... البتہ آپ جہاں لے چلیں گے ہم مجبوراً چلے چلیں گے اور بعد میں اعتراض ہوا تو کہہ دیں گے کہ تارڑ صاحب زبردستی لے گئے تھے سو ہم چلے گئے... پلیز آپ ہمیں زبردستی لے چلیں...“

”کیوں فاروق؟“

”یہ جوا وغیرہ کھیلا ہمارے مذہب میں ممنوع ہے تارڑ صاحب...“ اُس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے لیکن مسکراتی آنکھوں کے ساتھ کہا اور اُس کی مسکراتی آنکھیں بھی یہی کہتی تھیں کہ پلیز ہمیں زبردستی لے چلیں...

”اگر حضرت شیخ ادنٹوں کی دوڑ پر رقم لگاتے ہیں تو یہ جائز ہے کہ اونٹ بہر طور ایک اسلامی جانور ہے... اور اگر پیر صاحب... گھوڑوں کی ریس پر داؤ لگاتے ہیں تو وہ بھی شرع کی حد میں ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق یہ ریس اس لئے جائز ہے کہ گھوڑوں کو جہاد کے لئے تیار کرنا ایک مجاہدانہ عمل ہے اور اگر کوئی ناعاقبت اندیش اُن پر رقم لگاتا ہے تو یہ اُس کا ذاتی فعل ہے جس کی پُرسش روزِ قیامت ہوگی... البتہ ایک تمہرے پر براہمن چند مزدور یا عجمہ اخلاقیات سے عاری شخص اگر جوئے میں ملوث ہوتے ہیں تو... یہ غیر شرعی حرکت ہے اور قطعی ممنوع ہے...“

ایک اور ”خبردار“ اُن کی جانب سے لڑھکتا ہوا آیا ”دیکھو لڑکوں....“
 ”یہ آپ کس کو کہہ رہی ہیں؟“ میں نے ”لڑکو“ کے خطاب پر فی الفور بھنگڑا
 ڈالنے سے صرف اس لئے اجتناب کیا کہ کہیں میری فریب کمر کی کوئی پُجول ڈھیلی نہ ہو جائے
 اور مجھے ”چپ“ نہ پڑ جائے....

”یہ میں آپ لوگوں کو.... مرد حضرات کو کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ نے کسی
 نہایت عمدہ شراب خانے میں جانا ہے یا کسی قمار خانے میں جانے کا قصد رکھتے ہیں تو....
 میرے بغیر.... آپ نے نہیں جانا....“

”آپ.... عصر کی نماز سے فارغ ہو چکیں؟“

”الحمد للہ....“ اُدھر سے جواب آیا ”اور تسبیح بھی کر چکی ہوں“

”اور اس کے باوجود شراب خانوں اور قمار خانوں میں جانے سے گریز نہیں
 کریں گی؟“

”الحمد للہ....“

اب انکار کی گنجائش کہاں تھی....

ہوٹل سولتی کی لابی میں.... اطالوی بار اور قد آدم شیشوں کی گذرگاہ کے
 درمیان.... ہم جب اپنے کمروں سے نیچے آئے تو ہمیشہ نمل رہی تھیں اور مسلسل ہندو
 مذاہن کی شان میں گستاخیاں کرتی چلی جا رہی تھیں اور تسبیح کے دانوں کو پھرولتی چلی جا
 رہی تھیں اور ان کے تسلسل میں کوئی فرق نہ آنے دیتی تھیں اور کیسینو میں جانے کے
 لئے بے تاب اور بے حال ہوتی تھیں....

اور خالدہ گشند.... اپنے آپ میں گم.... اُنہیں کہیں لے جانے کا سوال تو تب پیدا
 ہوا جب وہ اپنے آپ سے باہر آئیں تو.... وہ کہیں کسی مجسسے کی پتھر صورت کی آنکھیں
 میں.... کسی ٹھیسنے کی شال میں بٹی ہوتی تھیں اور اپنی سرگوشیوں میں ایک اور مدہم
 سرگوشی ہوتی تھیں....

”سرجی.... ہم کسی تھرے پر براہمان معمولی لوگ نہیں.... ایک بین الاقوامی
 کانفرنس کے مندوبین ہیں۔ ہمارے لئے تو اخلاقیات کے پیمانے الگ ہوں گے.... توہ
 سے نکل چلتے ہیں.... لیکن ہر دو خواتین کو چنداں خبر نہ ہو....“
 ”لیکن کیوں خبر نہ ہو؟“

”یہ کچھ معیوب سا لگتا ہے کہ سارا دن کانفرنس کی قید میں کاٹ کر اپنی
 بھری نیپالی شام میں ہم اُن سے کہیں.... کہ آپ ذرا ہمیں معاف کر دیں ہم جو اکبر
 رہے ہیں....“

”فاروق ڈیر.... ہم ہرگز جو اکیلے نہیں جا رہے، بلکہ جو دیکھنے جا رہے ہیں۔
 اس کے باوجود اچھا نہیں لگتا.... اگر ہم اُن سے پوچھ لیں تو کیا حرج۔
 یونہی دریافت کر لیں کہ آج کی شام کے لئے اُن کے ارادے کیا ہیں....“

”آپ دریافت کر لیں.... آپ بزرگ ہیں....“

میں نے اپنے کمرے سے ہمیشہ صاحبہ کو فون کیا ”آپ اس وقت بے حد
 چکی ہوں گی اور آرام کرنا چاہتی ہوں گی کہ دن بہت تھکا دینے والا تھا.... تو آپ
 کریں....“

”خبردار....“ اُن کی آواز ٹیلی فون پر بھی دہلا دینے والی تھی اور اتنی بلند نام
 میرے کمرے سے نکل کر واڈی کھٹمنڈو پر ”خبردار، خبردار“ کستی پھیل گئی.... ”آپ
 کہیں جا رہے ہیں؟“

”کہیں بھی نہیں۔“ میں نے فوراً دہل کر کہا ”اور اگر کہیں جا رہے ہیں تو
 وہاں جا کر کیا کریں گی؟“

”آپ جا کہاں رہے ہیں؟“

”بس وہ.... ہوٹل سولتی کے قمار خانے میں جا رہے ہیں.... یونہی وقت گزار
 کے لئے....“

”جو اکیلے کے لئے جا رہے ہیں....“ اُنہوں نے اتنے غصے سے کہا کہ مجھے
 ہو گیا کہ اس کے بعد ایک فتویٰ آئے گا۔

”قطعی نہیں.... ہم تو صرف جو دیکھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ

اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا اس کے باوجود کہ اُس کے پاس لپٹنے کے لئے اور پوشیدہ رکھنے کے لئے کچھ نہ تھا....

اور وہاں.... میٹھیوں کے اختتام پر.... فیوڈر دوستو و سکی میرا منتظر تھا...
اُس کے چہرے پر ”سفید راتیں“ تھیں برف ہوتی ہوئیں.... سائبیریا کی قید میں
منجمد ہوتی ہوئیں۔ ”جرم و سزا“ کے جرم تھے۔ ”ایڈیٹ“ کی اہمیت ختم تھی۔ ”بردز
کارموزف“ کے ایسے بھائی تھے جو پادری بھی تھے اور تشکیک کا شکار بھی تھے۔
لیکن دوستو و سکی یہاں نیپال کے اس کیسینو رائل کے دروازے پر ان کی وجہ
سے نہیں.... صرف اپنے ناولٹ ”جواری“ کی بنا پر موجود تھا۔

”جواری“ پڑھنے کے بعد جوئے کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ جیسے زاہد، عبادت کے
سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہیروئن کا عادی سفید سفوف کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ بلکہ
دم لگاتا ہے۔ ایسے مجبور گن دباؤ میں آیا ہوا شخص جو اکیلے پر بے بس ہو جاتا ہے اور دم
نہیں مار سکتا....

اور کیسینو رائل کے دروازے پر.... صرف دوستو و سکی ہی میرا منتظر نہ تھا... اس
کے پہلو میں بابا ٹالسٹائی بھی کھڑے تھے....

اور اُنہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے.... میں نے اُن سے بہت کچھ
سیکھا تھا.... وہ میرے راہنما اور مرشد تھے.... انہوں نے مجھے ناول نگاری کے رموز سے
آشنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات کہ میں ایک پھسڈی مرید کی طرح اُن سے
کچھ بھی سیکھ نہیں سکا تھا لیکن انہوں نے کوشش کی تھی۔

وہ اپنی سفید ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے تھے ”کیا تم بھی“ وار اینڈ پیس“
کے آخری حصے کو جس میں میں نے تاریخ کے جبر اور اس کی لامعیت پر بحث کی ہے۔
فضول اور بے مقصد قرار دیتے ہو؟“ ہر عظیم ناول میں ایک فضول حصہ ہوتا ہے تاکہ نقاد
اس پر تنقید کر کے خوش ہو سکیں اور اپنے وجود کا جواز پیش کر سکیں.... اگر وہ حصہ نہ ہو تو
نقاد کیا کریں گے؟ بھوکے مرجائیں گے....

کیسینو رائل کے داخلے پر نیپالی خوش آمدیدی خاتون کے برابر میں دوستو و سکی
اور ٹالسٹائی اس لئے میرے منتظر تھے کہ وہ تاریخ کے سب سے بڑے جواری تھے۔

”جس کو دیکھا قمار میں دیکھا... جواری کی کماری“

ہوٹل سولتی کے پہلو میں.... ہم نے پہلے یہ جانا کہ یہ نامکمل سی عمارت اور
حصہ نہیں ہے کوئی زیر تکمیل ہوٹل ہے.... لیکن وہ اسی عالی شان اور وسیع ریاست
ایک گوشہ تھا اور کیسینو رائل کہلاتا تھا....

ہم سب.... پنج بدن جب رات کے گیارہ بجے ایک ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے
قمار خانے کے صدر دروازے پر روشن نہایت بازاری قسم کی آرائش کی جانب بڑھے
تو سب کے سب ذرا تجل تھے.... جھجکتے تھے.... جیسے پہلی مرتبہ لاہور کی ”ہیرا منڈی“
رہے ہوں.... بیم برگ کی ”ریپا بہان“ میں شوکیسوں میں سچی برہنہ خواتین کو نظروں
ٹٹولنے کے لئے جا رہے ہوں.... ہم سب نہایت تجل تھے.... اور ظاہر ہے ”ہم سب“
مُراد صرف مرد حضرات تھے.... شاید خواتین میں بھی یہ خواہش جنم لیتی ہو کہ جیسے
مردوں کو یہ سہولت ہے کہ یہ اپنی من مرضی سے مطلوبہ سہولت خرید سکتے ہیں البتہ
بھی شوکیمنز میں سچے مردوں کو خرید سکیں....

وہاں ہمارے پاسپورٹ چیک کئے گئے.... صرف یہ جاننے کے لئے کہ ہم
مقامی نیپال تو نہیں ہیں جو اپنا تن من دھن اور بیوی بیچنے کے لئے آئے ہیں اور پھر
نہایت عزت و احترام سے قمار خانے میں اُترنے کی گزارش کی گئی۔

ہم نیچے اُترے.... قمار خانے کے شور اور موسیقی اور روشنیوں میں اپنے
میٹھیوں کے اختتام پر ایک نیپالی خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا.... اُس نے اپنے

رہتی....
 ”ہاں ہم میں بھی وہی پاگل پن جنم لے چکا ہے جس کے بارے یونانی کہتے تھے کہ
 اولہس کے خدا جب کسی قوم کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اُسے پاگل کر دیتے ہیں.... میں
 بھی اپنے راکھ ہوتے معاشرے میں اپنا چہرہ پونچھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سب کچھ ختم
 ہونے کو ہے زوال پذیر ہے.... لیکن کوئی بھی میری آواز پر کان نہیں دھرتا.... میں جان چکا
 ہوں کہ سب کچھ بکھر جانے کو ہے....“
 ”کب تک؟“

”تاریخ میں برسوں کا نہیں صدیوں کا حساب ہوتا ہے....“
 ”یہی تمہاری کم عقلی ہے.... سوویت یونین تو اپنے متعصب عقیدے کے ساتھ
 ایک صدی بھی زندہ نہیں رہ سکا.... بکھرنے سے چند برس پیشتر تک کسی کے گمان میں بھی
 نہ تھا....“

”لیکن آپ لوگ تو انقلاب سے پیشتر اپنی حیات مکمل کر کے چلے گئے.... آپ
 کیسے جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔“

”ادیب‘ ایک خاص سطح پر پیغمبر ہوتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ مستقبل میں کیا
 ہونے والا ہے.... کیا تم نہیں جانتے؟“
 ”تارڑ صاحب کیا ہو گیا ہے؟“ خالدہ سرگوشی نے چپکے سے کہا....
 ”ان پر اثر ہو گیا ہے“ فاروق ہنسا....

”بس ذرا کیسینو میں جھانکا ہے تو بت بن گئے ہیں.... ایک ہی مقام پر گڑے
 کھڑے ہیں....“
 ”اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جھانکنا نہیں چاہئے“ سُہری بابا نے اپنا قول
 دوہرایا....

وہ درست کہتے تھے.... مجھ پر اثر ہو گیا تھا....
 کیسینو رائل کے داخلے پر دوستو و سکی اور ٹالسٹائی میرے منتظر نہ تھے....
 جسے میں دوستو و سکی سمجھا تھا وہ روسی ریاستوں سے آیا ہوا ایک ادھیڑ عمر براؤن
 ڈرامی والا اور چہرے میں غرق شدہ آنکھوں والا شخص تھا۔ اور جو مجھے یو ٹالسٹائی نظر آیا تھا

دوستو و سکی نے اپنی ذات کے سب پر ت ناولٹ ”جواری“ میں کھول دیا
 اور ٹالسٹائی ایک جاگیر دار ہونے کے باوجود اپنے مزارعوں سے زیادہ قریب
 اپنی سٹیٹ ان کے حوالے کر دی اور مذہب اور اخلاقیات کی ایک نئی توجیہ پیش کر
 صوفی ہو گیا.... اگرچہ اس کے صوفی ہونے میں اس کی سخت گیر بیوی کا بھی ہاتھ تھا۔
 نے اپنے عقائد کی خاطر ایک بڑا بڑا کھیلایا۔ ناول ”وار اینڈ پیس“ میں جب ایک پرلر
 پوری جاگیر، مزارع اور عالی شان گھر جوئے کے میز پر ہار جاتا ہے تو صرف ایک غم
 کرتا ہے، کاش وقت چند لمحوں کے لئے پیچھے چلا جائے اور میں پھر سے اپنی ریاست
 عزت نفس کا مالک بن جاؤں اور اس جوئے کی میز سے اٹھ کھڑا ہوں.... یہ پرنس ایڈا
 نہیں تھا.... شاید ڈولو خوف تھا.... شاید کوئی اور.... مجھے اس کا نام یاد نہیں اس کا الہ
 ہے....

میں نے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ ایک بڑا ناول لکھنے کے لئے ایک پیغمبر
 کر ایک پراس پی چیوٹ تک کا تجربہ درکار ہے....
 یہ وہی لوگ تھے جن کے پاس تجربے کا یہ احاطہ.... یہ سلسلہ تھا۔
 دوستو و سکی کے پاس موت کا.... سفید راتوں کا اور.... جوئے اور جرم کا....
 ٹالسٹائی اپنی سفید ریش اور بوڑھے بدن کے ساتھ کسی نامعلوم ریلوے سٹ
 کے بیچ پر بیٹھا موت سے ہسکتا ہوا.... تہائی اور بے زنی کا شکار.... اگرچہ ایک گھنٹے
 میں کچی قبر میں دفن جس پر کبھی خزاں رسیدہ پتے گرتے ہیں اور کبھی شگوفے اُسے ڈ
 ہیں۔

یہ دونوں حضرات کیسینو رائل کے داخلے پر میرا راستہ روکے کھڑے تھے
 مجھے دریافت کرنا پڑا کہ کیوں؟

”اس لئے کہ ہم تو بے خبر تھے۔ اور روسی مزاج کی آشفٹ سری میں جتانے
 ہم تمہیں خبر کرنے آئے ہیں کہ تم تو مذہب اور تعصب کی آشفٹ سری ترک کر دو۔“
 ”وہی آشفٹ سری جو ایک عظیم مملکت کے ٹکڑے کر دیتی ہے؟“

”ہاں.... کوئی بھی ڈوگما ہو.... مذہبی عقیدہ ہو.... مارکس کا ہو یا کسی پیغمبر کا۔
 اس کے پیروکار تنگ نظر ہو کر خلق خدا پر غصہ حیات تنگ کر دیں تو وہ ریاست قائم

”اے جو گند رانا تھا... سو ہے رنگ اُتے سارے ٹھپے لادے... جت جائیں گے“

اور جو گند رانا تھا گنگنا کر کتا ”سو ہے دے چوڑے والیا میں کہنی آن... کر چھتری دی جھاں میں چھانویں ہنی آن...“ اور اپنی ساری متاع سرخ رنگ کے نمبروں پر لگا دیتا... ہار جاتا اور اٹھتے ہوئے کتا ”اے میں تیری ماں نوں...“

ایک اور ٹیل سے آواز آتی ”بھائی میں دو لکھ ہار گیا... ہن کی کرے؟“

”ہن کھنڈو توں چلے... ہور کی کرے“

”پر ہوئل دا کرایہ کون دے گا...“

”ادھی راتی چپ چھپتے نکل چلاں گے پر نام سگھا...“

”سر آپ داؤ پر کتا لگائیں گے؟“ نیپالی اہل کار کسی مخمور سکھ سے پوچھتا...

”اے اسی جند جان لا دیاں گے...“

بلکہ اس پنجابی ماحول کی وجہ سے میں سخت نروس تھا کہ ابھی چھاپہ پڑ جائے گا اور ہم سب نازیبا حرکات میں مشغولیت کے جرم میں دھرائے جائیں گے اور اگلی صبح اخباروں میں ہمیشہ صاحبہ اور خالدہ سرگوشی سمیت ہم ملزمان کی تصاویر فرنٹ پیج پر شائع ہوں گی... صرف اس لئے کہ پنجابی نمن کر میں فوراً لاہور پہنچ جاتا تھا... اور وہاں ایسا ہی ہوتا تھا... کھنڈو کے قمار خانوں میں پنجابی ہی کیوں زیادہ پہنچتے ہیں؟

ہندوستان میں اور بھی تو درجنوں قومیں ہیں جو ان کی نسبت زیادہ خوش حال اور دولت مند ہیں... وہ ادھر کیوں نہیں آتے...

شاید اس میں خطہ پنجاب اور اس کی تاریخ کا گہرا عمل دخل ہے... یہ کبھی قحط اور خشک سالی کا شکار نہیں ہوا... اس کے دریاؤں کے کناروں پر وید اس لئے لکھے گئے کہ یہاں زندگی کا ایک گہرا طمینان تھا... ہڑپہ اور موہنجودادو کے گودام گندم سے بھرے رہتے تھے... جنگل بیلوں میں مویشی سر جھکاتے تھے تو گھاس اُن کے نتھنوں میں داخل ہوتی تھی... مہینیس دودھ دیتی تھیں اور جس کے پاس دودھ کا کٹورا ہو اور گندم کی روٹی ہو اُسے دنیا میں اور کیا چاہئے... اسی لئے تاریخ میں پنجابی فاتحین کے نام کم کم ہوتے ہیں کہ اپنے ملک سے باہر وہی جاتا ہے جو بھوکا ہو اور غربت سے نڈھال ہو... جسے گھر بیٹھے سب

وہ دراصل ایک عمر رسیدہ سردار تھا جو اپنی لمبی سفید داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیرتا تھا... اور میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ قمار خانے کے استقبالیہ کلرک کے سامنے ہم نے اپنے آپ کو غیر ملکی ثابت کرنے کے لئے پاسپورٹ رکھے تو کلرک جو شاپا چوبیس گھنٹے سے ڈیوٹی پر تھا بھائی لے کر بولا ”یہ انڈین پاسپورٹ، سبز رنگ کے ہو گئے؟“

”یہ پاکستانی پاسپورٹ ہیں یو قوف...“ — — — ”ہمشیرہ صاحبہ نے ڈانٹ پلا دیا جھانک کے تو دیکھو ان کے اندر...“

”سوری...“

اور جب نیپالی خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ”نمتے“ تو ہمیشہ نے کھٹاک سے جواب میں ”وعلیکم السلام“ کہہ کر اُس کی مسکراہٹ منجمد تھی۔

اس نیپالی قمار خانے میں مخرب الاخلاق کی کوئی حد نہ تھی... چنانچہ جی خو گیا۔

کیسینو کے روشن رات کو سویر کرتے چکا چوند ہال میں قباحتوں کے تمام تر موجود تھے۔ رولیت کی بے شمار میزیں تھیں جن کے ارد گرد اتار ش تھا کہ جواری اپنے ٹھپے ہتھیایوں پر رکھے اور جیبوں میں ٹھونے منتظر تھے کہ کوئی ایک شخص جو ر کھیل رہا ہے وہ خلاص ہو تو وہ فوراً اس کی کرسی پر براجمان ہو جائیں... جیسے گینگ ہو رہا ہو اور وہ اپنی باری کے منتظر ہوں... سلاٹ مشینیں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں کھٹاکھٹ چل رہی تھیں اور جیک پاٹ کے آرزو مند ہاتھ ان کے پینڈلز کو سانس نہ دیتے تھے۔ کیسینو کے اہل کار اور اہل کاریاں... اور اہل کاریاں بھی ایسی کہ اُن کی اہلیت سے کون کا فرانکار کر سکتا تھا... سیاہ جیکٹیں اور بوٹائیوں میں ملبوس ہاتھوں میں کے پتے پھینتے آپ کی جانب نہایت اُلفت بھری نظروں سے دیکھتے تھے... کہ اُسے قسمت آزمائی کا شکار ہونا چاہے آئے... کراؤڈ میں اِکا دکا گورے گوریاں بھی تھے آئے ہیں نمک کے برابر... لیکن بقیہ حصہ سخت نمکین تھا اور انڈین تھا... ہاں اُن کے دوسرے نمبر تھی اور جو پہلی آئینشل زبان تھی وہ پنجابی تھی...

کچھ میسر ہو وہ کلبے کو پردیس کی راہ اختیار کرے اور اپنی جان جو کھوں میں ڈالے
اگر کوہستان نمک میں سے گزرتے ہوئے ٹکر کمار کے آس پاس ایک پتھر کی نشست
کر نظارہ کرتا ہے تو یہیں پر وہ کہتا تھا کہ عالم دوبارہ نیست.... اور پنجابیوں نے اسے
تیلے باندھ لیا.... کہ یہ جہان دوبارہ نہ ہو گا.... اوڑک جاناں مروے.... چل میلے نولہا
چنانچہ یہ کھٹنڈو کے میلے میں آئے ہوئے پنجابی تھے.... کہ عالم دوبارہ نیست!
گمشدہ میرے برابر میں کھڑی تھی اور نہ صرف گمشدہ تھی بلکہ پتھرائی ہوئی
تھی.... کیسینو کی رولٹ میزوں اور سلاٹ مشینوں اور تاش کے پتوں کی جادوگر
اسے پتھرا دیا تھا.... اُس کی آنکھوں میں ایک کیف تھا جیسے وہ کسی ”شاپنگ“ کو دیکھ
ہو۔

ہمشیرہ طاہرہ نے ہوٹل سے چلنے سے پیشتر لابی میں پہنچ کر یکدم دوہائی دی
”اوہو.... میں تو اپنی عینک بدلنا ہی بھول گئی ہوں.... یہ والی تو قطعی طور پر مناسب اور
ایبل نہیں ہے....“

”یہ والی جو آپ نے پہن رکھی ہے.... یہ کیوں مناسب نہیں ہے؟“
”یہ....“ وہ قہقہہ لگا کر اُسے اتار کر بولیں.... ذرا چند ہیسا سی گئیں اور
موجودگی کو جیسے ٹولتی ہوئیں بولیں ”یہ والی بین الاقوامی سیمینارز میں پہن کر جانا
ہے۔ اس میں زبردست انٹلکچوئل لگتی ہوں.... ابھی بدل کے آتی ہوں“

اور اب وہ اپنی فیشن ایبل عینک میں مکمل طور پر لمبوس تھیں اور نہایت
لگ رہی تھیں کاش کہ اُن کے میاں اُنہیں اس دل ربائی میں دیکھ لیتے۔
قمار خانے میں کہیں کسی ایک سپاٹ پر قیام پذیر ہونے سے پیشتر ادھر اُدھر
کر.... چم قلمی کر کے جائزہ لیا گیا کہ حالات حاضرہ کیا ہیں۔

اور ہم جا بجاڑکتے رہنے....

میں وہاں رکتا جہاں کوئی سردار نظر آتا....

فاروق وہاں ٹھکتا.... جہاں اُسے کوئی ایسی نیپالی ناری نظر آتی جو اپنے لودہ
میں ذرا جھک کر رولٹ ٹیبل پر ٹھپے جماتی.... اگرچہ نیپالی ناری چاہے کتنا بھی جھک
بقول اپنے جاپانی یوکیو شیمہ کے.... وہ سفید چاند نظر نہیں آتے جو بھرے بدن سے

دوتے ہیں۔ ہمشیرہ ذرا تمکنت میں ٹھہرتی اور خشونت بھری نظروں سے کسی خیالی شخص کو
نور میں اور کبھی کسی اور خیالی شخص کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگتیں۔
گمشدہ کی آنکھیں پتھر ہو چکی تھیں۔ وہ رولٹ کی میز پر مختلف رنگوں کے
انوں میں سجائے جانے والے ٹھپوں کو دیکھتی تھیں۔ اور اُس چھوٹے سے سرخ گیند
نے ساتھ گھومتی تھیں جو ایک اناڑی عاشق کی طرح یہ نہیں جانتا تھا کہ منزل مقصود کہاں
ہے.... کدھر رکتا اور کدھر داخل ہوتا ہے اور اٹکتا ہوا.... بے اختیار کسی ایک خانے میں
بوتا ہوا ساکت ہو جاتا تھا اور اُس کے ساتھ اُن تمام جواریوں کے دل ساکت ہو جاتے
نے جنہوں نے اپنی رقم کسی اور خانے پر لگائی ہوئی تھی۔

سُہری بابا متعدد ناریوں سے دریافت کر چکے تھے کہ.... یہ جوا کتنے آئی سی میں
لے گا کہ پونچھنے میں کیا خرچ تھا۔

اور ملک صاحب.... بار بار اپنے سفید ہوتے بال سنوارتے تھے اور اُن جواریوں
کی نکایت آمیز نظروں سے نکلتے تھے جو اپنے جواری بدن نیلی جینوں اور ڈھیلی ٹی شرٹوں
کا سنبھالتی تھیں اور وہ سنہلتے نہ تھے اور ذرا روٹھ جاتے تھے کہ اندھی ہو گئی ہو جو
تے ہینڈم شخص پر ایک نظر بھی نہیں ڈالتیں....

اور وہ صرف اُن ٹھپوں کی مالیت پر نظر ڈالتی تھیں جو جواریوں کے ہاتھوں میں
رخ اور سیاہ ٹگنوں کی طرح کھلتے اور ہمار دیتے تھے۔

اس دوران ایک بلند قامت اور ذرا توانا صحت کا نوجوان چمڑے کی سیاہ جیکٹ کی
ہل میں ہاتھ ڈالے.... جیسے اُس کے ہاتھ وہ پرندے ہوں جو جیکٹ کے گھونسلوں میں
اسے دینے کے لئے اُترے ہوں.... میرے آس پاس آیا ”مارٹ صاحب آپ یہاں کیا کر
ہے ہیں؟“

اب نیپال میں تیس جس شے کو سب سے زیادہ انجائے کر رہا تھا وہ مکمل گمنامی
روپوشی تھی.... میں یہاں اُن زمانوں میں تھا جب مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اور میں اپنی
ناکی موج میں تھراں کے کسی فٹ ہاتھ پر ٹک سیک سے ٹیک لگا کر سو جاتا تھا اور
ق ایران مجھے کوئی حشیش زدہ سیاہ فام پتی جان کر کچھ پرواہ نہ کرتی تھی اور گزرتی جاتی
لی۔ یا میں کابل کی ”چکن مارکیٹ“ میں کسی ایسی پتی سیاح خاتون کے ساتھ فلرٹ کر سکتا

حضرت مجھے شاعرِ جان کراتی منتیں کر رہے ہیں“ میں آتو سکتا ہوں.... لیکن کیوں؟....“ میں نے ان سے یہ سوال صرف اس لئے پوچھا کہ ان کا لہجہ قطعی طور پر ایسا نہ تھا کہ اُس پر پڑھے لکھے ہونے یا ادبی ہونے کا گمان ہو....

”سر.... پچھلی شب ہم پاکستانی دوست ایک شراب خانے میں بیٹھے تھے اور جب سب حضرات مخمور اور ٹن ہو گئے تو کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ ہم یہاں کیسے آئے؟“ تو سر اٹھ میں سے پانچ حضرات نے اقرار کیا کہ ہم تو اس مخبوط الحواس مصنف تارڑ کے سفر نامے پڑھ کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے.... تو ہم نے فیصلہ کیا کہ جو شخص ذمہ دار ہے.... اور ہم میں سے بیشتر ایل سیٹلڈ ہیں.... اور مارکس کی فراوانی ہے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ کو جرمنی میں بلایا جائے.... سر جی.... خرچہ ہمارا ہوگا.... پلیز....“ سر جی.... اپنی سستی اور کاہلی کے باعث جرمنی نہ جاسکے.... لیکن.... میں جان گیا کہ یہ سیاہ جیکٹ میں پوشیدہ پیرس میں قیام کرتا ہوا نوجوان ”پیار کا پہلا شہر“ میں گم ہو کر وہاں گیا تھا۔

میں نے اُس گم نوجوان سے ایک گزارش کی۔ اُس کی سیاہ چرمی جیکٹ پر ایک بزرگانہ تھکی دی ”برخوردار میری آپ سے ایک گزارش ہے یہاں اِس قمارخانہ کی خراب الاخلاقیات میں.... جو کچھ آپ کریں گے میں اس کے بارے میں چپ رہوں گا.... اور جو کچھ میں کروں گا آپ اس کے بارے میں چپ رہیں گے....“

”دیت اِز اے ذیل....“ اس نے ایک زوردار مصافحہ میرے ساتھ کیا ”لیکن آپ اگر نیپال کا سفر نامہ لکھیں گے تو میرا تذکرہ تو نہیں کریں گے....“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....“

”پلیز کر دیں....“ اُس نے ایک پُر جوش تقہمہ لگایا ”اور سر ایک ذاتی درخواست ہے میری جانب سے آپ جہاں جی چاہے کسی بھی نمبر پر یہ رقم لگا دیں....“

اور وہ رقم خاصی تھی جو وہ جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا رہا تھا اور نہایت احترام سے بڑھا رہا تھا.... اور یہ رقم رنگارنگ ٹھپوں کی صورت میں تھی۔

”لیکن کیوں؟.... میرا تو کوئی تجربہ نہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے پارسا بزرگ کے ہاتھوں کی کرامت سے میں جیت

تھا جو نوادرات کی کسی دوکان پر کسی ازبک دیستان کی سو برس پرانی ماند پڑتے ہوئے تلے سے مزین ایک چولی کو اپنے بدن کے بالائی حصے پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے۔ مجھے کہتی تھی ”یہ افغان خواتین.... دے آر بگ.... یہ تو مجھے پوری نہیں آتی....“

یا میں گولمٹھی چوک میں برسراجم گا جریں کھا سکتا تھا اور کوئی یہ نہیں کہ.... ہا ہائے تارڑ گا جریں کھا رہا ہے....

چنانچہ اِس ”تارڑ صاحب.... آپ کیا کر رہے ہیں؟“ نے میرا نقاب اُٹا کر ننگا کر دیا تھا۔

”میں یہاں اِس شہر کھٹنڈو میں ایک بین الاقوامی سینما میں ایک معزز ذمہ دار کی حیثیت سے آیا ہوں.... آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

”جی نہیں.... وہ ایک لاپرواہ اور مست سانوجوان تھا جو چمڑے کی سیاہ جیکٹ ایک محبوبہ کی طرح عزیز رکھتا تھا۔“ لیکن یہاں.... اس قمار خانے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ جوا کھیلنے آئے ہیں؟“

”قطعی نہیں.... ہم تو ذرا فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل ثروت دیکھنے آئے ہیں.... لیکن آپ کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟“

”میں تو جوا کھیلنے آیا ہوں.... اور آپ کو ایک ٹپ دینا چاہتا ہوں کہ سامنے ٹیبل پر نمبر ۱۹ جو سیاہ رنگ کا خانہ ہے وہ بار بار جیت رہا ہے....“

”درست.... لیکن آپ ہیں کون؟“

”میرا نام خاور ہے.... پیرس میں رہتا ہوں اور وہیں سے براہ راست پاکستان کے بغیر ادھر آ رہا ہوں.... پاکستانی ہوں.... آپ کے سفر نامے پڑھ کر برگشتہ ہوا تھا اور سے فرار ہو گیا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔“

ایک شب جب میں ٹینڈ میں جا چکا تھا ایک فون آیا ”سر میں جرمنی سے آ رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ سر میں آپ کو جرمنی میں مدعو کیا ہوں۔ کلٹ کا بندوبست ہو گا اور قیام کا مناسب بندوبست ہو گا.... پلیز سر.... کیا آپ

ہیں“

میں نے سمجھا کہ کوئی اردو کانفرنس ہے۔ یوم پاکستان ہے یا کوئی مشاعرہ ہے۔

جاؤں گا... کیونکہ آپ ہمیشہ لکتی رہے ہیں“

”ہاں میں لکتی تو رہا ہوں... مجھ پر بہت فضل ہوا... لیکن جو کچھ میں جیتنا وہ نہ جیت سکا...“

”وہ کیا ہے سِر؟“

”میں کوئی ایک شاہ گوری، کوئی ایک جھیل کرومبر جیتنا چاہتا تھا...“

”یقیناً... اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اُس رقم کا کیا کرے جو اُس کے میں تھی“ لیکن سِر...“ اُس نے مجھے بہت غور سے دیکھا ”آریو آل رائٹ سِر؟“

”ہاں... کیوں؟“

”آپ کے ہاتھ میں تو بیڑ کا گلاس بھی نہیں ہے تو... سر پہلے سے ہی نمودار

ہیں؟“

”ہاں... جب شاہ گوری اور جھیل کرومبر کی بات ہوتی ہے تو میں صدا

ہوں“

”یہ کون تھیں سِر؟“ اُس کے چہرے پر شدید تشویش بھی تھی اور خوف کہ یہ شخص تو بہکا ہوا لگتا ہے اور میں جان گیا کہ وہ ان چوٹیوں اور جھیلوں سے آگاہ اور سمجھتا ہے کہ مجھ پر نیپالی بیڑ کا اثر ہے جو اس قسم کے جنوں میں بات کرتا ہوں۔

”اُس کی برفوں پر جو نیل دھبے ہیں وہ میرے بوسوں کے ہیں اور اُس کے ہاتھ میں مجھے دیکھنے سے اضافہ ہوتا ہے اُن کا خیال ہے کہ میں جنگلی ہوں... سخت جنگلی... تھیں“

”بالکل ہوں گی... لیکن سِر میں نے تو ایک سادہ سی فرمائش کی تھی کہ آپ رقم رولیت کے کسی بھی رنگ پر لگا دیں...“

”اور ہار جائیں؟“

”بے شک ہار جائیں... میں کم از کم یہ تو کہہ سکوں گا کہ تارڑ صاحب میرے لئے رولیت کی میز پر رقم لگائی تھی اور میں ہار گیا...“

”آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیلنا چاہتے ہیں؟“

”یہ پہلی بار نہ ہوگا... ایک بار اور سہی“ اُس نے نہایت فلمی انداز میں کہا

بولے۔ میں نے نمبر ۱۹ کے سرخ خانے میں اُس کے ٹھپے ڈھیر کر دیئے... رولیت کا گیند حرکت میں آیا اور ہر خانے میں اٹکتا، ٹھہرتا... دلوں کی دھڑکنوں کو اٹکاتا اور ٹھہراتا...

بدام ساکت ہو گیا...“

”میں نے کہا تھا ناں آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیلنا چاہتے ہیں...“

”میرا خیال تھا کہ آپ لکتی ہیں۔“ اُس کے لہجے میں مایوسی تھی... اُس نے اب کی بار زیادہ گرم جوشی سے ہاتھ نہیں ملایا اور کندھے سکیڑتا کسی اور نیبل کی طرف چلا گیا۔

ہم سب، سرگوشی، ہمشیرہ، سُہری بابا، ملک اور فاروق بھیڑوں کے ایک گٹے کی

طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے۔

آگے ذرا نجوم زیادہ تھا اور اُس کے پار اُن کے کندھوں پر سے نگاہ کرتے ہم نے دیکھا کہ کیسینو کے اہلکاروں نے ایک نیبل کے گرد فیتے لگا رکھے ہیں... ایک حصار سا قائم کر رکھا ہے تاکہ کوئی اندر نہ آئے... کیونکہ اُس نیبل پر آج کی شب کا سب سے بڑا جواری داؤ لگا رہا تھا... اُس کے سامنے مختلف رنگوں کے ٹھپوں کے انبار اور مینار تھے جن میں کم سے کم مالیت کا ٹھپہ ایک ہزار نیپالی کا تھا اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے کا تھا... ایک محتاط اندازے کے مطابق اُس کے سامنے جو دولت ڈھیر تھی وہ پندرہ بیس لاکھ سے کم کیا ہوگی... وہ نظر رولیت کی اُس گیند پر رکھتا تھا جو ذولتی اکتی مکتی کسی بائیک رنگ کے خانے میں یکنخت تھم جاتی تھی اور بے دھیانی میں کبھی سلا کو منہ میں ڈالتا تھا اور کبھی بیڑ کا ایک گھونٹ بھرتا تھا لیکن اُس کی آنکھیں اس گیند کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں اور اُس کے ساتھ حرکت کرتی تھیں۔ وہ شکل صورت سے ایک موٹر مکینک لگتا تھا اور ایک در رنگ چمک شرت میں لبوس تھا، اُس کی آنکھیں اگرچہ کثرت سے نوشی کے باعث فون رنگ تھیں لیکن وہ اپنے شمار پر حاوی تھا اور درست فیصلے کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

وہ آج کی شب کا ہیرو تھا کیونکہ وہ تقریباً پندرہ لاکھ روپے جیت چکا تھا...

آج تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ جوئے کی جیت میں نشہ زیادہ ہوتا ہے یا سیاست کی جیت میں...“

ہم مزید چہل قدمی کرتے کرتے جب مزید نڈھال ہو گئے تو خالد اُٹھ رہا تھا جو ابھی تک کیسینو کے ماحول میں پتھر تھیں سرگوشی میں کہنے لگی ”تارڑ صاحب آپ جو اتو نہیں پھیلے گے؟“

”مجھے بہت ساری قباحتیں فیزی نیٹ کرتی ہیں لیکن جو انہیں کرتا...“

”آپ نے تو مجھے مایوس کر دیا“ گمشدہ نے اتنی ڈکھ بھری مایوسی سے کہا کہ میرا بی چاہا کہ میں اپنے چند سو ڈالر اور ٹریولنگ چیکس فوری طور پر داؤ پر لا کر اُسے اس مایوسی سے بچا لوں۔

میں نے ہمیشہ صاحب کی جانب دیکھا تو اُن کی ناراضی اُن کی عینک کے شیشوں پر ایک شکایت آمیز دُھند کی طرح پھیلتی تھی ”ہمیشہ... اگر آپ اس غیر ٹری ماحول سے نالاں ہیں تو ہم ہوٹل واپس چلے چلتے ہیں۔“

”نالاندہ تو میں آپ لوگوں سے ہوں۔“ ہمیشہ سخت خفا دکھائی دیتی تھی ”بھئی کیسینو میں آ کر یوں ندیدے اونٹوں کی طرح گھومنے کی کیا تمک ہے... بھئی آپ لوگ ذرا انجانے کریں۔ ذرا شراب وغیرہ پیئیں... جو وغیرہ کھیلیں... خواہ مخواہ ٹائم ضائع کر رہے ہیں۔“

ہم مرد حضرات سخت شاکڈ ہوئے کہ یہ پرہیزگار بی بی ہمیں کب نصیحت کر رہی ہیں... اگرچہ ہم اس نصیحت کے لئے قدرے شکر گزار بھی ہوئے...

”کیوں جو اُٹھیلیں؟“ فاروق نے تنک کر کہا۔

”آپ نہیں کھیلیں گے تو میں کیسے کھیلوں گی؟“

سب کے سرگھوم گئے ”ہمیشہ صاحب آپ بھی... یعنی یو ٹورولس وغیرہ...“

”تو اور کیا...“ اُنہوں نے ہم پر ایک نظر ملامت ڈالی جو اُن کی تنک کے شیشوں کو پار کرتی ہوئی ہمیں ملامتی کر گئی ”بھئی میں تو لاس ویگاس گئی تھی تو میں نے وہاں بہت جو کھیا“

جوئے کی جیت کا مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ ایک انسان کے فخر میں قید ہوئی ہے۔ سیاست کی جیت میں ایک انسان پوری قوم کو قید کر لیتا ہے۔

سب لوگ اُسے... وہ لوگ جو اُس کی نیبل کے گرد تہی ٹیپ کے پار اُسے نہیں پہنچ سکتے تھے اُسے ایک دیوتا کی نظروں سے دیکھتے تھے... اور اُس خوش نصیب کے سامنے... اُس کی دیوی بیٹھی ہوئی تھی...

وہ دیوی آئینشل تھی یا نان آئینشل لیکن کوئی اتنی خاص دیوی نہ تھی۔

شاید وہ صرف آج کی شب کے لئے اُس کی دیوی تھی...

وہ کبھی کبھار سلا دنگتے ہوئے اُس پر ایک نگاہ ڈالتا جس میں کوئی چاہت پایا ہوتا اور پھر روایت کے گیند کے سحر میں مبتلا ہو جاتا۔

ہمیشہ نے اپنی عینک ایڈجسٹ کر کے اُس دیوی کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا۔ کابنور مطالعہ کیا اور کہنے لگیں ”تارڑ صاحب... یہ کماری اس جواری نے بڑے ذرا کے لئے سنبھال رکھی ہے... جب یہ سب کچھ ہار جائے گا“

”ہو سکتا ہے وہ اس کماری کو بھی ہار جائے“

”نہیں۔“ طاہرہ نے ناک چڑھا کر کہا ”اسے نہیں ہارے گا“

”کیوں؟“

”اسے کوئی جیتے گا ہی نہیں۔ کیا کرے گا جیت کر“

ہم ایک بے مصرف... اور ایک پیسہ بھی ہارے یا جیتے بغیر چہل قدمی کرتے نڈھال ہو گئے۔ سلاٹ مشینوں کے سامنے بلند کرسیوں پر زیادہ تر خواتین مصروف عمل تھیں۔ وہ اپنی گود میں سکوں کے پیالے رکھے ان مشینوں کے منہ میں ڈالتی تھیں اور پنڈل گھما کر تمام مسخروں، تمام سیبوں یا تمام نمبروں کو گھومتے ہوئے وہ رکستے تھے تو ایک ہی لائن میں دیکھنے کی متمنی تھیں اور کوئی نہ کوئی سیب آگے پہنچتا تھا اور کوئی ایک مسخرہ دغا دے جاتا تھا اور وہ جیک پاٹ سے محروم رہ جاتی تھیں۔

”یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟“

”کیوں؟ کیا حرج ہے؟..... میں تو مغرب پڑھ کر گئی تھی اور عشاء کے وقت آئی تھی..... یوں بھی سلاٹ مشین میں کچھ ریڈ گاری ڈال کر ذرا اہلا گلا کر لیا جائے تو کیا ہے.....“

”ہمارا یہ خیال تھا کہ آپ..... اور آپ سے ہم ڈرتے بھی بہت ہیں..... ہمیں ہوئیں..... تو یہ خیال تھا کہ آپ اس قسم کی مخرب الاخلاق حرکتوں پر کوئی فتویٰ وغیرہ جاری کر دیں گی..... لاجول پڑھیں گی.....“

اور ہمیشہ نے اُس لمحے کیسینو رائل کے روشن قمار خانے میں..... موسیقی جواریوں کے نعروں کے شور میں ایک عجیب لیکن پتے کی بات کسی ”اگر تو میرے لاد پڑھنے سے یہ سب کچھ غائب ہو جائے..... لاس ویگاس اور کھٹنڈو صفحہ ہستی سے مٹ جا تو میں فوراً لاجول پڑھ لوں..... لیکن..... یہ جن تو یونہی رہے گا تو ہزاروں جانور اپنی بولیاں کیوں نہ بولیں..... ذرا اپنے آپ کو خوش کیوں نہ کر لیں.....“

اور منطق کی یہ بات کم از کم ملک پر فوراً اثر کر گئی اور وہ فوراً اپنے بال اپنے ڈالر جوئے کے ٹھپوں میں بدلنے کے لئے کیسینو کے کاؤنٹر کی جانب ایک خوش اونٹ کی طرح جھومتا ہوا چلا گیا.....

کیسینو کی انتظامیہ نے یہ خصوصی اہتمام کیا تھا کہ اُس پورے علاقے میں کوئی بیٹھے تو روایت میزوں کے گرد بیٹھے..... تاش پھینٹنے نیپالی تجربہ کار اور کانیاں جوئے ترغیب دینے والے سیاہ جیکٹوں اور بوٹائیوں میں بندھے اہلکاروں کے سامنے بیٹھے سلاٹ مشینوں کے سامنے اونچی کرسیوں پر براجمان ہو..... اس کے سوا وہاں یونہی دیکھنے کے شوقین ہم جیسے خواتین و حضرات کے لئے ہم جیسے متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لئے کوئی نشست نہ تھی.....

کوئی انسان، چاہے ماحول کتنا ہی صحرا انگیز اور کفر آمیز کیوں نہ ہو..... کتنی دیر

قدی کر سکتا ہے۔ مزاحمت کر سکتا ہے..... بالآخر اُس کی ٹانگیں لوہے کی طرح سخت ہو جاتی ہیں اور وہ نشست گاہ کے لئے مارجاتا ہے.....

جیسے دنیا کے بڑے میوزیمز میں..... بے شک آپ مونا لیزا یا لاسٹ سپریا لاسٹ جج منٹ کو دیکھ رہے ہوں تو بالآخر آپ کسی ایک بیچ کو مونا لیزا سے بہتر جانتے ہیں۔ اور یہاں..... کیسینو رائل میں کوئی ایک نشست گاہ ہم جیسے پرہیزگار لوگوں کے لئے نہ تھی..... اور ہماری ٹانگیں لوہے کی ہو چکی تھیں..... اور ان میں خواتین کی ٹانگیں بھی شامل ہوں گی اگرچہ ہم تصدیق نہ کر سکتے تھے.....

اور وہاں..... کیسینو رائل میں..... صرف ایک نشست گاہ تھی، یعنی ریسٹوران..... جہاں سے ہمیں مسلسل بلند آہنگ موسیقی اور اشتہا انگیز کھانوں کی مہک پکارتی تھی..... اور ہم وہاں کھانوں کی مہک سے زیادہ اشتہا انگیز ایک ایسی لڑکی کو دیکھتے تھے..... یا شاید صرف میں دیکھتا تھا جس کا محبوب جوئے میں سب کچھ ہار چکا تھا اور شاید شراب کی گرمی سے اور اُس میں شامل ہار کی حدت سے بے آرام ہوتا اپنی چیک ٹی شرٹ اتار کر صرف بنیان میں لمبوس اپنے آپ کو بیڑ میں ڈبو تا تھا..... ڈوب جاتا تھا تو اپنی محبوب کو دیکھتا تک نہ تھا اور پھر ڈوب کر ذرا اُبھرتا تھا تو اُسے اُبھرا ہوا دیکھ کر پھر سے ڈوب جاتا تھا.....

اُس لڑکی کی ٹی شرٹ پر..... یعنی اشتہا انگیز ہندوستانی کماری کی ٹی شرٹ پر کچھ لکھا تھا..... اور ہر کوئی..... جس کسی کے پاس سے وہ گزرتی تھی..... اور جس کسی کے قریب سے وہ گزرتی تھی اُس کا نوالہ منہ میں رہ جاتا تھا..... وہ اُس کی ٹی شرٹ پر جو کچھ لکھا تھا اُسے پڑھنے کی کوشش کرتا تھا..... کہ کیا لکھا ہے..... اور اُسے پڑھنا دشوار تھا..... کیونکہ اُس کماری نے اپنے بدن کی ہل جل سے اپیل چمانے کے لئے اُس ٹی شرٹ کے نیچے کچھ بھی زیب تن کرنے کا اہتمام نہ کیا تھا اور یوں ایک مسلسل زلزلے کی کیفیت تھی۔

حیرت ہے کہ ہمیشہ نے بھی اُس کی بدنی حرکت کی فاشی پر کوئی لعن طعن نہ کیا بلکہ

کی میز پر کیسے سرخ اور سیاہ نمبروں کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ کیسے رقم ڈگنی ہوتی ہے اور کیسے رقم زیر دہوتی ہے۔

سُہری بابانہ رہ سکے ”یہ رقم آئی سی میں ہے یا نیپالی میں؟“
 ”ڈالروں میں.... میں اپنے بھائی کے پاس امریکہ گئی تھی اور ہم لوگ ایک شب کیسینو گئے تھے۔ وہاں اُس نے اتنی رقم جیتی کہ واپسی پر ہماری کار میں ہر جانب ڈالروں کے بل اڑتے تھے اور میرا بھائی اتنا خوش تھا کہ وہ کھڑکی کھول کر یہ ڈالر باہر بھی اُچھالتا جا رہا تھا“

”آپ ایک جواری بھائی کی ہمیشہ ہیں؟“ حیرت سے کسی نے پوچھا۔
 ”نہیں ہرگز نہیں... شاید وہ پہلی بار کسی کیسینو میں گیا تھا“
 ”آپ نے بھی جوا کھیلا؟“

”ہاں.... اُن میں سے بیشتر ڈالر میں نے ہی رولٹ کی میز پر جیتے تھے.... پہلی مرتبہ کھیلا تھا اور میرے حصے میں آغاز کرنے والے کی روایتی خوش نصیبی آگئی....“
 اب ہم خالدہ بی بی کی بے حد تکریم کرنے لگے اور اُنہیں گمشدہ اور سرگوشی کے علاوہ جواری حسینہ کا خطاب دینے پر بھی غور کرنے لگے۔

سنج پر ایک نیپالی لڑکا اور لڑکی تازہ ترین انڈین ہٹس گا رہے تھے.... اور وہ بے حد سُمر میں تھے۔ یہ میں اس لئے جانتا تھا کہ اُن دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر میں ”تیرے نام“ کا موسیقی کا پروگرام کمپیئر کرتا تھا اور ہر وقت طرح طرح کے گتوں اور میراثوں کی سنگت میں رہتا تھا اور جاٹ ہونے کے باوجود اُنہی کی راہ پر چل نکلتا تھا اور سُمر کے ساتھ اپنا سریالے ہلاتا تھا کہ طبلے کی آخری تھاپ پر وہ یکدم ایک جھٹکے سے ساکت ہو جاتا تھا... اور میرا ہاتھ ایک ”واہ جی واہ“ کے ساتھ فضا میں بلند ہو جاتا تھا۔

یکدم ملک جو ایک طویل عرصے سے غائب تھا اور ہم اس خیال میں تھے کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آج کے اجلاس کی کارروائی کو سامنے رکھ کر کوئی دفتری رپورٹ تیار کر رہا ہو گا... نمودار ہو گیا۔ اُس کے ہاتھوں اور جیبوں میں بے شمار نیپالی روپے تھے جو اُس سے سنبھلتے نہ تھے جیسے ”لائف از آونٹی ڈنس“ والی حسینہ سے اُس کا سینہ نہ سنبھلتا

اُسے قدر دانی کی نظروں سے نوازا....

اور بالآخر ہم اُس کی ٹی شرٹ پر نمایاں پیغام کو پڑھنے میں کامیاب ہوئے
 ”زندگی ایک مرتبہ کے لئے ہے Life is only once....“ اگرچہ یہ قرین اذہن نہیں کہ وہ فرغانہ کے باہر سے آشنائی رکھتی ہو لیکن وہ گریٹ مغل بھی تو اپنی ٹی شرٹ پر ماٹو لکھ کر زندگی کرتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے عہد کے مطابق اسے عالم دوبارہ نیست کی صورت میں لکھتا تھا لیکن آج تو ہم اسے Life is only once.... ہی کہیں گے۔

باہر کے قول کی ٹی شرٹ ہمارے ارد گرد چلتی پھرتی تھی اور جب کبھی وہ ہا میز کی قربت میں سے گزرتی تو چند لمحوں کے لئے ہم پر سایہ سا ہو جاتا کہ اُس کا روشنیوں کو روکتا تھا۔

”تارڑ صاحب ماحول نہیں بن رہا۔“ ہمیشہ نے احتجاج کیا۔

”کیوں؟“

”بھی آپ لوگ نہ تو شراب پی رہے ہیں اور نہ جوا کھیل رہے ہیں۔ مجھے ہے آپ کے اندر اتھل پھل ہو رہی ہے اور آپ اُسے دبا رہے ہیں.... تو میری ط سے اجازت ہے۔“

میں نے اس سے قبل اتنی پرہیزگار اور ایسے مخرب الاخلاق درس دینی ہمیشہ دیکھی تھی اور گمشدہ بی بی بھی کسی سے پیچھے نہ تھی اگرچہ اس کی سرگوشی موسیقی کا کراؤؤ کے نخل میں مزید دب جاتی تھی اور وہ ایک قید تنہائی کے قیدی کی طرح ڈراؤ ڈرک اور ٹھہر ٹھہر کربات کرتی تھی ”تارڑ صاحب اگر آپ نے جوا کھیلا ہے تو میں آپ بتاتی ہوں کہ اسے کیسے کھیلا جاتا ہے۔“

یعنی ایک اور بروٹس....

”کیسے کھیلا جاتا ہے؟“

اس سوال کے جواب میں گمشدہ نے ایک طویل تحقیقی مقالہ پیش کیا کہ رولٹ

رستوران میں کوئی میز خالی نہ تھی.... لیکن کوئی بھی شخص تادیر اپنی نشست پر قائم نہ رہ سکا۔ اُسے ہال کی سلاٹ مشینیں، تاش کے پتے اور رولٹ کی میزیں ایسے سندیے بھیجتیں کہ وہ بے چین ہو کر اُن کی جانب سفر کرتا.... اور اُس کی نشست پر کوئی اور تھا اور ہارا جواری ڈھیر ہو جاتا۔

سامنے کی میز پر ایک برگزیڈہ اور عمر رسیدہ سردار صاحب کھائے چلے جا رہے تھے اور پتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی نہایت دہسی اور نہایت ناقابل قبول سردارنی اُن پر کڑی نظر رکھے فرنج فراز کے انبار نوش کرتی چلی جا رہی تھیں.... سردار صاحب کو سٹیج پر رقص کرتی لڑکی سے یا جوئے سے کوئی شغف نہ تھا.... ایک بار جب وہ اُس شغف کی بوتل حاصل کرنے کے لئے اُٹھے جس سے اُنہیں شغف تھا اور میرے قریب سے گزرے تو میں نے حسب عادت پوچھا ”سردار جی کی ہو رہیا اے؟“

سردار صاحب نے میری طرف دیکھا اور پتہ نہیں میں اُن کو نظر آیا بھی یا نہیں اور بوکھلا کر بولے ”عیش ہو رہی اے میں کہا۔۔۔“ اور چلے گئے۔

”اس بابے سردار نے آپ کو زیادہ لفٹ نہیں کرائی“ سُہری بابا بہت خوش ہوئے۔

”نہیں تو نہ سہی، میرا تو اخلاقی فرض ہے کہ کھٹنڈو میں ہر سردار سے اُس کا حال چال پوچھا جائے۔“

اتنی دیر میں سردار صاحب بار سے اپنی بوتل حاصل کر کے لوٹے تو میں نے پھر کہا ”سردار جی.... کتھوں آئے او؟“

”آپاں گلکتے تو آئے ہاں۔۔۔“ وہ اب ہنتر موڈ میں تھے۔

”یہ سردار بنگال میں کیا کر رہے ہیں؟“

”ساراج جو محنت کرتا ہے وہی قُل کھاتا ہے۔ پورے ہندوستان میں صرف سردار ہے جو کھوتوں کی طرح محنت کرتا ہے اس لئے قُل کھاتا ہے....“

”آپ تو پھل کھانے کی بجائے پی رہے ہیں۔“

”آہو.... آپاں دا گلکتے وچ دو پٹیاں دا بچنٹس اے.... کدی گلکتے آؤتے کے نوں بچھ لیبو کہ دوپٹے والے سردار جی کدھر ہیں.... پنچ جاؤ گے.... ٹی دی ٹوں آئے او؟“

تھا.... نوٹ اُس کے کوٹ کی جیبوں میں سے قیدی پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے تھے اور میرا جیک پاٹ نکل آیا ہے۔ میں نے سات ہزار روپے جیت لئے ہیں.... اور یہ سب اُس کے لئے ہیں“ اُس نے ایک لمحے کے لئے اُن نوٹوں کو ہوا میں اُچھال کر اپنا جینے اعلان کرنے کے بارے میں سوچا اور پھر شاید ہمیشہ صاحبہ کے احترام میں گریز کر گیا۔

ملک صاحب اُس جواری شب میں ہمارے ہیرو ہو گئے۔

اُنہوں نے ہماری لالچ رکھی تھی....

”شبابش۔“ ہمیشہ نے کہا....

بقیہ لوگوں نے اُن کی پیٹھ تھپک کر داد دی اور مسرت کا اظہار کیا۔

”آج کی شب آپ جو کچھ کھائیں جیسے گے اُس کا بیل میں ادا کروں گا اور اُس سب اِس جیتی ہوئی رقم سے جو اُکھیلیں گے کیونکہ میں اس حرام کی کمائی کا ایک پے جوئے خانے سے باہر نہیں لے جاؤں گا۔“

چنانچہ حرام کی کمائی تقسیم کر دی گئی۔

جواری حسینہ ”آئی گرل گائیڈ غائب ہو گئیں۔ فاروق جانے کہاں تھا.... میں صرف میں اور سُہری بابا رہ گئے....“

”آپ جو اکیوں نہیں کھیلے؟“

”مجھ سے یہ سوال ابھی ابھی دوستو سکی اور ٹالسٹائی نے بھی پوچھا تھا....“

”Indeed“ ضیاء صاحب نے مجھے پُر تشویش نظروں سے دیکھا ”یہ دوستو سکی اور ٹالسٹائی وغیرہ جو ہیں تو یہ.... ادھر ہیں، نیپال میں....“

”یہ تو عقیدے کی قوت ہے باباجی.... جو ہر شے کو ہر شخص کو چاہے وہ صد بار پیشتر گزر چکا ہو حاضر کر دیتی ہے۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں جن کے خوابوں میں پیر فقیر آتے ہیں اور اُنہیں پارسائی کی خلعت عطا کر کے چلے جاتے ہیں۔ ادب کے مذہب میں جو شیخ ہیں وہ کیوں ایک مُرد ادیب کے سامنے حاضر نہیں ہو سکتے....“

”indeed“ اُنہوں نے صرف اتنا کہا۔

اس دوران شہنشاہ باہر کی پیروکار اپنی ٹی شرٹ پر ”عالم دوبارہ نیست“ کو ہال جلاتی ہمارے پاس سے گزر گئی۔

حسین اگر اپنے وطن کے لئے اب بھی کوکتے ہیں تو برا نہیں کرتے.... منیر نیازی لاہور کے
بازن شپ میں بھی ہوشیار پور کی منک میں آباد ہے تو وہ بے بس ہے۔ صادقین اگر مروہ
کے ظلم سے باہر نہیں آتے تھے تو ان کو دوش نہیں دیا جاسکتا....

راج کپور خانمان اگر اب بھی اپنی ہر شادی پر اور مرگ پر.... شادی شدہ
بیڑے کے چرے پر یا مردہ جسم پر پشاور کی مٹی چھڑکتا ہے تو اُسے معتبوب نہیں کیا
جاسکتا۔ پران 'اوم پرکاش اور کامنی کوشل لاہور کی انار کلی کو نہیں بھول سکے۔ دھرمیندر
نیل دت 'راجندر کمار' مدھوبالا 'دلیپ کمار' بلراج ساہنی' راجیش کھنہ اور گلزار اور بہت
سے دوسرے اپنے سیالکوٹ، جہلم، ایبٹ آباد، راولپنڈی، پشاور اور دہلی کے ساتھ لئے
لئے بھرتے رہے....

اوم پرکاش کی موت سے کچھ عرصہ پہلے لاہور کے دو نوجوان بمبئی گئے اور
ملاقات کے لئے انہیں فون کیا تو ان کے سیکرٹری نے سختی سے انکار کر دیا کہ وہ بے حد
مصروف ہیں.... "جی ہم لاہور سے آئے ہیں" انہوں نے درخواست کی....
"تو جناب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا، اوم پرکاش جی نے کہہ رکھا ہے۔ اگر
کوئی لاہور سے آئے تو اُسے آنے دو۔"

ملاقات پر اوم پرکاش نے ان نوجوانوں کے جوتوں کو غور سے دیکھا اور پوچھا "یہ
بھی لاہور سے آئے ہیں...." اور پھر جھک کر ان پر جی مٹی کو چھوا اور اپنے ماتھے پر لگایا
"میرے شہر دی مٹی لے کے آئے او.... میں تماڈا داس ہاں...."

پچھلے دنوں راجستان سے مجھے ایک خط آیا "میں آپکے گاؤں جو کالیاں کارہنے
والا ہوں.... میرے والد قصبے کے سکول میں فارسی پڑھایا کرتے تھے.... عمر ستر برس سے
تجاوز کر چکی ہے۔ شاعری کرتا ہوں، بلھے شاہ کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ فضا جو کالوی
تھیں کرتا ہوں.... کتاب "رموز عرفان" روانہ کر رہا ہوں.... اس درخواست کے ساتھ کہ
اسے گاؤں کے کسی مدرسے میں پہنچادیں۔ بے شک کسی گلی میں رکھ دیں، چناب کے
کنارے جو بیلا ہے اُس کے کسی درخت کی چھاؤں میں رکھ دیں.... میری تسلی ہو جائے
گی، اطمینان سے مر سکوں گا۔"

انور سجاد ہندوستان گئے تو راجندر سنگھ بیدی سے ملنے گئے۔ بیدی بہت بیمار تھے،

"نہیں.... لاہور توں آئے ہاں۔"
سردار جی تھم سے گئے "سچ سچ دے لاہور توں؟"
"آہو...."

"مہاراجہ رنجیت سنگھ دے لاہور توں؟"
"ہاں جی۔"

"نہیں جی مزاق کرتے ہو.... ادھر نیپال میں.... سچ سچ دے لاہور توں...."
"ہاں جی۔"

"تو مجھے چرن چھوئے دو مہاراج ننگنا صاحب کے پاس سے آئے ہو۔"
نئے بمشکل انہیں اس اقدام سے باز رکھا....

"اُدھر لاہور میں میرے پتاجی اور میں امرتسر سے ٹرین میں بیٹھ کر جاتے تھے
فلمیں دیکھتے تھے تو میں تو ذرا چھوٹا تھا...." اُدھر ان کی سرداری انہیں نظر میں رکھے
فراز مسلسل کھا رہی تھیں "مہاراج اُدھر انار کلی اب بھی ہے؟"
"ہے۔۔۔"

"اور ٹھنڈی سڑک بھی ہے؟"
"ہے...."

"تو مجھے چرن چھوئے دیں۔" سردار جی بہت ہی گلو گیر ہو گئے اور میں جانا تھا
چرن چھوئے کے لئے ذرا جھکے تو وہیں ڈھیر ہو جائیں گے۔ میں نے پھر بڑی مشکل سے
انہیں باز رکھا۔

ہم اپنے ایام جاہلیت میں لکھنؤ اور دہلی کی یاد میں آہیں بھرتے اور پانڈے
سرزمین سے کوئی وابستگی نہ رکھتے مہاجرین کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے.... یہ کیوں
بھولتے! کیوں ہماری زبان نہیں بولتے.... سندھ اور چناب کی بجائے گنگا اور جمنائے گنگا
کیوں گاتے ہیں.... لیکن بہت بعد میں ہم پر کھلا کہ زمین نہیں بھولتی.... اپنے چھوٹے
ہوئے گاؤں اور شہر بے شک وہاں کھنڈر ہو چکے ہوں لیکن بدن میں بستے رہنے پانا
بزرگوں کی قبریں محرم میں ہمیشہ اُس مٹی کی یاد دلاتی ہیں جو آپ ان پر نہیں ڈال سکے
کوئی ایک پرندہ جو کسی ام کے پیڑ پر بولا تھا.... بولتا چلا جاتا ہے چپ ہی نہیں ہوتا۔"

بوجہ لگا کر سکیں۔ جس کو دیکھا خمار میں دیکھا
جس کو چاہا خمار میں چاہا

ان میں وہ چیک شرٹ والا ہندوستانی جواری بھی تھا جس کے لئے رولٹ کی ایک میز کے گرد حصار قائم کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ آج کی شب کا سب سے اہم شخص تھا۔ جس نے بقول ہمشیرہ اپنی کماری کو برے وقتوں کے لئے بچا رکھا تھا اور لاکھوں روپے جیتنے کے بعد اب ان لاکھوں روپوں کو ہارنے کے بعد شاید اس لمحے کو یاد کرتا تھا جب اس کے پاس سب کچھ تھا۔ جیت کی رقم سے وہ ایک گھریا دو کاریں خرید سکتا تھا۔ اگر وہ اس لمحے بڑے اٹھ جانے کا فیصلہ کر لیتا۔ اور اُس نے دیر کر دی تھی۔ اور اب اُس کے پاس ایک ایسی کماری کے سوا کچھ نہ تھا جسے کوئی بھی جیتنا پسند نہ کرتا تھا۔

یہ ”ڈار اینڈ پیس“ کا پرنس ہو یا ”جواری“ کا جواری۔۔۔ چیک شرٹ والا یہ ہندوستانی ہو یا کوئی مستنصر حسین تارڑ۔۔۔ یا کوئی اور آوارہ گرد جو زندگی کو داؤ پر لگاتا ہے۔۔۔ یہ سب ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں۔

وہ اُس لمحے زندگی کی رولٹ میز سے اٹھتے نہیں جب وہ جیت رہے ہوتے ہیں، اُن کی کماری اُن کے پہلو میں ہوتی ہے۔۔۔ جیتے ہوئے ٹھپوں کے انبار اُن کے سامنے ڈھیر ہوتے ہیں۔ زندگی کے جوئے خانے کے سب لوگ اُنہیں حسد سے دیکھتے ہیں اور وہ اُس لمحے اٹھتے نہیں۔۔۔ ذرا دیر کر دیتے ہیں۔۔۔

اس آس اور یقین میں کہ ابھی زندگی کے قمار خانے میں اُن کے لئے جیتنے کو بہت کچھ ہے۔۔۔ اور وہاں کچھ نہیں ہوتا۔

آپ اپنے بہترین ٹیلی ویژن ڈرامے لکھتے ہیں، اداکاری اور میزبانی میں پُرسرار ہو جاتے ہیں، بیٹ سٹیل ہو جاتے ہیں۔۔۔ لیکن ہوس میں مبتلا ہو کر نہ شکر کرتے ہیں نہ اٹھتے ہیں اور دیر کر دیتے ہیں۔۔۔ اور بالآخر آپ کے چہرے پر صرف راکھ ہوتی ہے۔۔۔

جواری کموڈز پر جھومتے تھے۔

میں ہاتھ روم سے باہر آ رہا تھا تو سامنے ایک ایسے کمرے میں سے جہاں سے

کہنے لگے، لاہور دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔۔۔ کیا وہاں لوگ مجھے جانتے ہیں؟ انور صاحب نے بیدی صاحب آپ آئیں تو سہی، آدھا لاہور آپ کے استقبال کے لئے ایئر پورٹ پر گا۔۔۔ تو وہ رونے لگے۔۔۔ اُن کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

خشونت سنگھ کو آج بھی لاہور میں جو شکل نظر آتی ہے تصویر نظر آتی ہے ناول ”دہلی“ لکھنے کے باوجود دہلی میں کوئی کام کی شکل نظر نہیں آتی۔۔۔ ”ٹرین ٹو پاکستان“ لکھتا ہے تو قدرے جانب دار ہو کر لکھتا ہے۔۔۔

ہدایت کار اور شاعر گلزار اپنی تمام تر بین الاقوامی شہرت کے باوجود ابھی تک کی گلیوں میں ہی رات کرتا ہے۔۔۔ چاند پکھراج کا۔۔۔

تو یہ سردار جی بھی۔۔۔ کھنڈو کے ایک کیسینو میں جب لاہور اور پنجاب بارے میں جذباتی ہو کر میرے چرن چھوٹا چاہتے ہیں تو اُس کے پس منظر میں بھی گویا کی امیر تاپر تہم۔۔۔ جنڈیالا شیر خان کا وارث شاہ اور قصور کا بلھے شاہ ہیں۔

اُس بزرگ سردار جی کو بھی صرف میں سمجھتا تھا جیسے ہوٹل سولٹی کے کھڑے تین درختوں کو سمجھتا تھا۔۔۔

اس دوران سردار کی سرداری نے اُسے ایک ایسے سٹیشن پر تادیر لڑکے جہاں اُس کا شاپ نہ تھا تو اُسے قرا لود نظروں سے دیکھا جن کی تاب سردار نہ لاسا ہاتھ جوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

جواری حسینہ، جیت ہار کا مسئلہ طے کئے بغیر اپنی اداس آنکھوں سے سرگودھ کرتی واپس آگئی۔

ہمشیرہ کے ہاتھ میں بھی کچھ نہ تھا۔۔۔

وہ دونوں فاروق کی جیتی ہوئی رقم کو واپس کر کے آگئی تھیں۔

اور فاروق جانے کہاں۔۔۔ جانے کہاں تھا۔

میں کیسینو میں اتنی طویل موجودگی اور صبر کے بعد جب ریستوران سے اٹھ کر کے عقب میں واقع ہاتھ روم میں گیا تو وہاں بہت سارے جواری کموڈز اور یورپیئرز اوپر جھومتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ یہ کموڈ وغیرہ جو اُن کی شرح آنکھوں کے خمار کو حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے، ذرا ساکن ہو جائیں تاکہ وہ اطمینان سے

موسیقی کا شور اُبلتا آ رہا تھا ایک نیپالی خاتون باہر آ رہی تھی۔ وہ سراپا حسن تو نہ تھی
سراپا شہوت ضرور تھی... اگر کوئی مخمور شخص اُسے دیکھتا تو یہی کہتا کہ جس کو دیکھا
میں دیکھا... لیکن میں کیا کہتا... اور اُس نے مجھے کچھ کہنے نہ دیا اور کہنے لگی ”ہائے“
”ہیلو۔“

”آریو انڈین؟“

”نہیں... پاکستانی“

”ریٹلی...“ وہ ذرا فریڈنڈی ہو گئی ”ادھر پاکستانی تو کم ہی آتے ہیں... بلکہ تم ہر
پہلے پاکستانی ہو... ادھر نیپال میں کیا کرنے آئے ہیں؟“

”ادھر چیری کے شکوفوں سے لدے میرے تین دوست ہیں انہیں لے
ہوں۔“

”وڈر فل۔“ اُس نے اس نہ سمجھ میں نہ آنے والے بیان کی وجہ سے مجھے
کموڈز پر جھونسنے والا کوئی جواری جانا ”صرف اس لئے آئے ہیں؟“

”اور... ایورسٹ کے چرن چھونے... انا پورنا کو پر نام کرنے...“
اُسے یقین ہو گیا کہ میں یا تو مخبوط الحواس ہوں اور یا حالت خمار میں ہوں۔

وہ ان دونوں حالتوں کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ ”آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“
”یہیں ہوٹل سولتی کے کمرہ نمبر ۵۵۰ میں...“

”سی یو۔۔۔۔“ اُس نے اپنے مختصر ہنس پر پھنسے لباس کو گرفت میں لے کر
کیا اور چلی گئی۔

میں اپنی میز پر چلا گیا۔

سیٹیج پر جو گلوکار تھے۔ اگرچہ اُن کو کوئی نہیں سنتا تھا... سب حالت خمار
حالت خمار میں تھے لیکن وہ مائٹک کو تھامے اُس میں یہ کہتے تھے کہ ہم نے دیر نہیں
ہم آگے ہیں...“

جانے کس لمحے... باہر ابھی تک رات تھی یا دن تھا... اُنہوں نے ایک
شروع کیا... پرائی جینز اور گتار... بہت مانوس اور دل کش طرز کا نغمہ... یہ پاکستانی
علی حیدر کا ایک پاپ سونگ تھا اور اب جو میں نے کھٹنڈو کی رات میں... اُس

شہرہ ادا کیا...“

”ٹھیک ٹو...“

”یو آڈو ویکم سر...“ اُن کی مسکراہٹ میکانکی اور کاروباری تھی...
”آپ نے میرے پاکستان کا ایک گیت گایا... میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار
ہوں۔“

”یہ پاکستانی گیت ہے؟“ اُن کے چہروں سے کاروباری مسکراہٹ سمٹ گئی اور
اس کی جگہ حیرت قیام پذیر ہوئی ”ہم نہیں جانتے تھے... آپ پاکستانی ہیں؟“

”وہ تو میں ہوں۔۔۔۔“ میں نے فاروق کے جیتے ہوئے کچھ نیپالی نوٹ اُن پر
ٹھار کئے اور اپنی میز پر واپس آ گیا۔

اگرچہ میں نے اس کیسینو کی کسی روایت میز کے کسی شرخ یا سیاہ خانے میں داؤ
پر ایک بھی ٹیپ نہیں جمایا تھا... تاش کی کوئی بازی نہیں لگائی تھی۔ کسی سلاٹ مشین کا
ہینڈل نہیں گھمایا تھا... اور اس کے باوجود میں ایک ہارا ہوا جواری تھا...“

اس لئے کہ میں ایک آوارہ گرد تھا اور ہمیشہ دیر کر دیتا تھا...
میرے جو گرز... سنو جیکٹ... اور ادنی بنیائیں ابھی سوٹ کیس سے باہر آ کر
مانس نہیں لے سکتے تھے۔

میں زندگی کے قمار خانے میں بہ رضاؤ رغبت آ تو گیا تھا... اس کے باوجود کہ میں
جاننا تھا کہ میں جیت نہیں سکتا... کسی جھیل کرومبر... کسی شاہ گوری کو اپنی ملکیت نہیں بنا
سکتا تھا... واڈی سوئج کی بلندی پر کسی آبشار میں بھیگتے زرد پھولوں کو اپنے گھر میں نہیں لا
سکتا تھا... واڈی سوئج آباد کے کسی زرد سنو ٹائیگر کو اپنا نہیں سکتا تھا... دیو سائی کے
میدانوں میں جو عجیب رنگت اور شکل کے پھول کھلتے ہیں انہیں اپنے میدانوں میں نہیں
لا سکتا تھا... سٹولیک پر تیرتی کشتیوں کے بادبانوں کا رخ موڑ کر انہیں اپنے ڈرائنگ روم کی

”نہیں۔“

وہ صرف مسکرائی۔

”فرمائیے۔“

”میں نے کہا تھا تاں کہ..... سی ٹیو..... تو میں آپ کو دیکھنے آگئی ہوں۔“

اس نے کیا دیکھنا تھا..... جو دیکھنے آگئی تھی۔

شاید وہ لوگ گاڈیس کا ایک رُوپ تھی..... جو ملاقات کے لئے آگئی تھی۔

کماری، کماری.....

”سوری۔“ میں نے دروازہ بند کر دیا۔

کسی کو کیا پتہ کہ دروازہ بند کرنے سے بند ہوتا بھی ہے یا نہیں.....

کماری، کماری.....

زینت نہیں بنا سکتا تھا اس لئے میں ایک بار اہوا جواری تھا۔

چنانچہ میں اُس قمار خانہ حیات سے اُٹھ گیا.....

رات کے کسی پہر میں..... جب میں تھکاوٹ اور بے وجہ خمار کی زد میں ہوں

نیند میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں..... لاہور میں ہوں..... کھٹمنڈو میں ہوں

ارضِ روم میں ہوں میرے ذر پر کوئی دستک ہوئی، اور تادیر ہوئی.....

یہ دستک ایک عالم خواب میں تھی.....

ایک دھند میں لپٹے خیال میں تھی.....

نیند کی عارضی موت میں کوئی میرے بدن کے دروازے پر ہاتھ رکھتا تھا۔

تادیر رکھتا تھا.....

اور میں نے نرم تنکے میں دفن اپنے مختصر ہوتے بالوں، آنکھوں کو..... اور غر

ڈھلتے چہرے کو اٹھایا اور ہوٹل سولتی کے روم نمبر ۵۵۰ کی نیم تاریکی میں کہا ”کون ہے؟“

اور میرے نیند میں ڈوبے وجود کو یوں لگا جیسے خلیل جبران جواب میں کہتا ہے

میں کبھی لا جواب نہیں ہوا..... سوائے اُس شخص کے..... کہ جس نے مجھ سے پوچھا ہو کہ

کون ہے؟

لیکن رات کے اس پہر..... میرے دروازے پر خلیل جبران تو دستک نہ دے

تھا۔

نہ دوستو دستکی اور ٹائٹائی مجھے اس بے ہنگم وقت میں ملنے کے لئے آسکتے

کون تھا جو میرے دروازے پر مسلسل دستک دیتا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ آن کیا اور ڈولتا ہوا دروازے تک پہنچا

حالت ناگواری میں پہنچا اور دروازہ کھولا تو سامنے قمار خانے کے ہاتھ روم کے باہر

نیپالی خاتون سے ملاقات ہوئی تھی..... جو خوش شکل نہ لگی تھی خوش شہوت لگی تھی

کھڑی تھی۔

”سوری..... مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا“ وہ کمر تک

آگئی..... اور اُس کی کمر کمان ہوتی تھی اور اُس کے ہنس پر لباس پھنستا تھا.....

اور یہ ٹوسٹ ایسے گرم اور کڑکڑاتے ہوتے ہیں جیسے گاؤں کے تندور میں سے نکلنے والی دھکی گندم کی روٹی..... ان نیپالیوں کو..... ہمیشہ نے ٹوسٹ ٹٹولتے ہوئے بیان دیا ”ان نیپالیوں کو نہ ڈبل روٹی بنانا آتا ہے اور نہ اُس پر مکھن لگانا آتا ہے۔ اور نہ.....“

”آپ پاکستان کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائیں گی ہمیشہ؟“

”فی الحال تو ڈبل روٹی کو یاد کر رہی ہوں“

ناشتے کی میز پر بھی سب کی حیثیتیں الگ الگ تھیں۔

بگلہ دہی وفد کی خواتین فوازے کے زو پہلی کزنوں والے چمکتے منظر والی شیشے کی کڑکی سے لگ کر بیٹھی تھیں اور اُن میں دو ایسی تھیں جنہوں نے نہایت اہتمام سے اپنے سر کو ڈھانپ رکھا تھا..... اس کے باوجود کہ ہم اُنہیں کوئی مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے..... اب تو اُنہیں کیا پرواہ کہ ہم اُنہیں کیا سمجھتے ہیں یہ تب کی بات ہے جب پاکستان، پاکستان تھا اور منبر و مسجد سے اور سیاست کی سٹیج سے یہی اعلان کیا جاتا تھا کہ یہ پاکستانِ نیا مت تک قائم رہے گا..... بس یہ الگ بات کہ وہ قیامت صرف چوبیس برس بعد ہی آگئی تو یہ تب کی بات ہے جب ہم اُنہیں مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہارمونیم پر اپنے دریاؤں کے گیت گاتے تھے اور اللہ بارش دے کی بجائے اللہ میگھ دے پکارتے تھے جو سراسر نظریہ پاکستان کے خلاف تھا۔ اپنے جنگلوں میں رہنے والے جانوروں اور تالابوں میں اُچھلنے والی مچھلیوں سے پیار کرتے تھے۔ رقص کرتے تھے اور نذرل کے نغمے الاپتے تھے جو کلکتہ میں رہتا تھا۔ اقبال اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا جو ایک مرتبہ پھر نظریہ پاکستان کے منافی عمل تھا..... یہاں تک کہ ہندو ٹیگور کی شاعری کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور اُن کی خواتین ساڑھیاں باندھتی تھیں جو ایک باپردہ لباس نہ تھا اور اُن کی اُردو نہایت کمزور تھی اور انگریزی کا لوجہ بہت خراب تھا اور اُن کی رنگت نیم سیاہ تھی اور قد چھوٹے تھے۔ ہماری مسلمانوں کا معیار جدا تھا۔ ایک اچھا مسلمان صرف شلوار قمیض پہنتا ہے، موسیقی کو حرام سمجھتا ہے، اُس کی اُردو کاشین قاف درست ہوتا ہے۔ انگریزی آکسوفین لہجے میں بولنے کی سعی کرتا ہے، دراز قد اور کھلی رنگت کا ہوتا ہے چنانچہ وہ ہمارے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے..... اس کے باوجود کہ مسلم لیگ صرف بنگال میں جیتی تھی پنجاب یا سرحد میں نہیں، اور تحریک پاکستان کا آغاز بھی وہیں سے ہوا تھا..... لیکن وہ ہماری مسلمانوں اور

”شب کا خمار... ایورسٹ کا بخار“

ناشتے کی میز پر..... ایک اور سویر تھی..... ایک اور قمار کی شب کا خمار تھا۔ کھٹمنڈو کی پہلی دھوپ میں ریستوران کے باہر ہوٹل سولتی کے لان میں ایک فوارہ اُبلتا تھا۔ جس کے پانیوں کا اُبال جب اپنی شدت سے تھک کر ذرا ٹوٹتا تھا اور پھر ہوتا تھا تو اُس پر پہلی دھوپ کا سُہری اثر کھل کر اُسے پگھلا ہوا سونا بناتا تھا اور پھر آتش آفتاب کی پہلی کرنوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوازے میں گر جاتا تھا۔

ناشتے کی میز پر.....

ہمیشہ..... اپنی پلیٹ میں رکھے نہایت مختصر اور باریک اور جلعے ہوئے ٹوسٹوں کاٹنے سے بے دلی سے ادھر ادھر کرتی تھیں جیسے کوئی بھٹیاریان مکئی کے دانوں کو بھٹیاریا اُلٹ پلٹ کرتی ہے اور وہ دانے جل گئے ہوتے ہیں۔

وہ نہایت سنجیدہ تھیں اور اس کے ساتھ رنجیدہ بھی تھیں ”اگرچہ میں وہ جس کے تین چار گلاس پی چکی ہوں لیکن میری تسلی تب تک نہیں ہوتی جب تک ایک نیم گرم کڑکڑاتا ہوا ٹوسٹ نہ کھالوں..... لیکن..... تارڑ صاحب ان آپ کے نیپالیوں کو..... ڈبل روٹی بھی بنانا نہیں آتی..... ہائے وہ اپنے پاکستان کی ڈبل روٹی جس ٹوسٹ بھرے ہوئے اور ٹھوس ذائقے والے ہوتے ہیں اور جب ٹوسٹر میں اُچھل کر آتے ہیں اور اُن پر گھریلو مکھن لگایا جاتا ہے اور وہ اُن پر فی الفور پگھلتا ہے تو اُن کی مکھن آپ کے باغ میں کھلے ہوئے پٹو نیاز اور ڈھلیاز بھی مست ہو کر ذرا زیادہ کھل جاتے ہیں

حب الوطنی کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔

تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم بھی ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔
آج سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ اپنے ملکی معاملات ہم سے بہتر
پر چلا رہے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی کنٹرول کر لیا ہے اور
کہتے ہیں کہ بنگالی بچے پیدا کرنے سے باز نہیں آسکتا۔ ان کی معیشت بہتر ہے اور
بینکنگ سسٹم تیسری دنیا میں ایک مثال کے طور پر اپنایا جا رہا ہے۔ ان کے خزانے
پاکستان سے دو گنے ذخائر ہیں، اور وہ اپنے ایئر پورٹس، کارپوریشنیں، بجلی گھر، موٹروں اور
کارخانے غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی ناکام کوشش نہیں کر رہے
البتہ وہ ایک میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کا ممبر پارلیمنٹ اتنا بے چارہ ہے
پارلیمنٹ کے اجلاس میں شمولیت کے لئے سائیکل، رکتے یا کسی کھٹارہ کار میں آتا ہے
پیدل بھی آتا ہے۔

اگرچہ ہم انہیں مناسب مسلمان نہیں سمجھتے تھے لیکن بنگلہ دیش کے وفد
خواتین میں سے دو ایسی تھیں جو اپنے سر کو ڈھانپے ہوئے تھیں اور پاکستانی وفد کی خواندہ
لنگے سر تھیں کیونکہ ہم بہتر مسلمان تھے۔

ویسے اس پوری کانفرنس میں واحد مسئلہ مسلمان، مسعود تھا۔

مسعود ایک خوشگوار طبع کا ہمہ وقت مسکراتا ہوا سیاہ ریش نوجوان تھا جو کانفرنس
میں طالبان کے افغانستان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ سُہری بابا کا کہنا تھا کہ طالبان ہر دو چار روز
بعد اُس کی داڑھی مٹھی میں لے کر چیک کرتے ہیں کہ یہ مطلوبہ طالبانی معیار پر پورے
اُترتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ انہی دنوں کابل میں ایسے ایمان افروز مظاہرے دیکھنے میں آتے
تھے کہ اگر آپ کی داڑھی مٹھی میں لینے سے ان کے چند بال مٹھی سے باہر نہیں جھانکتے
آپ کو برسرعام سزا دی جاتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود مسعود ایک سلجھا ہوا پُرا من اور نفیس طبیعت کا نوجوان تھا
اور خاص طور پر میری باتوں کا برا نہیں مانتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا اور کسی حد تک مجھ سے
محبت کرتا تھا۔

یہ الگ قصہ ہے کہ کیا آپ کسی طالبان کی محبت کا خطرہ مول لے سکتے ہیں؟

نہیں۔ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ جاتا تھا لیکن قمار خانے میں جانے سے انکاری ہو گیا تھا۔

”آپ میری پوزیشن سمجھتے ہیں ناں۔۔۔“

اور ہم اُس کی پوزیشن خوب سمجھتے تھے۔

ایک سیشن کے دوران سُہری بابا نے اُسے دھمکی دی تھی کہ مسعود میں ان
پہلی حسناؤں کے ساتھ آپ کی تصویر اُتاروں گا اور خاص طور پر اس حسینہ کے ساتھ
جسے آپ بے حد رغبت سے دیکھتے ہیں اور جس کی ناف بہت خوبصورت ہے۔ اور یہ
تصویر کابل میں طالبان کو روانہ کر دوں گا۔

اور اس نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا ”ہماری یہ قسمت کہاں جناب۔۔۔“

ناشتے کی میز پر ابھی تک قمار خانے کی شب کا شمار تھا۔

”رات آپ کے کمرے میں کوئی آیا تھا؟“ فاروق نے ذرا آگے ہو کر اپنی

لُٹھیں سنواریں۔

”نہیں۔“

”جانے دیں سر۔“

”شاید کوئی دستک ہوئی تھی۔“

”وہ دستک میرے دروازے پر بھی ہوئی تھی۔“

”پھر۔۔۔“

”پھر آپ نے بتایا ہے کہ آپ نے دروازہ کھولا تھا یا نہیں۔ تو میں کیوں بتاؤں۔۔۔“

میں بھی تو کیسی نو کے ہاتھ روم تک گیا تھا اور کسی نے ”سی یو“ کہا تھا۔

ریستوران سے باہر فوٹازے کے اُلتے پانیوں کو اب کھٹنڈو کی دھوپ سے ملاپ
کے لئے زیادہ بلند نہیں ہونا پڑتا تھا۔ وہ نیچے آچکی تھی اور ہوٹل کے لان میں
سُہری انٹیم کے پھولوں کے تختوں کو اندھا کر دینے والے لشکیلے رنگوں کے ایک دریا
میں بہتی تھی۔

”تارڑ صاحب۔۔۔“ ہمیشہ نے اپنی عینک سے معمول کی چھیڑ چھاڑ کر کے اُسے

”رست کیا“ آپ مجھ سے ہاتھ ملائیں۔“

”میں نہیں ملاتا۔“

”کیوں؟“

”میں صدیوں پہلے جب انگلستان سے لوٹا تھا اور خاصا مغربی ہو چکا تھا تو رشتے کی خالہ زاد بہن کو میں نے کسی بات پر خوش ہو کر کہا تھا کہ ہاتھ ملائیں، تو اُس جواب میں کہا تھا، تمہیں شرم نہیں آتی ماؤں بہنوں کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ آپ کے ساتھ مذاق نہیں کر سکتا کہ آپ ہمشیرہ صاحبہ ہیں“

”آپ تو بہت ہی بیک ورڈ ہیں۔“ ہمشیرہ نے چمک کر کہا ”لیکن میرے پاس زبردست انفریشن ہے، آپ سنیں گے تو ششدر رہ جائیں گے۔“

”میں ششدر رہنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔۔۔ آپ فرمائیے۔“

”یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ایک پہاڑی قصبہ نگر کوٹ نام کا ہے۔ جی کھٹنڈو آتا ہے وہاں ضرور جاتا ہے۔۔۔“

”کیوں جاتا ہے اور وہاں جانے میں کتنے آئی سی کا خرچہ آتا ہے“ سُہری بابا دلچسپی لینے لگے۔

”اس لئے کہ وہاں پہنچنے پر آپ کو عظیم ہمالیائی منظر نظر کے سامنے بچھے برف آتے ہیں۔ اور صبح سویرے جو وہاں کا طلوع آفتاب ہے وہ غضب کا طلوع آفتاب ہے کہتے ہیں کہ اُس کی پہلی کرنیں آپ کی نظروں کے سامنے ایورسٹ اور اناپورنا کی دیوٹیوں پر پڑتی ہیں۔۔۔ تو اس منظر کو دیکھنے کے لئے ایک دنیا وہاں جاتی ہے۔ ہم بھی تو میں شامل ہیں۔۔۔ کیا خیال ہے اگر ہم لوگ کل صبح پانچ بجے نگر کوٹ کے لئے روانہ جائیں، یہ ہوش ربا منظر دیکھیں اور دس بجے تک واپس آجائیں، کیا خیال ہے؟“

”یہ خیال آپ کو بھمایا کس نے ہے؟“

”اُس نیپالی رُپا لڑکی نے جو یونیف کے لئے کام کرتی ہے۔۔۔ سفید ساڑھی ہے اور آپ سب لوگ کانفرنس کے دوران اُسے اُلووں کی طرح تکتے رہتے ہیں۔ اُس کی تنگی کمر کو ایسے تکتے ہیں جیسے وہ کسی چھتے کی کمر ہو۔۔۔ اور اُس کی کمر ہے جی۔۔۔ اگرچہ پیٹ پر چند جھریاں بھی ہیں“

”نہ جی۔۔۔ ہم تو نہیں تکتے۔“ میں نے فوراً احتجاج کیا۔

”سسر۔۔۔ یہ آپ ہم پر کیا الزام لگا رہی ہیں؟“ فاروق نے فوراً میرا ساتھ دیا۔

سُہری بابا نہایت متانت سے گویا ہوئے ”کیا وہ خاتون جو کرپچن کے برابر میں بیٹھی ہیں تو نہایت دل زبا لگتی ہیں اور مسکراتی ہیں تو دو دانت ذرا چھپا کر مسکراتی ہیں کہ وہ ذرا ٹوٹے ہوئے ہیں اور ساڑھی ذرا نیچی کر کے باندھتی ہیں اور اُن کی ناف۔۔۔ ذرا دل نش ہے“

”ہاں ہاں وہی،“ ہمشیرہ خوش ہو گئیں ”آپ نے تو اُن کو دیکھا ہے ناں؟“

”میں نے تو آج تک اُن کی جانب نہیں دیکھا، قسم لے لیجئے۔۔۔“ سُہری بابا فوراً مگر گئے۔

”بہر حال اُس نے مشورہ دیا ہے کہ ہمیں ہر حال میں نگر کوٹ جا کر ایورسٹ پر طلوع آفتاب کا منظر دیکھنا چاہئے۔“

”وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی؟“ یہ فاروق نے پوچھا۔

”کیوں؟“ ہمشیرہ اس سوال جواب سے تنگ آ گئیں۔

”ذرا لوکل ٹیلنٹ ساتھ ہو تو ثقافت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔“

”تو کیا خیال ہے؟“

”کیوں تارڑ صاحب۔۔۔ کیا خیال ہے؟“ خالدہ گمشدہ جن کی موجودگی سے ہم غافل ہو چکے تھے ذرا غفلت کے انداز میں دھیرے سے چپکے سے بولیں۔

”ہم سب کل صبح نگر کوٹ جا رہے ہیں، کشور ہندوستان کی فہیل پر اُبھرتے آفتاب کا نظارہ کرنے۔۔۔ یہ اس وفد کے بزرگ ترین ممبر کا فیصلہ ہے۔۔۔ ایورسٹ میزروٹی کہ۔۔۔ میں نے اعلان کر دیا۔“

”لیکن سسر۔۔۔“ ملک صاحب سرکاری طور پر متوجہ ہو گئے ”اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ اس نگر کوٹ سے نوبے تک واپس کھٹنڈو آجائیں گے کیونکہ کل تو نہایت اہم اور حساس نوعیت کا اجلاس ہے“

”کل کے اجلاس میں کیا ہے جو اہم ہے اور حساس نوعیت کا ہے؟“

”کل ہم بحث کریں گے کہ نینا کے بارے میں جو کتابچہ شائع کیا جائے وہ تین منٹ کا ہو گا یا چار منٹ کا۔۔۔ اور وہ کس جانب سے کھلے گا۔۔۔ اور اس کے ٹائٹل پر نینا کی جو

ابھی خوراک کا مسئلہ حل ہو ہی رہا تھا کہ خالدہ سرگوشی نے ایک سازشی سرگوشی
 ”تارڑ صاحب۔۔۔۔۔“

کی ”مجھے کچھ سنائی دے تو میں سنوں.... ذرا بلند آواز میں بولیں۔“

وہ بلند آواز میں بھی بولیں تو ایسے جیسے کنویں میں گرا اینٹی بولتا ہے۔ ”سنا
 ہے یہاں کہیں قریب ہی نیپالی ٹشمنین کی ایک فیکٹری ہے.... وہاں کھدیاں لگی ہوئی ہیں اور
 ہاتھ سے تیار ہوتا ہے۔ زبردست شاپنگ ہے... آپ نے سنا ہے؟“

”میں نے تو صرف یہ سنا ہے کہ سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں اور سنا
 ہے کہ اُس کی باتوں سے پھول جھرتے ہیں اگر یہ بات ہے تو بات کر کے دیکھتے ہیں اور
 سنا ہے فلک سے اتر کر دیکھتے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ دن کو اُسے تھلیاں ستاتی ہیں اور
 رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں، ہم نے تو صرف اتنا سنا ہے....“

سرگوشی نہایت سرگوشی ہو کر قدرے ڈوٹھ گئیں ”تارڑ صاحب میں تو اس سے
 ہنڑ آپ کی بہت عزت کرتی تھی.... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”یہ میں نہیں میرا ایک عزیز دوست احمد فراز کہہ رہا ہے.... جو کچھ اُس نے
 غزل میں کہا ہے وہ میں نے نثر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔“
 ”نہایت بیہودہ کوشش ہے“

”مجھے شدید اتفاق ہے تو پلیز آپ سنا لیں کہ آپ نے اور کیا سنا ہے“
 ”بس یہی کہ وہاں زبردست شاپنگ ہے تو اگر ہم کل اس نگر کوٹ میں صرف
 ایورسٹ دیکھنے کے لئے ٹائم ضائع نہ کریں اور اُس فیکٹری کا کھوج لگائیں تو میرا خیال ہے
 زیادہ بہتر ہوگا.... پلیز تارڑ صاحب۔ وہاں سے پشینہ کی شال خریدیں گے۔“
 ”ہیں.... آپ ایورسٹ پر طلوع ہوتے آفتابی منظر پر ایک شال کو ترجیح دیتی
 ہیں۔“

ہاں۔۔۔ ”سرگوشی نے صرف ہاں کہا اور کارن فلیکس کھانے لگیں۔

میں بے حد شاکڈ ہوا ”یعنی آپ مکمل سنجیدگی سے یہ ”ہاں“ کہہ رہی ہیں....“

”ہاں.... ایورسٹ کو آپ بعد میں اوڑھ تو نہیں سکتے....“

”خیالوں میں تو اوڑھ سکتے ہیں۔“

تصویر ہوگی اُس میں اُس کی پونی ٹیل کا رنگ سیاہ ہو گیا یا براؤن.... اور اُس کا کپڑا
 طوطا مٹھو کتنی بار ”ٹیس“ کرے گا.... ہم سب کی موجودگی اشد ضروری ہے“
 ”تارڑ صاحب یہ تو طے ہے کہ ہم کل صبح بفضل خدا نگر نگر جائیں گے
 سرگوشی نے سرگوشی کی۔
 ”نگر نگر نہیں.... نگر کوٹ۔۔۔۔۔“

”دی.... میں جانتی ہوں.... جیسے ہمارے ہاں سیا لکوٹ ہے، کوٹ دیجی ہے یا
 کوٹ ہے جہاں اکبر پیدا ہوا تھا.... ایسے نگر کوٹ....“

”وہاں ایورسٹ پیدا ہوگی کل سویرے سویرے۔“
 ”لیکن اس سے پہلے میرا ایک مسئلہ بھی حل کر دیجئے۔“ ”سُہری بلانے نہ
 عاجزی سے وفد کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا ”میری مسلمانی کمزور اور ناتواں ہو رہی۔
 میری پشیمانیت مشکوک ہو رہی ہے۔ میں سبزیوں اور پھکی والوں سے عاجز آچکا ہوں۔
 مجھے نمک منڈی پشاور کا کڑا ہی گوشت چاہئے.... باڑے کے شنواری نکلے اور بخشو بلے
 چپل کباب چاہئیں۔ لاہور کے گردے کپورے اور چانپوں کی کھٹاکٹ کی موسیقی کو
 ترس گیا ہوں.... میرا کچھ کر لیں....“

اور یہ کیفیت ہم سب کی تھی.... ہم سب کا اسلام خطرے میں تھا.... سنا تھا کہ
 نیپال میں پانچ فیصد مسلمان ہیں اور اس شہر کفار میں کہیں کسی کو نہ میں ایک دو ہو کر
 اُن کے بھی ہیں لیکن کہاں ہیں کوئی نہ جانتا تھا۔

ہماری زبانیں پڑمردہ اور نڈھال ہو چکی تھیں اور اُن کے تن مردہ میں صرف
 پاکستانی سائل کا بھنا ہوا گوشت، مٹر قیمہ، گردے کپورے اور تنور کی روٹی ہی جان ڈال
 سکتے تھے۔

مسلمان ہونے کا ایک فائدہ تو ایک خدا تھا لیکن سب سے بڑا نقصان کڑا
 گوشت اور روسٹ چکن کا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں ضیاء صاحب ہم آج کھٹنڈو میں کسی نہ کسی مسلم ریسٹوران
 کا سراغ لگا کر ہی چھوڑیں گے.... اور ہم وہاں طرح طرح کے حلال گوشت کھائیں گے
 ”ویسے آئی سی میں اُن کی کیا قیمت ہوگی؟“ ضیاء صاحب رہ نہ سکے۔

ہوں اور ایک کل پر زہ سُہری بابا بھی ہیں چنانچہ وہ بھی مجبور ہیں کہ کورنش بجالائیں۔
 فاروق کو اپنی صحافتی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔
 سلمان اپنی بین الاقوامی حیثیت کی گرفت میں تھا۔
 اور باقی رہ گئیں ہمشیرہ اور سرگوشی.... اور انہیں میں یہ ہرگز نہیں ہمہ سکتا تھا کہ
 میں ذی ہائیں جھوک ایورسٹ دی نال میرے کوئی چلے....
 میرے نال کوئی نہیں جاسکتا تھا۔

میری سنو جیکٹ اور جو گرز کے ساتھ جانے والا کوئی نہ تھا۔
 جھوک ایورسٹ اور جھوک انا پورنار انجمن کے دیس تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جو
 میرے ساتھ چل سکے۔

سب لوگ ارتقاء کی سیڑھی پر مجھ سے آگے جا چکے تھے اور میں وہیں زکا ہوا تھا
 جہاں سے حیرت فنا ہوتی تھی اور حقیقت جنم لیتی تھی۔

کانفرنس ہال میں میزوں پر کھنیاں جمائے کرسیوں سے ٹیک لگائے.... چھت کو
 نکتے اپنے پیروں کو دیکھتے ہر شخص کی پسند ناپسند الگ الگ تھی۔
 میری پسند تو وہی تین درخت تھے جن کے شگوفے فٹ پاتھ پر گر کر ایک تیز
 تیزاب کی طرح اُس میں چھید ڈالتے تھے.... اور مجھ سے شکایت کرتے تھے۔

البتہ ہم سب.... یعنی نام کے مرد حضرات اُس نیپالی زوپا جوشی دو شیزہ کو نکتے
 جانتے تھے اور بہت دیر تک اُس کے برہنہ پیٹ اور کمر کو نکتے جاتے تھے اور اُس پر جو عمر
 کی ٹکٹیں تھیں وہ صرف تب نظر آتیں جب وہ پہلو بدلتی.... اور یہی شرمیلی زوپا تھی جس
 نے ہمشیرہ کو نگر کوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا.... اور یہ شرمادو شیزہ جب کبھی اپنی احتیاط سے
 باہر آتی اور چہرے کو کسی اور رخ پر کرتی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری عمر سے کچھ زیادہ
 فاصلے پر نہیں ہے اور صرف تازہ ترین کامیونگ، شدید ورزش اور خوراک میں احتیاط نے
 اُسے سنبھالا دیا ہوا ہے.... اور اس کے باوجود اُس کی کمر کی ہڈی، سیدھی اور دلکش تھی....
 اور نائف ایسی تھی کہ چاندنی رات میں بھی وہ تاریک ہوتی ہوگی۔

کانفرنس میں اُنہی حساس اور نہایت اہم موضوعات پر تفصیلی گفتگو ہوئی جس کا

”پلیز گرو آپ تار صاحب....“

”میں جتنا گرو کر سکتا تھا کر چکا۔ اب مزید گنجائش نہیں“ سب لوگ
 بے حد مایوس ہو رہے تھے.... میری ذہنی نشوونما کسی ایک مقام پر آکر ڈک گئی تھی۔
 ارتقاء کی کسی ایک سیڑھی پر آکر تھم گیا تھا صرف اس لئے کہ اس سے آگے جیز
 ہوتی تھی اور حقیقت شروع ہو جاتی تھی.... اس سے آگے ایک شمال ایورسٹ سے
 اہم ہو جاتی تھی۔

ریستوران سے باہر فوارے پر اب ڈھوپ پوری طرح اتر چکی تھی۔ اُن
 پانی ایسے اُلتے تھے جیسے وصال کے پانی بے اختیار اُلتے ہیں....

میں نے اُن حیرتوں کے بارے میں سوچا جن کے لئے میں نے زندگی گوارا
 اُن حیرتوں نے بہت سارے خطوں پر پرواز کی.... کوہ آرات۔ جھیل جینوا۔ فرط
 شاموں اور سویڈن کے جنگلوں.... روم۔ ارض روم۔ فرانس۔ ہرات۔ شاہ گوری
 پریت اور جھیل کرومپر پرواز کی.... لیکن خواہشوں اور حیرتوں کے اس قمار خانے
 میں ہمیشہ ایک ہارا ہوا جاری تھا۔

جو میں جیتنا چاہتا تھا وہ نہ جیت سکا....

اور جو ہارنا چاہتا تھا وہ نہ ہار سکا....

فوارے کے سارے پانی چھاؤں سے آزاد ہو کر تیز دھوپ میں آچکے تھے۔
 میرے ساتھیوں میں سے کون ہے جو میری ایک اور حیرت کا سلمان بن
 ہے.... میرا ساتھ دے سکتا ہے۔

اس قید کھنڈو سے رہا ہو کر کشور ہندوستان تک میرے ساتھ مل سکتا ہے۔
 سُہری بابا.... انہوں نے بہر صورت اسلام آباد ٹیلی ویژن ہیڈ کوارٹر پہنچانا
 وہاں پہنچ کر وہی کرنا ہے جو حکومت وقت چاہتی ہے۔
 حکومت وقت.... ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہے۔

وہ سیکور ہو، سوشلسٹ ہو یا اسلامی.... وہ مکمل تابعداری اور اطاعت چاہتی ہے۔
 یوں اُن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا.... وہ کسی نہ کسی کا حق پانمال کرتی ہے۔
 ان حقوق کو پانمال کرنے کے لئے ہمیشہ میڈیا استعمال ہوتا ہے جس کا ایک پڑزہ ملتا

تذکرہ ملک نے ناشتے کی میز پر کیا تھا۔

نینا بروشر کے صفحے کتنے ہوں گے، تین ہوں گے یا چار ہوں گے، اور وہ
جانب سے کھلے گا اور نینا کی پونی ٹیل کا رنگ کیا ہو گا.... اور طوطا مٹھو کتنی بار
کرنے گا۔

اور میں چونکہ توبہ تائب ہو چکا تھا اور اختلاف کو رد کر کے اتفاق پر اکتفا
تھا اس لئے میرے لئے کرپچن اور میری این کی جانب سے صرف مسکراہٹیں
پر شفقت ہمت افزائی اور نیٹو کے لئے صرف شاباش تھی۔

لیکن کانفرنس ہال کی اندھی کھڑکیوں کے پار میرے وہ تین دوست تھے؟
میں دیکھ نہیں سکتا تھا....

وہی کسک اور محرومی تھی.... حیرت کی سیڑھی پر رُکے ہوئے میں پوچھتا تھا کہ
یہاں کیا کر رہا ہوں؟

لنچ بریک ہوئی....

کرپچن نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کسی پرائمری سکول
ٹیچر کی طرح اُننگی اٹھا کر ہم نادان بچوں کو ہدایت کی ”پوسٹ لنچ سیشن پورے دو
شروع ہو جائے گا.... خبردار کوئی ڈیلی گیٹ دیر سے نہ آئے....“

میں گیس چیمبر سے فرار ہونے والے کسی یہودی کی طرح کانفرنس ہال سے
آیا اور ریسٹوران کی جانب رخ کرنے کی بجائے پورچ میں آکر ایک گہرا سانس لیا۔
ایک اور تھاپا نام کے ٹیکسی ڈرائیور سے گفت و شنید کی اور دھو کا دربار کی جا
روانہ ہو گیا....

دن کی روشنی میں وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔

اُس کی پہچان سرشام تھی....

جیسے ایک شراب خانہ میں ملنے والی.... اُس سے مس یونیورس دکھائی دیتی
اور اگلی صبح پہچانی نہیں جاتی....

بسنت چوک دھوپ میں سفید ہو رہا تھا....

کمار کی کامندر پنجاب کی تپتی ہوئی دوپہر میں کوئی ایمن آباد کی ہندو حویلی تک

جس میں کوئی فریب، کوئی کشش نہ تھی، اُس کے اندر لونگ گاڈیس بھی ادنگھ رہی ہوگی....
بسنت چوک کے پہلو میں جو بازار تھا.... جہاں میں نے ایک کھڑکی میں جھکتی
سات ایت دو شیزہ کو اپنے نیپالی بوائے فرینڈ کے سامنے چہرہ فروغ سے گلزار کئے
ہوئے دیکھا تھا اور ایک عمر رسیدہ ٹائٹ کی حیثیت میں ”ہیلو“ کہا تھا.... اُسی کھڑکی کے نیچے
ایک ٹریول ایجنٹ کا بورڈ تھا.... ”دیوتاؤں کی سلطنت میں آپ جہاں جانا چاہتے ہیں ہم وہاں
آپ کو پہنچا سکتے ہیں....“ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا، ”ڈو ٹو سپیک انگلش؟“
مخنی نیپالی ٹریول ایجنٹ نے میرے گندی رنگ کو دیکھ کر کہا ”آئی سپیک ہندی
ہو“

”آئی سپیک اُردو....“

”فرام انڈیا؟“

”نو.... فرام پاکستان۔“

”پاکستان۔ کالفظ کچھ دیر کے لئے ہر نیپالی کو سنانے میں لے جاتا تھا.... وہ بھی کچھ
دیر اس سنانے کے سکوت میں گیا اور پھر ہوشیار ہو کر کہنے لگا۔ ”ایک ہی بات ہے۔“

”نہیں۔ ایک ہی بات نہیں ہے۔“

”سوری....“ اُس نے ”سوری“ صرف اس لئے کہا کہ اُس نے کاروبار کرنا تھا
اور نہ اب بھی مجھے ایک ہی بات سمجھتا تھا ”میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“

”میں اس شہر سے نکلنا چاہتا ہوں.... تو کس جانب نکلوں؟“

اُس نے پاکورہ، نگر کوٹ اور بھگتا پور کے نام لئے....

”اور ان سے پرے....“

”ان سے پرے تو جیتن نیشنل پارک ہے۔ صرف چند گھنٹوں کا سفر ہے.... آپ کا
قیام نہایت آرام دہ گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں ہو گا.... اگلی صبح آپ ہاتھیوں کو جھیل
میں نہاتے ہوئے دیکھیں گے.... پھر آپ ہاتھیوں پر سوار ہو کر جیتن پارک کے قد آدم
کرکندوں میں سفر کرتے سفید گیندوں کو دیکھیں گے....“

”تقریباً کتنے گیندے؟“

”بہت سارے....“ وہ مخنی نیپالی شاید اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔

اور ”بھائی تیرے پاس جو کیس ہیں؟“
 ”آہو۔“ وہ کہتا.... اور وہ ایک عجیب نرا سرسرا سپیرا سا شخص ہوتا جس کی پگڑی
 اُس کی آنکھوں پر آئی ہوتی اور آنکھوں کے فوراً بعد اُس کی مونچھیں شروع ہو جاتیں
 اور پگڑی پر ایک کچا کچا سا اٹھایا ہوتا جس کے گلے کو ایک ٹائی سے باندھا ہوتا جیسے مظہر
 باندھتے ہیں....

”تو آ جا میرے بے بے جی تجھے بلاتے ہیں.... وہ دھریک والے نمبرداروں کے گھر
 میں....“

”اچھا....“ وہ دیر تک سر ہلاتا اور اس کے ساتھ اُس کی پگڑی اور پگڑی پر
 براتھان کُچا بھی ہلتا اور کُچے کا مظہر ہوا میں لہراتا.... ”نمبرداروں کے گھر سے آئے ہوناں....
 میں پہلے بھی چودھرائی کو جو کیس لگا چکا ہوں..“

میرے بے بے جی کو سردیوں میں ہمیشہ پنڈلیوں پر بے پناہ خارش ہوتی اور وہ
 دھوپ میں بیٹھی اُن پر سروسوں کا تیل لگا کر اُن پر ماش کرتی رہتیں اور کبھی بے بس ہو کر
 انہیں اتنا کھجاتیں کہ خون کی خراشیں نمودار ہو جاتیں... حکیم کہتے تھے یہ چنبل ہے اور
 اطلاع ہے۔

جو کال والا بھائی دھریک والے ویٹھے میں داخل ہوتا تو نظریں جھکا کر کہتا
 ”چودھرائی مکھن کا پڑھ لے آؤ پورے کا پورا“

میری بڑھی نانی اماں خالی چائی میں ستور شدہ مکھن نکال لاتیں اور پھر خود ہی اپنی
 پنڈلیوں پر اُس کا لیپ کرتیں، اس دوران وہ بھائی کُچے کا منہ کھول کر اُس کا مظہر اتار کر
 اُس میں ہاتھ ڈالتا اور ایک ریڑنما لہجی سی شے برآمد کر کے اُسے ایک سکاچ ٹیپ کی طرح
 کھینچ کر سیدھا کرتا اور بے بے جی کی پنڈلی پر چسپاں کر دیتا.... پھر ایک اور.... یہاں تک کہ
 بے بے جی کی پنڈلی پر تقریباً درجن بھر جو کیس چپک جاتیں....

وہ بھائی پوچھتا ”بی بی حقہ ہے؟“ بے بے جی کہتیں ”اس گھر میں تو کوئی نہیں
 بیٹا ساتھ والے گھر میں بھائی جہان خان کے پاس ہے لیکن وہ کسی کو اپنے حقے کو منہ
 لگائے نہیں دیتا۔ تم جا کر کہنا بہن فاطمہ نے بھیجا ہے“

”سفید گینڈوں کی تعداد کتنی ہوگی؟“

”آپ کتنے گینڈے دیکھنا چاہتے ہیں؟“

”کم از کم درجن بھر گینڈے تو ہوں.... میں ایک مشہور شخص ہوں میرے لیے
 چار گینڈے کافی نہیں ہوں گے....“

”ہم اپنی بہترین کوشش کریں گے سر.... کل سویرے ہماری لگژری کوچ
 بسنت چوک سے روانہ ہوگی۔ آپ آجائیں۔ دو روز کے قیام اور سفر کے اخراجات
 کی سواری اور سفید گینڈوں کے لئے صرف چالیس ڈالر....“
 واقعی صرف چالیس ڈالر میں اگر ایک ہی سفید گینڈا دیکھنے کو مل جائے تو یہ
 منگانہ تھا.... ”اور یورسٹ؟“

”ایک گھنٹے کا ہوائی سفر بدھا ایئر لائن پر.... پھر چار روز کا ٹریک ایورسٹ
 دامن تک.... اور ان دنوں آپ کے بدن کو جو کیس بھی نہیں چھینیں گی اور آپ کا
 نہیں پیئیں گی کیونکہ ابھی برسات کا موسم نہیں ہے....“

”میرا خیال ہے کہ میں جو کوں کو مانڈ نہیں کروں گا.... بے شک میری ٹانگوں
 چٹ جائیں.... میں اُنہیں مانڈ نہیں کروں گا....“
 منحنی نیپالی نے حیرت کی اداکاری کی....
 نصف صدی گزر چکی ہے۔

جب میری ستواں ناک، باریک ہونٹوں والی، دودھیا سفید رنگت والی، عمر
 ساتھ سکتی ہوئی.... روزانہ خود نلکا گیز کر نما کر اپنے سفید بالوں میں سروسوں کا تیل لگا
 نہایت ستھری اور شفاف نانی جان کُچے کوٹھے کے صحن میں دھریک کے درخت کے
 ایک چارپائی پر بیٹھی بال سنوارتی تھیں تو گلی میں سے.... کسی گرم دوپہر کی خاموشی
 ایک آواز آتی تھی....

”جو کال.... لوالو.... جو کال....“

اور وہ مجھ سے کہتی تھیں ”متنی.... اس جو کال والے بھائی کو بلا لو.... شاد
 میرا سوہنا پتر“ اور سوہنا پتر اپنی بے بے جی کو دھریک کے سائے میں چھوڑ کر گلی میں
 اور ڈڑکی لگاتا ہوا جو کال والے بھائی کو مسجد کے قریب جا مخاطب کرتا.... سانس چڑھا

بھائی چلا جاتا.... اب میں ہوتا۔ بے بے جی کی پنڈلی پر چپکی جو کس ہوتی۔ سردیوں کی دھوپ ہوتی۔

آہستہ آہستہ وہ جو کس خون چوس چوس کر پھولنے لگتیں۔ پھر پھول کر پھول جاتیں اور آخر اُن کی ذموں میں سے خون رسنے لگتا.... بھائی حقے کا کش لگا کر دوا پھولی ہوئی جو کوں کو نہایت محبت سے دیکھتا اور کہتا ”چودھرائی سارا گندا خون کھینچ رہا ہے.... اور اس کے ساتھ چنبیل خارش بھی....“ پھر وہ اپنی جو کوں کو احتیاط سے اُٹا اُٹا نہیں تھوڑا سا نچوڑتا اور اپنے کُتے میں رکھ کر اُس کے گلے میں مظہر بانٹھ دیتا۔ بے بے جی پھیلی کوشٹری کے کپتے بھڑولے میں سے دو ٹوپے نکال کر اُس کی ہانسی ہوئی چادر میں اُنڈیل دیتیں اور وہ اُسے سمیٹ کر گُٹا سر پر رکھ کر خوشی خوشی چلا جاتا۔ فاسد خون اور مادے کے اخراج کا یہ ایک آسان اور بلا تکلیف نسخہ تھا.... بے بے جی پوری سردیاں پھر کھلی کرنے اور سروسوں کے تیل کی مالش کرنے کی حاجت نہ ہوتی۔ ان دنوں جب بے بے جی کو گذرے ہوئے صدیاں گزر چکیں.... موسم رہا

آغاز میں میری پنڈلیوں پر بھی ہلکی خارش ہوتی ہے.... شاید یہ جینز کا تسلسل ہے.... جو اوالے بھائیے کب کے پنجاب کی ثقافت سے معدوم ہو چکے.... جو کالیاں کے ایک چمچڑا سے گزرتے ہوئے بچپن میں ایک بار میری ناگوں کے ساتھ بھی جو کس چٹی تھیں۔ صرف ایک ہلکی سی جلون تھی اور پتہ تب چلا جب سفید کھیس پر میرا خون رسنے لگا۔ اب یہ منحنی نیپالی مجھے جو کوں سے ڈراتا تھا۔ بلکہ مجھے برسات کے دنوں میں ہی نیپال چاہئے تھا تاکہ میں اس کے جنگلوں میں پائی جانے والی جو کوں کو اپنی پنڈلیوں پر چبا کر کے اپنی خارش سے نجات حاصل کر سکتا....

نصف صدی گزر چکی تھی جب میرے بے بے جی نے مجھے بھائی جو کال والے بلانے کے لئے بھیجا تھا....

منحنی نیپالی نے حیرت کی اداکاری کی تھی جب میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں جو کوں کو مانڈ نہیں کروں گا....

”بہر حال.... کیا آپ مجھے کسی گروپ کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکتے ہیں، جو ایورسٹ کے بیس کیمپ تک جا رہا ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں.... پرسوں ہمارا ایک کورین گروپ روانہ ہو رہا ہے.... آپ اُن کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں.... کل اخراجات.... اتنے ڈالر ہوں گے....“

میری جیب میں اس سے کہیں زیادہ ڈالر تھے....
ڈالر کوئی پرابلم نہ تھے.... لیکن میں پرابلم تھا.... میری عمر پرابلم تھی۔
میں عمر کے اُس حصے میں تھا جب گھر سے دور ہوٹل کے کسی کمرے میں تنہا رہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے.... رات کو کہیں کچھ ہو نہ جائے.... کابل کے اُس ہوٹل کی طرح جہاں ایک ہتی مر گیا تھا اور اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک اجنبی سرزمین کی اجنبی تاریک وادیوں میں تنہا داخل ہوتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ ساتھی کیسے ہوں گے.... یہ کورین کون ہوتے ہیں اور کونسی زبان بولتے ہیں.... میں اُن کا ساتھ دے سکوں گا یا نہیں.... غیر دوست بلندیوں پر اُن سے پیچھے رہ جاؤں گا تو وہ میرا انتظار تو نہیں کریں گے.... خوراک کیسی ہوگی.... رات کیسی ہوگی.... اور وطن سے دُور اگر بیمار پڑ جاؤں تو نذراری کون کرے گا....

اُس کھڑکی میں.... جس میں ایک سُہری بالوں والی حسینہ کا خمیر زدہ چہرہ جھانکتا تھا بکولی نہ تھا.... دھوکا دہار کے ہنومان جی سورج کی تپش سے کچھ مرجھا چکے تھے اور اُن کی اُڑ میں وہ دم خم نہ تھا.... جگن ناتھ مندر کے وہ اشتعال انگیز مجسمے جو سرشام گذشتہ دن کی پرچھائیاں لگتے تھے اب کڑی دھوپ میں مضحکہ خیز لگتے تھے۔

یہاں تک کہ کماری کے مندر کا دروازہ بھی مقفل تھا....
میرے اندر یہ خدشہ مسلسل تھا.... بلکہ یقین تھا کہ میں ایورسٹ کے بیس کیمپ تک نہیں جاسکوں گا.... لیکن میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا تھا کہ میں ارتقاء کی اُس بڑی پروک گیا تھا جس کے آگے حقیقت کی سلطنت تھی.... میں نے حقیقت کی سلطنت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ”سوری میں ایورسٹ تک نہیں جاسکتا.... ممکن نہیں ہوگا....“

یہاں تک کہ کماری کے مندر کا دروازہ بھی مقفل تھا....
میں نے منحنی نیپالی ٹریول ایجنٹ کے چہرے پر مایوسی کی جھلک کا آغاز دیکھا اور منحنی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔
باہر ایک اور تھپا ٹیکسی ڈرائیور تھا جو مجھے واپس ہوٹل سولتی ہائیڈے اِن لے گیا۔

قد آدم تھے۔
 گئے وقت ایسے بھی تھے جب یہ آئینے حیرت سے ہمیں دیکھتے تھے اور ہم دیکھتے
 تھے کہ کونسا زاویہ بدن ایسا ہے جس میں دل ربائی نہیں.... اور ایک بھی زاویہ ایسا نہ ہوتا
 تھا اور اب ان وقتوں میں ہم آئینوں کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور انہیں کہتے تھے کہ اے
 بچے تو جھوٹ بولتا ہے.... یہ جو ڈھلتے ہوئے بدن کا عجیب بے ڈھنگا اور بوڑھا شخص ہے
 جس کا کوئی زاویہ بدن ایسا نہیں جسے ایک بار دل پہ پتھر رکھ کر دیکھنے کے بعد دوسری بار
 دیکھنے کی تمنا کی جاسکے.... یہ میں تو ہرگز نہیں ہوں.... ٹریک سوٹ کے ٹراؤزر بمشکل میرے
 دہانے پر ٹھہرتے تھے اور جیکٹ کی زپ بے سروپا سراپے کو ڈھکنے سے انکاری ہو کر
 الجھتی جاتی تھی.... یہ میں تو نہیں تھا۔

ایک زمانے میں ہم قد آدم آئینوں میں اپنے آپ کو ٹھہر کے دیکھتے تھے اور اب
 اٹھ چڑا کر چپکے سے نکل جاتے تھے.... ہم جب خوش شکل تھے تو ز گیت پسند ہونے
 کے طغیوں کے باوجود کہتے تھے کہ ہاں ہم خوش شکل ہیں، اور اب اگر بد شکل ہو چکے ہیں تو
 اسی قرار کرتے ہیں....

بدن کی اس شکستگی اور عمر کے موہنجو ڈارو کھنڈر کے باوجود.... دل کو خبر تک نہیں
 دلتی.... دل کو یا ہر انسان کے اندر جو ایک فریب ہے جو ایک بستی ہے اُسے خبر نہیں ہوتی
 کہ باہر زمانے بدل گئے ہیں.... سکتہ تبدیل ہو چکا ہے.... اور اُس فریب اور بستی میں وقت
 کارہتا ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلتا.... وہاں ابھی تک یہی یقین ہے کہ فنا آئے گی تو مجھے
 نہیں آئے گی ہر ایک کو اس جہان فانی میں آئے گی مگر مجھے نہیں آئے گی.... وہ انہی
 بوسوں میں رہتا ہے جب ہر بلخ راج ہنس نظر آتی ہے اور ہر درخت اب بھی سرسبز نظر
 آتا ہے.... اور اسی لئے اب بھی عمر کے اس زوال میں جب اختتام نزدیک آجاتا ہے اور
 آواز بہت دور رہ جاتا ہے جب وہ کسی بھی راج ہنس کو دیکھتا ہے تو بدن کی شکستگی آڑے
 نہیں آتی.... آرزو اور اشتیاق ہر درخت کو سرسبز دیکھتے ہیں اور اُن کی تمنا کرتے ہیں....
 راج ہنسون کی بھی، اور سرسبز درختوں کی بھی۔

چنانچہ میں نے قد آدم آئینے میں جو کچھ نظر آ رہا تھا اُس پر لعنت بھیجی اور عمر
 کے کھنڈر سے نظرس چڑا کر اُس بستی کا باسی بن گیا جس میں وقت، ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔

کانفرنس ہال میں مندوبین نہایت گرم جوٹی سے بحث کر رہے تھے کہ
 بروشر تین صفوں کا ہونا چاہئے یا چار صفوں کا....

اگرچہ میں اس نینا کردار کی برکت سے نیپال میں تھا لیکن اُس کی وجہ
 کانفرنس ہال کی قید میں بھی تھا اور دُنیا کے بلند ترین مقام کے دامن کو چھونے کی آرزو
 خاک کرتا تھا۔

میں اپنے سامنے رکھے آفیشل پیڈ پر حسب معمول طوطے چڑیاں بناتا رہا
 اُدگھتا رہا....

سُہری بلانے میری دل گرفتگی اور بچھے ہوئے چراغ تمنا کے دھوئیں کو
 کیا اور مجھے تسلی دی ”تارڑ صاحب رنجیدہ ہونے کا مقام نہیں ہے.... میں آج کی
 آپ کو وشال مرگ لے کر جاؤں گا.... آپ خوشی سے نڈھال ہو جائیں گے“
 ”کیا یہ وشال مرگ.... مرگ ناگمانی قسم کی چیز ہے“

”یہ کھنڈر کا جدید ترین امیر یا ہے.... آپ دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔
 ”دھو کا دربار کے آس پاس ہے؟“

”نہیں جی.... اُن مندروں اور بھگوانوں سے پرے ایک ایسا زبردست علاقہ
 کہ.... آپ دنگ رہ جائیں گے....“

چنانچہ میں نے سیمینار کی پوری دوپہر.... اس آس میں گزار دی کہ شام کو
 دنگ رہ جاؤں گا.... بالآخر شام ہوئی.... کانفرنس کے قیدی آزاد ہوئے اور نڈھال
 اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میرے کمرے کی کھڑکی کے فریم میں وادئی کھنڈر
 تصویر جڑی تھی اُس میں ابھی تک کہیں کہیں دھند تھی اور ایورسٹ تک پہنچنے کے
 کے شیشے کی کڑیاں اُس دھند کی سفیدی میں مرتے ہوئے جگنوؤں کی طرح روشن
 تھیں، ایک ایک کر کے بجھتی جاتی تھیں....

ان میں سے ہر کڑی ایک اُمید تھی جو بجھتی جاتی تھی۔
 میں نے اپنے جاگڑ پنے۔ وہ ٹریک سوٹ پہنا جو میں ایورسٹ کے زپ
 لئے خصوصی طور پر خرید کر لایا تھا اور اپنے آپ کو ہاتھ روم کے اُن آئینوں میں

میں نہیں جانتا کہ اُس لمحے سُہری بابا نے اپنے ہاتھ روم کے قد آدم اُگڑے اپنے آپ کو دیکھ کر کیا پوچھا۔
فاروق کو کیا خیال آیا۔

اور ہمیشہ صاحبہ کے بارے میں اس قسم کی انتہائی لغو بات سوچنا ہی گزرتی تھی۔ لیکن گمشدہ سرگوشی نے یقیناً آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ہوگا آئینے اے آئینہ میرے سندھی لباس کو نظر نہ لگا، صرف یہ بتا کہ کھٹمنڈو کی بہترین شاپنگ کہاں ہے؟

”انانپورنا کے پجاری... بُدھ کے بیوپاری اور کھٹمنڈو کی گلیاں“

میں نے اپنے آپ کو جوگرز اور ٹریک شوٹ کے فریب سے آزاد کیا اور ایک بین الاقوامی کانفرنس کے معزز مندوب کی طرح ایک باقاعدہ لباس پہنا اور کمرے سے نکل کر نیچے ہوٹل کی لابی میں آگیا۔ قد آدم آئینوں نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا.... صادقین نے ”نکلے تیری تلاش میں“ کو مصور کرتے ہوئے مجھے ایک رباعی لکھ کر دی تھی کہ ان آئینوں میں کون ہے.... بس تو ہی تو ہے.... تو لابی کے ان قد آدم کینے آئینوں میں بس میں ہی میں تھا اور ایسا تھا جیسے گندم کی ایک اور ویٹ بوری کو جین اور ٹی شرٹ پہنا دی جائے.... یہاں بھی ان جھوٹے اور مکار آئینوں پر میں نے اعتبار نہ کیا اور اُسی بستی پر اعتبار کیا جس میں وقت ٹھہرا ہوا تھا.... اور میں جھیل جنیوا کے کنارے، اُس کے جٹ فوارے کی قربت میں ایک سوس سمر کی نرم دھوپ میں صرف ایک نیلی جین میں جیبوں میں ہاتھ اُڑ سے کھڑا تھا اور میرا پیٹ یقیناً کسی بھی سنوٹائیگر کی نسبت جو واڈی سوختر آباد میں کسی آبشار کی پھوار میں بھیگتی گھاس میں لوشیاں لگاتا تھا، زیادہ ہموار تھا.... بلکہ اُس نیپالی شرما حسینہ کے پیٹ سے کہیں زیادہ کسا ہوا تھا جس کی تنگی کمر کو اہل دانش حسرت دیاس سے تکتے تھے....

پیٹ سے مجھے یاد آیا کہ اپنی ملکہ ترنم نور جہاں ایک زمانے میں اپنے ہر گانے کا نغمہ پیٹ کے حوالے سے یاد رکھتی تھیں۔ مثلاً....

”جب میں نے ’آواز دے کہاں ہے.... گایا تھا تو اکبر میرے پیٹ میں تھا۔“
 ”منڈیا سیالکوٹیا.... گایا تو ماشاء اللہ اصغر میرے پیٹ میں تھا....“
 ”اور جب میں نے ’دل کا دیا جلایا میں نے.... گایا تھا تو ظل ہما....“
 اس پر بابا چشتی نے اپنا گنج گراں مایہ کھجا کر پوچھا تھا اور صرف وہی پوچھ سکے تھے
 کہ ”میڈم کبھی آپ نے خالی پیٹ بھی گایا ہے؟“
 ہوٹل سولتی کے لاؤنج میں بلانی منزلوں سے اترتی لفظوں کے منہ حیرت
 دریائی گھوڑوں کی طرح کھلتے گئے اور ان میں سے میرے ساتھی برآمد ہونے لگے۔
 سب سے اول اقل سُہری بابا برآمد ہوئے.... اور سیدھے آئینوں کی جانب پڑے
 گئے.... انہیں ہاؤ ڈو ڈو ڈو کہا.... اور پھر ان میں اپنی شبیہ مبارک پہچان کر پشیمان ہوئے
 اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میری جانب آگئے۔
 ملک برآمد ہوئے.... قدرے فکر مند، کچھ لاتعلق.... ایک ایسے روشے ہوئے پڑے
 کی طرح جسے آئس کریم نہیں ملی تھی۔
 کچھ لمحوں بعد ایک اور لفٹ نیچے آئی اُس کا منہ بھی حیرت زدہ دریائی گھوڑوں
 کی مانند دا ہوا اور اُس میں سے گمشدہ برآمد ہو گئیں، ایک ڈشنگ ڈریس اور اُس کے
 ساتھ میچ کرتی ہوئی لپ سنک میں....
 سب سے آخر میں ہمشیرہ صاحبہ کا ورود ہوا.... براہ راست آئینوں تک چلی گئی
 انہیں دیکھ کر تادیر مسکراتی رہیں اور پھر یکدم سنجیدہ ہو کر اپنے بیگ میں سے ایک اور
 عینک نکالی جو بقول اُن کے زیادہ فیشن ایبل تھی.... اور کانفرنس اینڈ کرنے والی دیواروں
 عینک اُتار کر اُسے پن لیا اور قدرے خوشنما سی ہو گئیں، ”ہم نے ابھی تک دھوکا دیا
 متعدد بار دھوکا کھایا ہے جب کہ کھنڈو میں پتن بھی ہے۔“ انہوں نے اعلان کیا۔
 ”لنگھ آجا پتن چنماں دا اویار.... والا پتن....“ فاروق جانے اپنے کمرے میں گیا
 پی کے آیا تھا۔
 ”نہیں بھی.... نیپال بھر میں کوئی سوہنی ایسی سوہنی نہیں ہے جس کے لئے
 دریائے چناب پار کرنے کا خطرہ مول لیا جاسکے.... یہ پتن ایک اور ٹپل کامپلیکس ہے“
 ہم سمجھتے تھے کہ یہ کامپلیکس وغیرہ صرف سگنڈ فرائڈ کے ہاں ہی پائے جاتے تھے۔

اور ایڈاپس کامپلیکس کے بعد کسی اور نئے کامپلیکس کی گنجائش نہیں لیکن کھنڈو میں آکر
 ڈوم پتہ نہیں سن سکن ہنومان کامپلیکس اور کماری کامپلیکس میں جتلا ہو گئے تھے ”نہ جی
 مزید مندر اور مزید بندر ہم نہیں دیکھیں گے.... صرف وشال مرگ.... آج کی شب....“
 ”اور آج کی شام بلکہ آج کی شب سازِ دل پُر درد نہ چھیڑ.... آج کی شب....“
 فاروق یقیناً ایک بلند مہڈ میں تھا....
 ”فاروق آپ سازِ دل پُر درد کی ذہن پر جب آپ وشال بازار دیکھے گا تو دنگ
 رہ جائیے گا کھنڈو کا جدید ترین شاپنگ ایریا....“ سُہری بابا نے ایک معزز گوریلے کی طرح
 اپنے سینے پر ہلکا سا مگ مار کر کہا۔
 ”شاپنگ ایریا....“ گمشدہ ایسے بیدار ہوئیں جیسے اصحاب کف صدیوں کی نیند کے
 بعد یکدم بیدار ہوئے تھے ”وہیں چلتے ہیں تارڑ صاحب۔۔۔“
 اور گمشدہ جس نیند بھرے انداز میں ”وہیں چلتے ہیں“ کہتی تھیں تو جی چاہتا تھا
 کہ بس وہیں چلتے ہیں۔
 ”آپ راستہ تو جانتے ہیں نا سُہری بابا؟“
 ”مجھے پوچھ رہے ہیں کہ راستہ جانتے ہیں.... منہ مزبانی یاد ہے جناب۔ اب آپ
 میرے پیچھے پیچھے چلتے آئیں میں آپ کو وشال بازار لے چلوں گا....“
 ”کہیں یہ دھوکا دربار کے قریب تو نہیں....“ ہمشیرہ نے ایک مرتبہ پھر تشویش کا
 اظہار کیا۔
 ”کہاں دھوکا دربار اور کہاں وشال مرگ.... آپ کیا بات کرتی ہیں ہمشیرہ.... بس
 چلے آئیے“
 جب ہم سب ایک معزز ریوڑ کی صورت میں ہوٹل کی لابی سے باہر آئے اور
 ہمیں گورکھا دربان نے بیسویں مرتبہ ”نمستے“ کہا تو ایک مرتبہ پھر ہمیں بہت رنج ہوا۔
 بہت قتل ہوا کہ ہم بیوقوف ناقص عقل کے ہومو سپین اس ہوٹل سولتی کے اندر کیا کر
 رہے تھے.... کیونکہ باہر جو ہوا تھی وہ یقیناً ایورسٹ اور اناپورنا سے لپٹ لپٹ کر آتی تھی
 اور اُس میں وہی برفانی کنوار پن تھا.... وہی عیسیٰ تھا جو عمر کے مُردہ کھنڈروں کو ایک
 بوٹک سے زندہ کر دینے پر قادر تھا۔

”آپ میرے بزرگ ہیں.... بلکہ بزرگ تو نہیں کیونکہ میرے بزرگوں میں سے کسی کی بھی داڑھی سُہری نہیں تھی۔ بہر حال آپ میرے سینئر ہیں لیکن آپ کے پیچھے آنے میں کچھ تاریخی خدشات ہیں....“

”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ آج تک جس ضیاء نے بھی ہم سے زاہری قبول کروائی ہے اُس نے ہمیں کسی نہ کسی آفت میں ہی مبتلا کیا ہے۔“

”ہم اور قسم کے ضیاء ہیں۔“ سُہری بابا نے زرا ناراضگی سے کہا۔
ہوٹل کی سیٹ سے باہر آکر ہم نے حسب معمول دو ٹیکسیاں مول تول کر کے مل کیں اور روانہ ہو گئے۔

ضیاء، ملک صاحب اور گمشدہ ہمارے پیچھے پیچھے ہارن بجاتے چلے آ رہے تھے اور اُفارتق اور ہمیشہ اُن کی ہدایات کے مطابق آگے آگے چلے جاتے تھے۔

کھٹنڈو کی شام میں.... بھاگ متی اور دشنومتی دریاؤں کے پار ہم ایک اور قسم ضیاء کی سربراہی میں اپنے تئیں منزل کو سفر کرتے تھے۔

جب ہماری ٹیکسی نے ایک پُل عبور کر کے جدید شہر سے مُنہ موڑا اور ایک لوان پر ہو کتی ہوئی چڑھ کر کھٹنڈو کی تنگ اور قدیم گلیوں میں مسلسل ہارن بجا کر اپنی راہ بٹو بٹو بچو بچو کی پکار کی تو ہمیشہ اپنی ٹرانس سے باہر آ گئیں ”تارڑ صاحب.... یہ تو راستہ ہے“

”کونسا راستہ وہی ہے؟“

”جو دھوکا دربار کو جاتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی ایک سوئڈھ والے بھگوان کو دیکھا ہے۔ ہم نے پرسوں بھی دیکھا تھا۔“

”بھگوان طرح طرح کی قسموں کے ہوتے ہیں ہمیشہ.... ہو سکتا ہے اس بھگوان کا لٹھ اتنی لمبی نہ ہو جس بھگوان کی سوئڈھ آپ نے پرسوں ملاحظہ کی تھی....“

”ابھی ابھی ایک ہولناک دیوی بھی گزری ہے جس کی چرنوں میں دیئے جلتے“

”کتے دیئے جلتے تھے؟“

باہر چری، صوفوں پر دو تین سردار صاحبان دھرے تھے.... اس لئے کہ وہ نماز شب میں مبتلا وہاں بیٹھ تو گئے تھے اور ٹھنڈی ہوا لگنے سے مزید سرد ہوئے۔ باعث اٹھنے سے اُٹھے نہ تھے.... اور میں.... اپنی سردار سائیگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن کی جانب لپکنے کو تھا کہ گمشدہ نے کہا ”تارڑ صاحب.... آج کی شب سرداروں کو رہنے دیکھ سردار بہت ہو گئے ہیں“

جیسے ایک محفل میں فریدہ خانم نے دختر اقبال منیرہ کی موجودگی کو باعث افتخار بنا اور یکے بعد دیگرے نہایت خوبصورتی سے پلو ڈھلکاتی اور پھر اُسے سنبھالتی کلام اقبال کا چلی گئیں۔ عرصہ ذرا طویل ہوا تو منیرہ نے فریدہ سے کہا ”فریدہ جی.... اتنا جی بہت ہو گئے ہیں، ہُن کسی جُتی قصوری آوے نہ پوری ہائے ربا مینوں چلناں پیا.... سنا دیو“

چری صوفوں والے اوپن ایئر لاونج سے اُتر کر ہم اُس راہ پر ہوئے جہاں سُہری زیورات اور ہیروں کی چمک دمک والی دوکانیں تھیں اور ان کے راستے میں میرے تین دوست کھڑے تھے....

اُن کے بدن گلابی اور سُرخ شگوفوں سے بھرے ہوئے تھے.... جیسے ایک زرد بدن پر شہوت کے شگوفے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے برفوں پر پنک لپ سنک کے نشان ہوں.... جیسے ایک سفید سلک شرٹ بوسوں سے بچ نہ سکی ہو....

اور جونہی میں اُن کے سائے میں ہوا شاید ایک پنک شگوفہ میرے قدموں میں گرا.... اُس کی لپ سنک کا نشان فٹ پاتھ پر ثبت ہو گیا.... میں اُسے روند تو نہیں سکتا تھا اس لئے اُس سے ذرا ہٹ کر نکل گیا۔

”بس آپ لوگ آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں.... میں آپ کو وشال مرگ لے چلوں گا“

سُہری بابا نے ایک ایسے بیگ پاپیر کی طرح کہا جس کی ذہن پر چوہے کھنے چلے آتے ہیں، اُس کے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں اور راہی ملک عدم ہوتے ہیں۔

”ویسے ضیاء صاحب ماہڈ نہ کیجئے گا اگر میں ایک عرض کروں۔“ فاروق نے عرض کیا۔

”جی فرمائیے۔“

”پتہ نہیں آٹھ دس تو ہوں گے۔“

”تو پھر یہ دیوی بھی کوئی اور دیوی ہوگی....“

”مجھے یقین ہے کہ میں نے اسے پرسوں بھی دیکھا تھا....“

”دیوں کی تعداد میں یقیناً کمی بیشی ہوگی۔ ہر دیوی کے چرنوں اور ہر دیوی کے چہرے والے چرانوں کی تعداد اُن کے مرتبے کے مطابق نہیں ہوتی.... جس شہر میں اُس کے باسیوں کے گناہوں اور دولت کے مطابق ہوتی ہے.... اگر داتا صاحب کی بجائے چولستان کے صحرا میں کہیں دفن ہوتے تو اُن کے مزار کے گرد کروڑوں روکامپلیکس تعمیر نہ ہوتا....“

”لیکن یہ وہی دیوی تھی جو میں نے پرسوں دیکھی تھی....“

”ہمیشہ آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ دیوی دیوتاؤں کے بھی TWINS ہیں۔ اگر ضیاء صاحب نے وجہ دیا ہے کہ ہم کسی مقام شمال مرگ کو جا رہے ہیں دھوکا دربار سے کہیں دُوری پر ایک مقام ہے تو آپ کیوں یقین نہیں کر لیتیں....“

”ضیاء جو بھی وجہ دیتے ہیں اُس سے مکر جاتے ہیں.... چاہے وہ نوے اندر اندر انتخابات کا ہو یا شمال مرگ کا ہو۔“

تب اُس لمحے ٹیکسی پڑانے گھروں کی حیرت انگیز کھدائی والے نیل بونہ پھول پتوں والی کڑھائی کی کھڑکیوں تلے اس شب کی تازگی میں سانس لینے کے لیے نیپالی خواتین، مخدوش ٹورسٹ ہولوں اور متعدد اپن ایئر روشن صنم خانوں کو چھو نکلی تو مجھے بھی ذرا ساشک ہوا کہ یہ سب میرے دیکھے بھالے ہیں اور میں اس پر پہلے بھی آچکا ہوں۔

”بھئی میں قسم کھاتی ہوں کہ یہ وہی راستہ ہے دھوکا دربار والا.... میں نے

کر دیکھ لیا ہے“ ہمیشہ نے باقاعدہ شور مچا دیا۔

”آپ پلیز خاموش ہو جائیں ہمیشہ“ میں نے اُنہیں سختی سے ڈانٹا۔ ”راہ ہو سکتا ہے لیکن ہم بالآخر وہیں نکلیں گے جو ہماری منزل ہے.... کیا آپ کبھی ہیرا منڈی گئی ہیں؟“

”یہ کونسی منڈی ہے؟“

”یہ حُسن کی منڈی ہے.... عرف عام میں بازار حُسن ہے اور جاہل لوگ اسے چکلا

کہتے ہیں“

”لا حول ولا....“ ہمیشہ سخت خفا ہو گئیں....

”تو وہاں جانے کے لئے بھی مختلف راستے ہیں.... جو سب کے سب ایک سے

لتے ہیں.... ڈبی بازار کی جانب سے، نو گزے کی قبر کے پہلو میں جہاں تین سو تیرہ

ہاکساروں کے حُسن کے چھیننے اور اُن کی کدالوں کی گونج اب بھی موجود ہے۔ یا سُہری

سب سے بائیں جانب جہاں ایک ایسا بازار ہے جہاں پہلے طبلے اور ستار بنتے تھے اب ڈرم

اور گٹار بنتے ہیں.... تو راستے بے شمار ہوتے ہیں لیکن ہمیں ایک سے لگتے ہیں.... اس لئے

ہمیشہ آپ فی الحال چُپ رہیں پلیز....“

اور ہمیشہ چُپ ہو گئیں بلکہ دم سادھ لیا۔

لیکن جب ٹیکسی بالآخر رُکی تو وہی چوک تھا.... نیو روڈ کا.... روشن اور کھٹنڈو کی

رات میں جگمگاتا اُسے چکا چوند کرتا، جہاں ہم پہلی شب اُترے تھے۔

اور اُس کے بائیں جانب دھوکا دربار کا مپلیکس تھا....

”اب آپ کیا کہتے ہیں تارڑ صاحب۔۔۔“ ہمیشہ نے فتح مندی کے احساس میں

اُڈب کر مجھے مطعون کیا۔

”میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اور ضیاء پر ہم نے دوبارہ بھروسا کیا تو یہ

لکھا گیا تھا کہ ہم ایک اور دھوکے میں مبتلا ہوں گے.... مومن اگر ایک سوراخ سے دوبارہ

بھا جاتا ہے تو یہ مومن کی بیوقوفی ہے“

”آپ اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہیں.... اگر ہم کسی بے نظیر قیادت پر

بھروسہ کرتے ہیں تو کیا دھوکا نہیں ہوتا....“

”نہیں.... کیونکہ یہ ایک ضیاء نہیں.... ایک بے نظیر دھوکا ہوتا ہے....“

اتنی دیر میں ضیاء صاحب کی ٹیکسی بھی پہنچ گئی وہ باہر آئے اور داڑھی پر ایک

دھمکی آمیز ہاتھ پھیر کر بولے.... ”آئیے حضرات۔“

”ہم صرف حضرات نہیں ہیں....“ خالدہ گمشدہ نے ایک سرگوشی احتجاج کیا۔

”خواتین بھی ہیں.... ہر ضیاء یہ بھول جاتا ہے کہ خواتین بھی ہیں۔“

”بلکہ ماہ رمضان میں سحری کے وقت لاؤڈ سپیکرز پر اعلان کرتے مولوی حضرات بھی خواتین کو بھول جاتے ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ حضرات اٹھئے، سحری کی تیاری کیجئے۔ کھانا تیار کیجئے۔۔۔ روزہ شروع ہونے میں اتنے منٹ رہ گئے ہیں۔۔۔ اگرچہ یہ صرف خواتین ہوتی ہیں جو بیدار ہو کر پراٹھے پکاتی ہیں اور خوراک کا اہتمام کرتی ہیں۔ اور اسی طور افطار کی قربت میں جو اعلان ہوتے ہیں ان میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ حضرات روزہ افطار ہونے میں اتنے منٹ رہ گئے ہیں افطار کی تیاری کیجئے۔ اور اُس وقت حضرات تو نفاہت کے عالم میں کسی صوفے پر ڈھیر ہوتے ہیں اور خواتین کچن میں پکوانے ل رہی ہوتی ہیں۔۔۔ چنانچہ خواتین کا حوالہ ایک شجر ممنوعہ ہے۔۔۔ میں نے ایک مولوی صاحب سے جو ان دنوں علما اور شیوخ کے مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں پوچھا کہ آپ روزہ کے اعلان میں صرف حضرات ہی کو کیوں مخاطب کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔۔۔ ”اس لئے کہ وہ نامحرم ہیں۔۔۔ اور ہم نہیں جانتے کہ وہ کس حالت میں ہیں، ناپاکی میں ہیں یا پاکیزگی کی حالت میں ہیں تو۔۔۔ منبر سے صرف مردوں کو ہی مخاطب کیا جاسکتا ہے۔“

اور جب خالدہ سرگوشی نے احتجاج کیا کہ ہر ضیاء بھول جاتا ہے کہ خواتین بھی ہیں تو ہمارے ضیاء نے فوری طور پر اعتراف کر لیا کہ سوری نہ صرف حضرات بلکہ خواتین۔۔۔ ہم اب دشال مرگ چلتے ہیں۔۔۔

”نھریئے ضیاء صاحب۔“ ہمیشہ جیسے تلوار سونت کر میدان میں آگئیں“ یہ آپ نے ہمیں کہا لاکھڑا کیا ہے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گذرے تھے ہم جہاں سے۔۔۔ بائیں جانب دھوکا دربار کے ہنومان جی دکھائی نہیں دے رہے کیا۔۔۔ اور آپ کتے تھے دشال مرگ بالکل کسی اور سمت میں ہے اور مختلف جگہ ہے۔“

”ہاں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ ضیاء صاحب نے بالآخر اقرار کر لیا ”دراصل میں کالی برس پیشتر ادھر آیا تھا چنانچہ جغرافیہ ادھر ادھر ہو گیا ہے۔“

”ہم پاکستانی جغرافیے کو ادھر ادھر کرنے کے ماہر ہیں جناب عالی۔۔۔ آپ نے دیکھا کہ کانفرنس میں بلکہ دیش کا وفد جو ہمارے جغرافیے کا حصہ تھا وہ بھی ذرا ادھر ادھر ہو گیا ہے اور ہم نے ان کو ادھر کر کے کہ ادھر ہم اور ادھر تم ایک نیا پاکستان بنا لیا تھا اور اب پچھلے دنوں اُس پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کیسی ڈھٹائی اور ناپیمائی سے مناتے تھے۔۔۔ اگرچہ

”اس پاکستان کی چھبیسویں سالگرہ تھی۔“

”ہارڈ صاحب۔“ ملک نے اپنی ٹائی کی ڈھیلی ٹاٹ کو اُس کے تختوں سے دبا کر جٹ کیا ”آپ ہمیشہ تصویر کا تاریک رخ ہی کیوں دیکھتے ہیں؟“

”اس لئے کہ میں ابھی اُس تاریک رخ کی تاریکی میں ہوں۔“

”ویسے جہاں میں آپ کو لایا ہوں یہ بھی ایک اور رخ ہے۔“ ضیاء صاحب نے اٹھنا کیا۔

”وہی رخ ہے ضیاء صاحب۔۔۔“ ہمیشہ نے پھر وار کیا ”آپ ہمیں وہیں لے آئے ہیں۔۔۔ ذرا دیکھئے چوک کے پار وہی دوکان نہیں ہے جہاں سے تارڈ صاحب نے تیز ریلوں والے آلو کے سمو سے خریدے تھے، ہندوؤں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے۔۔۔“

”بے شک وہی دوکان ہے۔ وہی نیو روڈ ہے اور میرا جغرافیہ ادھر ادھر ہو گیا ہے میں اقرار کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں لیکن اس کے باوجود۔۔۔ دشال مرگ ادھر لیں ادھر ہے سڑک کے پار۔ ذرا سڑک کے پار چلتے ہیں۔“

وہاں سڑک کے پار ہوئے تو ایک پانچ منزلہ سپر سٹور تھا۔۔۔ جس کے خود کار زینے لگا لگا کر چلتے تھے اور ان پر بڈھ بھکشو اپنے کسیری لبادوں میں لپٹے ان شورومز کو نکلنے لگے جن میں یورپ اور امریکہ کے معروف فیشن گھروں کی چمکتی دکتی مصنوعات تھی۔۔۔ میں۔۔۔ ڈیزائنرز، ڈیزائنرز، لباس، شو، زیورات اور کیمرے اور یہ بھکشو انہیں دیکھ رہا تھا بڈھ سے قدرے بدگمان ہوتے تھے جس نے دنیا کو ترک کر دینے کی صلاح دی۔۔۔ اور وہاں ایسے جین مت کے پیرکار تھے جو ہوا میں نظر نہ آنے والے کیڑوں دڑوں کو سانس کے ساتھ نکل کر ان کے قتل کے مرتکب نہ ہونا چاہتے تھے اور منہ اور سپر ایک نقاب سا باندھے پھرتے تھے اور اس کے باوجود کارٹینز کے زیورات اور لڑکوں اور بیچر کارڈن کے ملبوسات پر ایک ایسی نظر ڈالتے تھے جو کہتی تھی کہ ہم کہتے بڑے کوڑے نگلیں تو ہمیں یہ گھڑی۔۔۔ یہ لباس مل سکتا ہے۔۔۔

میرا نیپالی جوش اور دلولہ وصال کے بعد کی حالت کی طرح یکدم ٹھنڈا اور پالوٹ ہو گیا۔۔۔ میں اس نوعیت کے کئی سٹور بلکہ اس سے بہتر گھر چھوڑ کر آیا تھا۔۔۔ تو تندرستی کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ اور جب میں ٹھنڈا اور لالچ ہوتا ہوں تو خود بھی نہیں

مرف سبز زار روپے کی ہے۔“

ہم پھر اُس لالہ یعنی شام میں سخت بیخ پر پہلو بدلتے ساتھیوں کے منتظر ہوئے۔

لیکن اس انتظار کا ایک فائدہ ہوا... ہمیں پر بیٹھے ہوئے میرے دل میں سے ایک پہلا نکلنا ایک غلش رفع ہوئی... جب سے میں اس شہر کھٹنڈو میں آیا تھا وادی نیپال میں قدم رکھا تھا یہاں کوئی ایک شے تھی یا نہیں تھی جو مجھے بے آرام کرتی تھی... وہ کیا تھی؟ میں نے اُس پٹر سٹور میں جہاں دنیا بھر کے فیشن گھروں کی لاکھوں ڈالر مالیت کی مصنوعات بیسیوں میں سچی تھیں وہاں اُن کی حفاظت کے لئے میں نے ایک بیزار سا چوکیدار دیکھا جو اپنی بوسیدہ وردی میں ناتواں بدن میں صرف ایک ڈنڈے میں ملبوس ان مصنوعات کی حفاظت کر رہا تھا۔

بس یہی غلش تھی...

...یہی بے آرامی تھی...

... کہ میں نے نیپال میں اب تک کوئی ایک کلاشکوف نہ دیکھی تھی... کوئی ایک

کرائین، ماڈرن یا آٹومیک رائفل نہیں دیکھی تھی، ہلاکت کا کوئی سامان نہ دیکھا تھا...

ان لوگوں کے دلوں پر واقعی قفل پڑے ہوئے تھے۔ سینکڑوں خداؤں کے سامنے

ٹھکتے تھے، شرک کے مرتکب ہوتے تھے اور اس کے باوجود اُنہیں کسی کلاشکوف کی

ضرورت نہ تھی... افغان جناد کے ثمرات یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔

اور میں... اپنے پیارے وطن میں ایک کلاشکوف کے بغیر زندگی ادھوری سمجھتا

تھا... بے شک یہ میرے ذاتی گارڈ کی ہو۔ کتابوں کی دوکان کے باہر پر ادیتے محافظ کی ہو۔

کی تعلیمی ادارے کے ہونہار بروا کے ہاتھوں میں ہو... یا ایک مذہبی شخصیت کے شرک پر

سوار درجنوں کارکنوں کے لبادوں اور داڑھیوں میں سے جنم لینے والی اپنے سیاسی اور

ذاتی عقیدے کی مدافعت کے لئے اور ذرا اختلاف کرنے والوں کو ٹھنڈا کر دینے والی

کلاشکوف ہو... بس یہ ثابت ہوا کہ نیپال ایک نہایت بے دین ملک ہے کہ اُس میں دین

کی حفاظت کے لئے کوئی ہتھیار نہ تھا... اور نہ ہی مندروں میں پوجا پاٹ کرنے والوں کی

نہایت بے رُوح معاشرہ تھا۔

فیاض صاحب ایک وسط ایشیائی مغل فاتح کے انداز میں اکڑوں کھڑے عوام پر

سمجھ سکتا کہ میں اتنا ٹھنڈا اور لالچ کیوں ہو گیا ہوں۔

سُہری بابا جانے کوئی منزل پر تھے... اپنے بچوں کے لئے! پورٹ کھلونوں کی

تلاش میں... گمشدہ کو جب آخری بار دیکھا گیا تھا تو بینکاک ہیئر کپس اور ہینڈ

چوڑیوں کی ایک دوکان میں مسکور کھڑی تھیں...

ملک اور فاروق شاید کسی مشن ایمپائل کی مار پر نکلے ہوئے تھے...

میرا موڈ سخت آف ہو گیا۔

کیا کھٹنڈو کی شام صرف اس لئے ہے کہ ہم اُسے کسی ایسے سٹور میں گز

دیں جو دنیا کے کسی تختے پر بھی ہو سکتا تھا اور وہاں نہ گذاریں جو صرف کھٹنڈو میں ہو

تھا۔

جب مسجد قرطبہ کے مرکز کو مسمار کر کے وہاں ایک کلیسا تعمیر کر دیا گیا تھا تو اب

پادری نے کہا تھا کہ تم نے ایک ایسی شے تعمیر کی ہے جو کہیں بھی تعمیر کی جاسکتی تھی

ایک ایسی شے کو ڈھادیا ہے جو کہیں بھی تعمیر نہیں ہو سکتی...

تو میرے لئے آج کی کھٹنڈو شام ڈھے گئی تھی... اور اُس کی جگہ یہ پٹر سٹور

جو کہیں بھی ہو سکتا تھا... اس لئے میرا موڈ سخت آف تھا...

میں اور ہمشیرہ گرلی گائیڈ نہایت غمناک، رنجیدہ اس شام کی بربادی پر ڈاکروں

طرح نوحہ کنناں اور اس شام غریباں پر کفِ افسوس ملتے سٹور کے مرکز میں اور گنڈ۔

مرکز میں ایک سخت بیخ پر پہلو بدلتے اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتے اور وقت کی ریت۔

ڈزوں کو اپنی مٹھیوں میں سے گرتے محسوس کرتے اذیت میں تھے کہ ہر ڈرے پر کوئی ایک

خوشنما بالکوئی، کوئی مندر، سرد ہمالیائی ہوا کا ایک جھونکا، کوئی من موہنا چہرہ نقش تھا جو ہر

گرفت سے باہر نکل کر زیاں کی اس شام میں گم ہوتا جاتا تھا...

ہم بار بار نیچے آتے خود کار زینوں کو دیکھتے کہ شاید جہوم میں کوئی شناسا چہرہ ایسا

جس کے ہم منتظر تھے۔ بالآخر ہمشیرہ بور ہو کر اُنھیں اور کہنے لگیں ”یہ سامنے کارٹینز

جیولری شاپ ہے ذرا جھانک لیں کہ ان کے پاس سستا ترین زیور یا گھڑی کس دام

ہیں“

ہمشیرہ اٹھ کر گئیں اور اُنہی قدموں پر لوٹ آئیں ”سب سے کم قیمت گنڈا

ایک نظر حقارت ڈالتے خود کار زینے پر کھڑے نیچے آ رہے تھے، اُن کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا گتے کا ڈبہ تھا جو ایک چوکور تابوت کی شکل کا تھا۔

”سر میں نے سومنگ پُول خرید لیا ہے۔“

”آپ کتنے دنوں سے نہیں نہائے تھے کہ آپ کو دو چار بالٹیوں کی بجائے پورے سومنگ پُول کی حاجت ہو گئی۔“

”سر یہ سومنگ پُول پلاسٹک کا ہے۔“ وہ بہت زیادہ پرجوش ہو رہے تھے، مجھے ایک عرصہ سے اس کی تلاش تھی.... اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پتہ نہیں ہے۔“

”کس کا پتہ؟“

”کسی کا بھی پتہ.... کیونکہ یہ احتیاط کی گئی ہے کہ اس میں صرف اتنا پانی جاسکے جس میں اگر پتہ گر بھی جائے تو دو چار غوطے کھا کر باہر آجائے....“

”تو اس میں آپ بچے نہ لائیں گے اور فی پتہ دس روپے وصول کر کے آمدن کا بندوبست کریں گے۔“

”اس میں میں اپنے بچوں کو نہ لائوں گا.... اور بچے بابا کو، یعنی مجھ کو دعائیں دے گے۔“

گمشدہ اپنے بالوں میں بینکاک کے ہیئر کلپ سجائے اور بازوؤں میں ہندو چوڑیاں کھکاتی دانت نکالتی پہنچ گئی۔

ملک اور فاروق.... جدھر بھی گئے تھے، ناکام لوٹے تھے....

میرادل جلا ہوا تھا، مؤڈ آف تھا اور میں بیزاری کی بادشاہت کے مرتبے پر ہو چکا تھا، ضیاء صاحب قصور میرا ہے۔ میں نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا تھا اور

مرتبہ پھر آپ پر بھروسہ کر لیا تھا تو اب آپ کیا فرماتے ہیں؟“

”کہاں چلنا ہے ضیاء صاحب؟“ گمشدہ نے بھی سوال کیا۔

”میں نے تو اپنا سومنگ پُول خرید لیا ہے اب کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کہاں ہیں.... بس چلتے ہیں“

وشال بازار کے باہر جو فٹ پاتھ تھے اُن پر ایسے ایسے کردار تھے جو ہوش

کے جدید علاقوں میں نہ ملتے تھے صرف ادھر ملتے تھے.... مجھے بیچنے والے، آلو کے قتلے اور سوے اور آم کا اچار فروخت کرنے والے.... سستی جیولری، دھارمک تصویریں.... پلاسٹک کے برتن، چرس کا دھواں، شراب کی بوتلیں اور ٹریفک اور ٹریفک.... سائیکل رکشا تمبلیاں بجاتے اور ہم اپنے آپ کو اُن سے بچاتے.... چلتے گئے۔

دائیں جانب شہر لاہور کی تنگ گلیوں میں نئے ایک گلی ایک دراڑ کی طرح غارتوں کے اندر جا رہی تھی.... ”ضیاء صاحب.... اگر اجازت ہو تو ہم بے ہمارا اونٹوں کی طرح بے مقصد چلتے جانے کی بجائے اس گلی میں نہ چلے جائیں؟“

”اس گلی میں کیا ہوگا؟“

”اگر میرے اندر کا قطب نما ابھی تک کام کر رہا ہے تو یہ گلی دھوکا بازار کے تل چوک میں جا کھلے گی....“

”جہاں وہی رگھوناتھ کی پوشینے والی دوکان ہے“ گمشدہ سیدھی ہو گئی۔ یہ ایک ویسی ہی گلی تھی جیسی لاہور شہر کی گلیاں ہوتی ہیں لیکن تقریباً.... یہاں پر خشک پھل، مرچ مصالحوں اور نیپالی مٹھائیوں کے تھوک کے بیوپاری بیٹھے تھے لیکن ان کے سوا گلی پر جھکتی کھڑکیوں میں کچھ مخدوش قسم کی نیپالی حسینائیں بھی بیٹھی تھیں.... اس لئے تقریباً.... اور تب ہم اُس مقام پر برآمد ہوئے اور ایک ست ماہے بچے کی طرح برآمد ہوئے جہاں دھوکا دربار کے اختتام پر تل چوک تھا.... لیکن اس وقت زیادہ پُروقت نہیں تھا....

بازار بند ہو چکا تھا.... اور صد شکر کہ رگھوناتھ کی پوشینے کی دوکان کے آگے بھی ٹرگر اُٹھا تھا.... اور اسے بند دیکھ کر گمشدہ نے نہایت بے چارگی اور مایوسی سے اپنی پلکوں کے شہر متعدد بار اُٹھائے اور گرائے....

ہمیں بھوک بہت ستاتی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں....“ سُہری بابا نے پھر تسلی دی ”یہاں کچھ دور دربار مرگ ہے جہاں ایک انٹرن فاسٹ فوڈ جوئنٹ ہے اور وہاں برگر ملیں گے۔ کلب سینڈویچ اور اُنل کریم سوڈا ملے گا.... آپ چلتے جائیں....“

چنانچہ ہم بوریٹ کے اُس لمحے میں تھے جب سپاہی ہتھیار ڈال دیتا ہے اور

خواہش کرتا ہے کہ اب جو کچھ ہونا ہے ہو جائے.... چنانچہ ہم چلتے گئے، اور یہ ایک پڑوسی اور پڑ طلسم چال تھی۔

ہم کھنڈو شہر کی قدامت کے اندر تک قدم رکھتے چلتے تھے، شب کی نیم تارک میں ہم بھٹک بھٹک کر چلتے تھے.... شہر کے باشندے اپنے تنگ کمروں اور قیام گاہوں سے نکل کر آزادی سے گھومتے تھے کہ دن کے وقت یہاں ستاحوں کا راج ہوتا تھا....

ایک ڈربہ نما کوٹھڑی میں طبلے اور ہارمونیم پر بھگے کچھ لوگ گاتے تھے، بھولتے تھے اور جھوم جھوم جاتے تھے.... یہ بھجن گانے والوں کی قوال پارٹی تھی.... کوٹھڑی کی کنارے ایٹوں پر ہاتھ سے لکھا ہوا ایک نوٹس چسپاں تھا ”ڈیوڈنٹل سائیکز.... ون ڈالر اوٹلی....“ ایک ڈالر میں ایک بھجن منگوا سوتا نہ تھا۔ فی الحال انہیں سننے والا کوئی ستیج نہ تھا البتہ چند نیا ماٹھوں پر تلک لگائے انہیں سنتے تھے اور حالت وجد کی قربت میں تھے۔ میں انہیں دیکھ کر زکا تو ہارمونیم کی کیز پر چلتی انگلیاں بھی رک گئیں اور اپنے ماتھے کو سرخرو کے سارے نہایت آشتی سے بولا ”سر آپ ڈیوڈنٹل سائیکز سنیں گے؟“

”کتے پیے؟“

”اوٹلی ون ڈالر ون ساگ....“

میراجی چاہتا تھا کہ اس کوٹھڑی میں بیٹھ کر ایک دو بھجن سنوں ذرا لوکل ٹیٹا لے.... لیکن میرے ساتھی بہت آگے نکل گئے تھے ”سم آدر ٹائم....“ مسلسل چلنے کی وجہ سے بھوک ہمیں نڈھال کرتی تھی اور آنکھوں کے سائے چرمے سے ناپتے تھے.... ہم نے ایک مرتبہ پھر سُہری بابا پر چڑھائی کر دی ”نیا صاحب....“

وہ زروس ہو کر مقدس قسمیں کھانے لگے اور ہمیں یقین دلانے لگے کہ وہاں مرگ اب ڈور نہیں اور وہاں پہنچ کر ہماری ساری کلفتیں ڈور ہو جائیں گی اور وہاں پہنچ ہی ہمارے سامنے ایسے بلند و بالا کلب سینڈوچ رکھ دیئے جائیں گے جو پیسے کے بند کی طرح قدرے جھکے ہوئے ہوں گے اور ان کی تہوں میں سے چکن، سلاد اور پاپونیزہ کی جھانک جھانک کر اپنے آپ کو کھا جانے کی دعوت دیں گے۔

گلی کوچوں کی روشنیاں بے حد مدہم تھیں۔ دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔

نہی مہتی کی صدا آسمانی دے جاتی جو دیر تک میری عمر کے موہنجو ڈارو پر گونجتی رہتی.... لکڑی کی پوسیدہ کھڑکیوں کے کواڑ ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ ہمارے بدن ڈکھتے تھے پاؤں رکتے تھے.... ویسے سب سے کم میرے پاؤں ڈکھتے تھے کہ میں جاگر زمیں تھا اور پتہ غلط معزز پاپوشی میں جکڑی ہوئی تھی.... ہم چونکہ بھٹک بھٹک کر چلتے تھے اور سرگوشی ہی انک انک کر چلتی تھی اس لئے ہمیں خبر بھی نہ ہوئی جب ایک لمحہ وہ وہاں تھی اور دوسرے لمحے وہ وہاں نہیں تھی اور حسب روایت گم ہو چکی تھی۔ میں ذرا پریشانی میں مبتلا ہو گیا ”ضیاء صاحب رات ہو گئی ہے اور خالدہ پھر گمشدہ....“

”میرا خیال ہے کہ وہ کسی نیپالی زیورات کی دوکان میں محو ہوگی اور کسی جھیکے پر بھلی ہوگی اور اتنی دیر تک جھکی رہے گی کہ دوکاندار کو دوکان بند کرتے ہوئے شاہبہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ اُس نے ایک پاکستانی صحافی خاتون کو اندر مقفل کر دیا ہے۔“

”ہائے ہائے۔“ نہایت پُرتشویش ہوتی ہمشیرہ نے دوہائی دی ”وہاں تو اُس کا دم گھٹ جائے گا۔“

”وہ اُس جھیکے سے نظر اٹھائے گی تو اُس کا دم گھٹے گا ناں۔“

”اب کیا کریں؟“ قافلہ رُک گیا۔

”بھئی یہ نیپالی اس قسم کی گمشدہ دوشیزاؤں کو انواد غیرہ تو نہیں کر لیتے؟“

”لو انہیں اپنے بھگوانوں سے فرصت ملے تو عورتوں کی طرف دیکھیں۔“ ہمشیرہ نے اپنی جانب نیپالیوں کی بے اعتنائی کا بدلہ لے لیا.... انہیں بے حد صدمہ تھا کہ یہ لوگ خواتین کو گھورتے ہی نہیں.... خواتین کو گھورنا بے شک ایک معیوب عمل ہے لیکن اس میں کشش کا اقرار تو ہے جو صنف نازک کو عام طور پر گراں نہیں گزرتا۔

”ویسے اگر ہم اپنے آپ کو گتے ہیں تارڑ صاحب تو آپ ہیں۔ ہمشیرہ ہیں، فاروق ہیں، تین لوگ ہیں۔“ ضیاء صاحب کہنے لگے....

”اگر آپ اپنے آپ کو بھی شمار کر لیں تو چار لوگ ہیں۔“

”ہاں میں اپنے آپ کو بھول ہی گیا تھا“ وہ ایک سُہری ریش ہنسی ہنسنے ”تو ہمارے ساتھ اُس حسینہ گم گشتہ کے علاوہ ملک صاحب بھی نہیں پائے جاتے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں ہم سے پھڑ گئے ہیں۔ یا آگے چلے گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے“

ہیں.... وہ اگر اکٹھے ہیں تو گمشدہ محفوظ ہیں اغوا وغیرہ کے امکانات نہیں ہیں۔“

”اور اگر وہ الگ الگ ہیں اور سلمان کسی دیوی کے بت کے سامنے روٹھا کر کہ تم مجھ پر مریکوں نہیں مٹیں اور گمشدہ کہیں اور ہے تو....“

”تو ہم انتظار کرتے ہیں۔۔۔“

اور ہم نے تادیر انتظار کیا.... اور جب تادیر.... تا تادیر ہوگئی تو ہم نے اپنے ذہنوں کی سکرین پر تلاش گمشدہ میں دکھائی جانے والی تصاویر میں ملک اور گمشدہ کوڑ کیا، اپنے فون نمبر درج کئے کہ مندرجہ بالا گمشدہ افراد ذہنی طور پر معذور ہیں.... اور روٹھ جانے پر مجبور ہے اور ڈوسرا شاپنگ فور کا معذور ہے اگر کہیں دستیاب ہو فوری طور پر ان ٹیلی فون نمبروں پر اطلاع کریں لیکن.... کسی فون کی گھنٹی نہ بجی.... اور وہاں کھڑے کھڑے بھوک اور تھکاوٹ سے شوکتے رہے۔

”بھئی یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ دونوں گمشدہ نہ ہوں.... ہم چاروں ہوں۔“

”یعنی۔“

”یعنی یہ کہ وہ رلاہ راست پر ہوں اور ہم بھٹک چکے ہوں اور وہ پریشان ہوں

ہمیں تلاش کرتے ہوں۔“

”ہم اگرچہ ایک بھٹکی ہوئی قوم میں سے ہیں لیکن یہ ایک طے شدہ بات ہے ہم آگے تھے اور وہ کہیں پیچھے رہ گئے ہیں یا واپس ہو ٹل چلے گئے ہیں.... وہ ہم سے آگے نہیں.... پیچھے ہوتے تو اب تک آچکے ہوتے چنانچہ ہم چلتے ہیں۔“

چنانچہ ہم چلتے تھے....

دائیں جانب ایک شب کی سیاہی والے شکستہ مگر نہایت دل فریب مندر کی با منزل پر چار کھڑکیاں کھلی تھیں اور روشن تھیں....

تین کے وجود مورتیوں اور سُہری نقوش والی دیو یوں سے بھرے جھللائے اور چوتھی کھڑکی میں ایک عینک والا بھاری منڈیر پر جھکا دیئے جلاتا تھا۔

اور نیچے مندر کے اندر ایک آہنی جنگلے میں کوئی خدا قید تھا جو تاریکی کی دستانہ نہیں کیا پاسکتا تھا.... اور یہ بھی بچا اس تھا کہ بت نہیں کون اور کس کا خدا ہے آئے.... اور جنگلے کے اندر ایک بھاری ایک نہایت کالے کولٹے مہاتما بڑھ کو رہا

چکنا چلا جاتا تھا.... چنانچہ مہاتما کا آدھا بدن.... لبادہ اور ماتھا چمک چکا تھا اور بقیہ مہاتما ریگ رگڑ کا منظر تھا....

ہم جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور مہاتما کی اوور ہالنگ کا منظر دیکھنے لگے۔

بھاری نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اپنے بڑھ کو چکاتا رہا....

”ہیلو۔“

اُس نے ایک ناراض نظر اٹھا کر ہمیں جنگلے پر جھکا دیکھا۔۔۔۔۔ ”ہیلو۔“ وہ ہاتھ باندھ کر ذرا جھکا اور پھر سے اپنے مہاتما جی کو پالش کرنے میں مشغول ہو گیا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اگلے پانچ چھ روز تک فارغ نہیں ہوگا کیونکہ اُس کے سامنے درجنوں زنگ آلود کالے کولٹے مجھے قطار لگائے اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔

ہر شخص سے تعارف پر اُس کے نام کے بعد اُس کا پروفیشن پوچھا جاتا ہے کہ آپ کرتے کیا ہیں؟.... جیسے شدید ہے کہ کراچی کی ایک دعوت میں ایک مہینہ سینٹھ نے فیض صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ کیا کرتا ہے۔

تو فیض صاحب نے سگرت کا ٹوٹا لگا کر اُس کے ساتھ جو امپونٹ راکھ کرنے کو فی اُسے جھاڑ کر کہا تھا ”ہم شاعری کرتا ہے۔“

سینٹھ صاحب نے خفا ہو کر کہا تھا ”بابا شاعری ماری تو کرتا ہے پر دھندہ کیا کرتا ہے؟“

فیض صاحب بے چارگی سے بولے ”بھئی.... وہ یوں ہے کہ.... ہم کتابیں لکھتا ہے۔“ اس پر سینٹھ صاحب نے فوراً آفر لگا دی کہ بابا بوری دو بوری اپن کو بھیج دو.... بکوا اسے گا۔

تو اگر ہم اس بھاری سے پوچھتے ہیں کہ بابا آپ بھاری تو ہے پر دھندہ کیا کرتا ہے؟.... تو یہ جواب دیتا کہ ہم مہاتما کا مجسمہ چکاتا ہے.... یہ دھندہ کرتا ہے.... لیکن ہم مہاتما کے جوں کی بوری دو بوری نہیں خرید سکتے تھے.... کیونکہ شاکیہ مٹی نے تو ایک سلطنت ٹکڑی تھی ایسے لوگ برائے فروخت کیسے ہو سکتے تھے....

دیئے مہاتما بڑھ کے مجھے چکنا بھی کیا یونیک اور زبردست پروفیشن تھا....

ہتھوں کی طرح قوس ہوتا تھا... میں کنارے پر بیٹھا اپنے سونگ کاسٹیوم میں ٹھڑتا اور اس کی ہٹائی ہوئی گرم کافی کو حلق سے اُتارتا تھا اور اُسے انگلستان کے سرد سمندر میں ایک سُہری ٹراؤٹ کی طرح تیرتے دیکھتا تھا اور اُس کے سُہری بال پانی میں ڈوبتے دور ہوتے تھے اور اُس کا پچھلا دھڑ جب پانی سے باہر آتا تھا تو دو منٹابوں کی طرح قوس ہوتا تھا...

گھٹی کی صدا اتنے در کیوں کھولتی تھی؟

اس لئے کہ وہاں ایک چاند کی چودھویں کے بدن والی دیوی... دودھیا اور بدنی ہنس سے بھری ہوئی بیٹھی تھی اور یہ اُس کے مندر کی گھٹی کی آواز تھی جو مجھے سُہری ٹراؤٹ تک لے گئی تھی... ایک اور مندر تھا...

ایک اور دیوی چاند کی چودھویں کے بدن والی سفید ماہتاب دیوی آہنی جنگلے کے بیچے براجمان تھی... اُس کے مندر کے باہر وہ گھٹی لگتی تھی اور جو کوئی بھی اُدھر سے گذرتا تھا وہ پہلے ہاتھ جوڑ کر پر نام کرتا تھا اور پھر اُس کی آہنی زبان کو تمام کر اُسے حرکت دیتا تھا اور سر جھکا کر گذر جاتا تھا۔

ایک سائیکل پر سوار دو نیپالی آئے... پہلے ڈنڈے پر بیٹھے ہوئے نیپالی نے اُسے جھوا اور پھر سائیکل کی گدی پر براجمان بندے نے پینڈل کو چھوڑ کر اُسے سلام کیا... گھٹی کو حرکت دی اور پھر آگے گئے...

جو کوئی بھی گھٹی کے نیچے سے گذرتا تھا سر جھکا کر سلام کر کے اُسے بجا کر گزرتا تھا۔

”کس کا مندر ہے؟“ میں نے ایک عقیدت مند سے دریافت کیا جو بُت بنا ہاتھ بندھے دیوی کے سامنے کھڑا تھا...

”نہیں جانتے؟“

”نہیں جانتا۔“

”نہیں پہچانتے؟“

”نہیں پہچانتا“

ہم مزید چلے... اور جب سکت مزید کم ہوئی تو فاروق کہنے لگا ”تارڑ صاحب! مجھے بھوک سے مرنا ہے تو اپنے اسلام آباد میں اسلامی طریقے سے کیوں نہ مروں... کھٹنڈو میں سورگباشی کیوں ہو جاؤں... ٹیکسی تلاش کر کے واپس ہوٹل چلتے ہیں اور کبیر میں جا کر پیٹ پو جا کرتے ہیں...“

”ساتھیو، مجاہدو... جاگ اٹھا ہے سارا وطن... میرا مطلب ہے ساتھیو اب جو دور نہیں... چلے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی۔“ یہ ضیاء صاحب کا فرمان تھا... ہم اپنے اُن پاؤں کو بمشکل اٹھانے لگے جو آئرش خچروں کی طرح بھاری ہوئے تھے... اور یاد رہے کہ یہ مثال... یعنی پاؤں بھاری ہونا صرف مرد حضرات کے لئے استعمال کی گئی ہے۔

اگر ہم غور کرتے تو اس کھٹنڈو ٹائٹ میں کوپڑے و بازار میں ایک ایسی بیز دوران جس کے ہم خواہاں نہ تھے... اُس کی چاہت نہ رکھتے تھے مجبوری سے چلتے اس کے دوران حیرانی کے بہت سے سبب تھے... اور اُس میں سے ایک یہ تھا کہ اس چلاؤ کے دوران کسی ایک فقیر نے بھی ہمارا دامن نہ تھاما... کہ سنیادے جاشیوا کے پر... رام بھلی کرے گا... نہ کسی نیپالی نے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے راستہ روکا تم کون ہو... اور نہ کسی دیوی یا دیوتانے اُنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا کہ اگر تم میرے ماننے والے نہیں ہو تو نصف شب کی قربت میں ان نیم تاریک گلیوں میں کیوں چلتے... ہم بھوکے تھے اور تھکے ہوئے تھے...

ضیاء صاحب اگر اُس لمحے ریفرنڈم کرواتے تو یقیناً ہم نہ ہوتے جو انہیں دیتے... اور تب ایک اور مترنم گھٹی کی آواز میرے کانوں میں آئی... اور کانوں سے اُن میرے بدن میں دستک دینے لگی... اس کی دستک سے بہت دروازے کھلے... دروازے بھی جن کے قبضے رنگ آلود ہو چکے تھے کہ انہیں کھلے مدتیں ہو چکی تھیں... گھٹی کی صدا ان دروازوں میں سے گذر کر انگلستان کے سرد سمندر کی رات میں لگی... سمندر کی لہروں میں، سرد شب کے اندھیروں میں تیرتی ہوئی ایک تاب... بدن... اور سفید اور سُہری ٹراؤٹ کے چمکیلے بدن کی شفاف جلد والی لڑکی... ایسے تیار... کہ اُس کے سُہری بال پانی میں ڈوبتے تھے تو اُس کا پچھلا دھڑ تاریکی میں اُبھرتا...

پہلی مرتبہ نہیں ہے۔ اور یوں بھی اگر جھکا ہوں تو صرف اس کی سفیدی اور روشنی کے لئے۔ جو میرے لئے ایک بلند کوسہار ہے۔ اور یہ عمل تو میں پاکستانی شمال میں بھی کرتا ہوں۔

”پاکستان ماشاء اللہ سے اسلامی ملک ہے۔“ ہمیشہ نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا ”وہاں کون سے بت ہیں، کونسی دیویاں ہیں؟“

”وہاں نانگا پربت بھی تو ایک دیوی ہے جس کا مندر فیڑی میڈو ہے۔ راکا پوشی کا برٹانی بت ہے جس کا میں ریگولر پجاری ہوں۔ شاہ گوری ہے۔ اناپورنا سے زیادہ گوری ہے اور اُس کے بدن پر جو نیل ہیں وہ میرے بوسوں کے نشان ہیں۔“

”Indeed“ ضیاء صاحب نے داڑھی کھجلا کر میری عقل پر ماتم کیا۔ اور اس دوران ہمیشہ اور فاروق اناپورنا کے سامنے بھجن گانے والی ایک پجاری کی آواز پر کان دھرے کھڑے تھے اور مہسوت کھڑے تھے۔

”ویسے سہرا ایک راز کی بات بتائیں۔“ میں نے سُہری بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور گشدرہ کے سرگوشی انداز میں پوچھا۔

”جی فرمائیے“

”کسی مندر کی گھنٹی کی آواز سن کر آپ کے اندر جو ہندو ہے وہ نہیں جاگتا؟“

”لا حول ولا۔۔۔“ ضیاء صاحب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر اپنے ایمان کو مستحکم

”آپ کی آستینوں میں بت نہیں ہیں؟“

”لا حول ولا۔۔۔“

”سُردرا یہ گھنٹی بجا کر دیکھیں۔۔۔ اگر ایمان ڈنگا نہ جائے تو پیسے واپس۔۔۔“

”کیا اس گھنٹی میں بجلی کا کرنٹ ہے؟“

”ہے۔۔۔“

”تو پھر میں اسے ہاتھ لگانے کا رسک نہیں لے سکتا۔۔۔ اور پلیز راستہ کھوٹا نہ کرنا اور اس قسم کی کھوٹی دیویوں سے ذرا پلوتی کرتے جائیں ورنہ ہم دربار مرگ میں پہنچ سکیں گے جہاں کلب سینڈوچ، برگر اور فریج فراز ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”کہاں سے آئے ہو؟“

”پاکستان سے۔“

”تجھی۔۔۔ یہ اناپورنا دیوی کا مندر ہے۔۔۔ اناپورنا۔۔۔“

میں سفید اور برف پوش اور بے داغ برفانی لبادوں میں ڈھکی چوٹی اناپورنا سے واقف تھا۔۔۔ دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک۔۔۔ لیکن اس نام کی دیوی سے میرے تعارف نہ تھا۔

دیوی کی کوئی واضح شکل نہ تھی۔۔۔ لیکن وہ سراسر سفید تھی۔۔۔ زرد پھولوں سے لدی۔ پھلجاتی موم کے جھماکوں میں اُس کا بدن گورا اور روشن تھا۔ گزرنے والے اُس کی سفیدی اور روشنی کے لئے کچھ نہ کچھ بھیٹ کرتے اور گھڑیاں بجا کر اُسے خبر کرتے دیوی مجھے یاد رکھنا۔ کہ میں ادھر سے گذرا تو تجھے پر نام کر کے گذرا۔

اناپورنا کے مندر میں کوئی تاریکی کوئی بھید کوئی طلسم نہ تھا۔۔۔ وہ اتنی روشن تھی کہ اُسے دیکھنے سے آنکھیں ڈھکتی تھیں۔۔۔ یہ کھنڈ کی پہلی دیوی تھی جسے پر نام کرنے کا میرا بھی جی چاہا۔۔۔ میں آگے بڑھا اور اُس کے مندر کی گھنٹی کو تھام کر اُسے حرکت دی۔

عمر کے موٹیو ڈارو پر تیرتی اُس کی آواز ایک مرتبہ پھر وہاں تک گئی جہاں سرد سنڈر میں ایک سفید جل پری کا بدن ڈوٹا اُبھرتا تھا اور قوسوں کے دو ماہتاب پانیوں میں غروب ہو کر طلوع ہوتے تھے۔۔۔

”تارڑ صاحب۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ میں نے پہلے بھی آپ کو منع کیا تھا۔“ سُہری بابا پھر ہراساں ہو گئے ”یہ لوگ مانڈ کریں گے۔ ان کی دیویوں کی گھنٹیاں بجاتے ہیں۔ ان کے پرائیویٹ پارٹس کو ہاتھ لگاتے ہیں۔۔۔ یہ ہنگ اناپورنا کا کیس کر رہے گے“

”میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اگر ہم گھنٹیاں نہیں بجائیں گے تب وہ ہمیں شک کریں گے اور مانڈ کریں گے۔“

”لیکن آپ اس گھنٹی کو بجا کر کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں“ ہمیشہ رانے نے احتجاج کیا ”پتھر کے بتوں کو پر نام کر رہے ہیں۔“

”ہمیشہ۔۔۔ میں اپنی زندگی میں بے شمار پتھر کے بتوں کے سامنے جھک چکا ہوں۔“

”ہارٹ صاحب ذرا معلومات حاصل کریں کہ ان نیپالیوں نے اپنے بادرچی خانے
نیا کیا پکا ہے اور آئی سی میں کتنے کا ہے؟“

”کھٹنڈو کچن“ کے بورڈ تلے ایک مخدوش اور شک بھرا دروازہ تھا۔
جیسے کسی بوڑھی طوائف کے گھر کا دروازہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اندر آ جاؤ میں
نہیں اپنے تجربے کی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دوں گی۔

میں اُس کے اندر گیا تو کواڑ کے پیچھے پوشیدہ ایک دربان نمودار ہو گیا۔ پتہ نہیں
کس زبان میں کیا کہا اور مجھے اُوپر جانے کا اشارہ کیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک نیچی
بھت کا مختصر سا رستوران تھا جیسے ہالیوے کی برفوں کے نزدیک شربا لوگوں کے سرد موسموں
کا سرچھکا کر مقابلہ کرنے والے گھر ہوتے ہیں۔ چند گورا لوگ نیپالی موسیقی کی ٹوں ٹوں
میں گم پیڑ پیتے تھے اور پتہ نہیں کیا ابلا کھاتے تھے۔ ویسے وہ خوش بہت تھے۔ جس قسم
اور جیسے بدنوں کی لڑکیاں وہاں بیٹھی تھیں میں بھی بہت خوش ہوتا۔ میں نے کاؤنٹر کے
پچھے ہمہ وقت مسکراتے نیپالی سے پوچھا۔

”ادھر کھانے کو ملے گا؟“

”ملے گا۔“

”کیا کیا ملے گا؟“

”نیپالی فوڈ ہو گا سر۔“ اور اس کے بعد اُس نے اُنہی ابلا کھانوں کے نام لئے
جو گورا لوگ رغبت سے کھاتے تھے اور جو میرے سر سے گذر گئے۔

”ہاؤ چی۔۔۔“

”فکسڈ ریٹ ہے سر۔۔۔ گیارہ ڈالر۔۔۔ سات کورس کا ڈنر اور ایک بوتل بیئر۔۔۔“

”گیارہ ڈالر۔۔۔ یعنی تقریباً پانچ سو پاکستانی روپے۔“

”پاکستان؟“ وہ قطعاً طور پر اس لفظ کے لئے تیار نہ تھا ”آپ پاکستان سے آئے
ہیں؟“

”ابھی تو نہیں دو چار روز پیشتر آئے تھے۔ بھائی آپ کے پاس لاکارٹ مینیو
سٹاؤ والا فوڈ نہیں ہے۔“

”سوری سر۔۔۔ فکسڈ ڈنر۔۔۔ فکسڈ پرائس اور بیئر۔۔۔“

میں اعتراف کرتا ہوں کہ ڈالنے دار خوراک کی اس تفصیل نے مجھے
نویڈ مسرت دی کہ انا پورنا کا تمام تر طلسم زائل ہو گیا۔ ہم پھر سے چلنے لگے۔
ایک دورا ہا آیا۔۔۔

ہم رُک گئے۔۔۔ کس راستے پر سفر کریں۔۔۔ اس طرف یا اُس جانب۔۔۔ ہم
میں پڑ گئے۔۔۔

سکینہ اولیا میں آیا ہے کہ ایک درویش بابا اور اُن کا ایک نوجوان چیلہ جنگل
سفر کرتے تھے تو اُن کے سامنے ایک دورا ہا آ گیا۔ چیلہ رُک گیا اور پوچھا بابا ان دورا
راستوں میں سے کس راستے پر چلیں؟ اس پر درویش بابا تاؤ میں آگئے اور اُنہوں
اپنے خیمے چیلے کی ذرا گوشالی کی اور پھر اُس کے لیڈے کی تلاش لی۔۔۔ لیڈے کی با
جیب میں سے ایک عدد چوٹی برآمد ہو گئی، بابا جی نے اُس چوٹی کو جنگل کی تاریکی میں اُپ
دیا اور پھر چیلے سے پوچھا ”اب وہی سوال دریافت کرو کہ کون سے راستے کا چناؤ کرنا ہے
شاگرد نے کان لپیٹ کر کہا ”بس اُس چوٹی کی وجہ سے جھجکتا تھا کہ اُسے راہزن لوند
لیں۔۔۔ اب دونوں راستے ایک جیسے ہیں۔۔۔“ درویش بابا جان گئے تھے کہ اس کے پتے
مال ہے جو اسے خوفزدہ کرتا ہے۔۔۔

ہمارے پتے صرف ایک چوٹی نہ تھی بلکہ ڈالر اور سینکڑوں ڈالر کھکتے تھے۔
لئے ہم بھی جھجکتے تھے کہ کون سا راستہ اختیار کریں۔

چنانچہ بائیں جانب والا راستہ جدھر روشنی ذرا زیادہ تھی اور کچھ نیون سائٹ
دکتے تھے ہم نے محفوظ سمجھ کر اختیار کر لیا۔

اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم پیدائش کے بعد جو نمی ہمارے کانوں میں
دی گئی ہے ہم ادھر کھٹنڈو آنکے ہیں اور تب سے چلتے جا رہے ہیں۔

”یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ ہم اُس موئے دربار مرگ میں ہی جا رہے
سینڈوچ کھائیں۔ اگر راستے میں کوئی مناسب طعام گاہ نظر آگئی تو وہیں طعام کر لیں۔“

ہمیشہ دل و جان سے ہم سے اور بھوک سے عاجز آ چکی تھیں۔
اور عین اُسی لمحے ایک مندر نما عمارت کے باہر ”کھٹنڈو کچن“ کا سائٹ

دیا۔

لیکن جب میں اس ”کھٹنڈو کچن“ کے ریسٹوران سے نیچے آ رہا تھا... ہم تاریک سیڑھیوں میں یہاں سے گزرنے والے اور ہالیہ کی بلندیوں سے لوٹنے والے کوہ نور دور کی تصویریں دیواروں پر چسپاں دیکھتا تھا... جیسے کے ٹو موٹل سکرو کے برآمدوں میں کاپیاؤں اور کوہ نوروں کے پوسٹریں۔ کارڈ ہیں اور وہ مناظر ہیں جو خوف اور خطرے کی روپوش ایسی دادیوں میں ہیں جہاں صرف وہ پہنچے تھے... تو میں سوچتا تھا کہ اگر میرے ہر شہری بابا اور ہمشیرہ صاحبہ کی بجائے کوئی نانگا پریت، کوئی شاہ گوری کوئی راکا پوشی ہوتی، میں اُس کی برف سفیدی کے ساتھ قیام کے لئے اسی مقام کا چناؤ کرتا... ایک شب تو پہلا گذارتا۔

”بتت کے شاہ جی اور مغل شاہ زاوی...
نے چراغے نے گلے“

”ہاں جی۔“ میرے ساتھی فٹ پاتھ پر ٹپل رہے تھے۔

”ہمت منگا ہے... اور یوں بھی پنہالی فوڈ میں تیل کی بو ہوگی...“

”حلال بھی نہیں ہوگی؟“ ہمشیرہ نے عینک درست کرتے ہوئے ناک چڑھائی۔

”یقیناً نہیں۔“

”تو پھر آگے چلتے ہیں۔“

آگے ایک اور سنگم آ گیا... گئی رات میں کچھ ریسٹورانوں اور سے خانوں کے سامنے اب بھی روشن تھے اور وہاں سے موسیقی نیچے اتر کر ہماری آس پاس فٹ پاتھ بجتی تھی اور پھر سڑک کے پاس جاتی تھی جہاں تاریکی میں ڈوبتا، روپوش ہوتا ایک کتا جمیل کے پھیلاؤ جتنا ایک تالاب تھا... اور اُس کے عین درمیان میں کسی دیوی کا نور تھا جس میں چراغ جلتے تھے... موسیقی کی دھمک شاید اُن تک بھی پہنچتی تھی کہ اُن کی آواز قمر قمراتی تھی...

”یہاں تھوڑی دیر ٹھہرتے ہیں... شاید گمشدہ اور ملک مل ہی جائیں۔“

ہم وہاں تھوڑی دیر ٹھہرے... اور جب وہ تھوڑی دیر اختتام کو پہنچی تو ہم ایک اور تھوڑی دیر ٹھہرے اور جب وہ بھی ختم ہو گئی تو ہم چلنے لگے... سامنے فٹ پاتھ پر ایک ہانگ تھا جسے دو حضرات چلے آ رہے تھے۔ میں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اُنہیں روکا

”وہ بے شک اس تالاب میں ڈوب چکے ہوں، ہمیں اُن سے کیا...“ میں نے
 جمل کر کہا ”جناب ہمارے سامنے نیپال کے قیام کے دوران ایک ایسا وقت آیا ہے کہ ہم
 ہال گوشت کھا سکتے ہیں اور آپ اس لمحے پوچھتے ہیں کہ حسینہ گمشدہ اور روٹھ جانے والا
 لک کہاں ہے... آجائیں۔“
 ہم سب آگئے۔

ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ تالاب والی دیوی کے مندر میں چلتے چرائوں کی
 روشنی میاں تک نہ پہنچتی تھی... کشمیری مسجد کے مینار اور محراب نظر آئے تو ہم سب پھر
 سے مسلمان ہو گئے... کم از کم میں تو انا پورنا کا بھاری ہو چکا تھا اب تو بے تاب ہوا اور پھر
 سے ایمان لے آیا... من اپنا پڑانا پاپی تھا اور اگرچہ برسوں میں نمازی بن نہ سکا تھا لیکن
 کسی بھی مسجد کو دیکھ کر ہمیشہ یوں لگا جیسے بھٹکا ہوا آہو تھا اور گھر آ گیا ہوں... مسجد قرطبہ
 کے باہر لبنانی ناٹلا سعد تھی جو رات کی آخری ٹرین سے میڈرڈ جا رہی تھی اور اندر...
 اُس کے ہجوم نخیل ستونوں میں گھر تھا...

کشمیری مسجد کے دروازے میں سے چند نمازی باہر آرہے تھے...
 ہم نے ایک نہایت پرجوش سلام دعا کی تو وہ حیرت میں آگئے اور از حد جذباتی ہو
 کر ہمیں گلے لگانے لگے، ہمیشہ از راہ احتیاط ذرا پرے ہو گئیں۔
 اُس سے آگے ”تاج ہوٹل“ کا بوسیدہ بورڈ مسجد کے پہلو میں آدراں تھا۔
 ایک آہنی جنگلے کے برابر میں سے چند سیڑھیاں اُترتی تھیں۔
 آہنی جنگلے کے درمیان میں ایک چھوٹا سا گیٹ تھا اور اُس لمحے ہم نہیں جانتے
 تھے کہ یہ کس آزاد روح کو قید کرتا ہے... وہاں خاک میں کونسی صورت ہے جو پنہاں ہے۔
 ہم نہیں جانتے تھے۔

اندھیری سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے ہم نیچے گئے اور پھر ایک ہال نما
 کمرے میں داخل ہوئے جس میں گندم کی خوشبو تھی اور اُن ذائقوں کی مہک تھی جن
 کے لئے ہم ترسے ہوئے تھے...
 یہی ”تاج ہوٹل“ تھا۔

اور پوچھا... ”ادھر سے دربار مرگ کتنی دور ہے؟“
 ”ابھی قریب ہے۔“

اور میں یہ فقرہ بہت سن چکا تھا کہ ابھی قریب ہے۔ کوہ نور دی کے دوران ہر
 گائیڈ ہمیشہ یہی خوش خبری سناتا تھا کہ صاحب... فلاں وادی... فلاں چوٹی... ابھی قریب
 ہے۔ دُور نہیں... آگے میدان ہے۔ راستہ آسان ہے... دور نہیں... اور ہم اکثر اذیت
 اُس ”ابھی قریب ہے“ تک تین دنوں کی مسافت کے بعد پہنچتے تھے۔

ابھی میں اسی کشمکش میں تھا کہ ان کا اعتبار کروں یا نہ کروں جب اُن میں
 ایک میرے چہرے کے اتنا قریب آ گیا کہ میں نے اُسے ایک ”گے“ سمجھا اور بلا جھجک
 پورا نام پکار کر بولا، آپ وہ تو نہیں ہیں؟
 ”ہم وہی ہیں لیکن آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”صاحب ہم کشمیر سے آئے ہیں... ادھر گزر بڑ ہے تو ہمارا لوگ کلکتہ، بنگلور اور
 مدراس وغیرہ کاروبار کے لئے نکل جاتا ہے۔ کچھ ادھر نیپال میں آجاتا ہے اور ہمشینہ
 دستکاری کا کام کرتا ہے... ہم ادھر سرینگر میں تھا تو ٹیلی ویژن پر آپ کا پروگرام دیکھتا تھا
 تو آپ ادھر کدھر آگئے؟“

”یہ ایک درد ناک اور بھوکا داستان ہے کشمیری بھائی... کہ ہم ادھر کدھر
 آگئے... ہم بھوکے اور فاقہ زدہ ہیں آپ ہم پر صرف یہ احسان کرو کہ ہمیں بناؤ کہ آ
 کیں کھانا ملے گا یا نہیں؟“

”صاحب ادھر جائیں ”کشمیری برادر نے اندھیرے میں گم تالاب کی طرف اٹ
 کیا“ ادھر پہلے کشمیری مسجد آئے گی۔ پھر نیپالی مسجد آئے گی... اور وہیں مسلم ہوٹل
 تاج ہوٹل... بسم اللہ ہوٹل...“

”بسم اللہ...“ ہمیشہ نے خوش ہو کر زیر لب دوہرایا۔
 ”وہاں گوشت تو حلال ہو گا ناں؟“ سُہری بابا نے ایک فضول سوال کیا۔
 ”مسلمانوں کے ہوٹل میں جھنکا گوشت تو نہیں ہوتا صاحب۔“
 ”indeed“ سُہری بابا نے فوراً سر ہلایا ”کیسے ہو سکتا ہے؟“
 ”خالہ اور سلمان کہاں ہو سکتے ہیں...“ فاروق اپنے دوست کے لئے فکرت

”در گذر کرتے“ اور کہتے کہ لے آؤ....
 ”صاحب تندوری چکن تو ختم ہو گیا.... آپ بہت دیر سے آئے ہو.... دال مکھن
 ہوگا آؤ قہر ہوگا، چکن کشمیری ہوگا.... گوشت بھنا ہوا ہوگا.... تندور کاروٹی ہوگا....“
 اور جوں جوں وہ تبتی شاہ صاحب ان خوراکیوں کا نام لیتے تھے توں توں ہر شخص
 کے گلے میں اُس خوراک کے ذائقے کا ایک ایک گھونٹ اُترتا تھا۔

تندور کی روٹی ہم تک گرم پہنچتی تھی.... ایسے کہ ایک نیپالی مسلمان بچہ اپنی
 دونوں ہتھیلیاں پھیلانے روٹی اُن پر رکھے اُس کی جلن سے بچنے کے لئے اُسے اُچھالتا ہوا
 ہاری میز تک آتا تھا اور پھر لوٹ جاتا تھا.... پاز اور سبز مرچیں بھی تھیں۔ کوئی تبتی چینی
 بھی تھی۔ سفید چاول بھی تھے.... اور تمام ڈشز جن کے لئے ہم نے تبتی شاہ صاحب پر
 اعتبار کیا تھا ایسی خوش ذائقہ اور مزیدار تھیں کہ ہم سولتی ہوٹل کی خوراک کی ساری
 بد مزگی بھول گئے.... ہم نے سیر ہو کر کھایا.... بلکہ مختصر سیر نہیں ہم سب ایک لمبی سیر پر نکل
 گئے۔

”تارڑ صاحب.... میں آج پشاور کی نمک منڈی کے شنواری تکتوں اور بخشو کے
 کبابوں کو بھول گیا ہوں۔“
 ”اور میں میکلوڈ روڈ کی چانپوں اور گردوں کپوروں کو فراموش کر گیا ہوں۔“
 ”اور تارڑ صاحب.... میں تو کھٹمنڈو شہر کی تمام تر شاپنگ کو بھول گئی ہوں۔“
 اور ہم سراسر ایک اچانک گھبراہٹ اور تعجب میں آگئے کہ خالدہ گمشدہ بھی ہم
 نما ہیں۔ اور وہ تھی.... اور ملک صاحب بھی تھے۔

جب ہم نیپالی مسجد کی جانب اپنے کشمیری بھائیوں کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے
 تھے تو سامنے سے نیم تاریکی میں سے دو افراد ٹہلنے ہوئے نمودار ہوئے۔

”آپ کہاں گم ہو گئے تھے؟“ انہوں نے ہم سے.... یعنی ہم سے دریافت کیا تھا۔
 ”تارڑ صاحب ہم تو بہت پریشان ہو گئے تھے“ خالدہ گمشدہ نے سرگوشی کی اور
 گلاب کے درمیان دیوی کے مندر کے بجھتے دیوں کے عین سامنے کی ”آپ ہمارے
 گروپ میں سب سے برگزیدہ.... پتہ نہیں یہ لفظ صحیح بھی ہے یا نہیں.... یا شاید بزرگ
 نصرت کتا چاہئے تو ہم آپ کے بارے میں فکر مند تھے کہ کہیں خدا نخواستہ.... کسی دیوں

ری سپیشل ڈیک کے اُوپر پوری دیوار کو ڈھلکا ہوا خانہ کعبہ کا ایک جھانسی پڑا
 تھا.... یہ کھنڈوں کی دنیا کے بت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا تھا۔

ہال نما ریستوران کے آخر میں تازہ اور گرم روٹی کی خوشبو جنم لیتی تھی اور ہر
 مکہ ایسے اُٹھتی تھی کہ ہمیں اس جہان سے اُٹھاتی تھی، ایک بڑی میز کے گرد کھلائی جلتے
 والی خوراک کے چکنائی سے ٹھنڈے ہوتے برتنوں اور پیٹوں کے سامنے چند نیپالی
 ٹوپیاں بار بار درست کرتے جانے کسی موضوع پر گرم گرم بحث کر رہے تھے....

ریستوران کا مالک ایک نڈل ایج سیاہ موٹھوں اور قدرے چپٹی ناک والا شہر
 تھا.... میں نے اپنی پارٹی کا تعارف کروایا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے....
 ”مسلمان ہے الحمد للہ....“

میں نے اُس سے یہ پوچھا مناسب نہ سمجھا کہ وہ کونسا مسلمان ہے.... شیعو ہے
 سنی ہے، وہابی ہے، دیوبندی ہے.... اور کیا وہ رفع یزدین کتا ہے یا نہیں.... ”آپ کہاں
 ہے؟“

”صاحب میں تبت کا مسلمان ہوں.... سید امان نام ہے۔ ادھر نیپالی مسجد کے ایک
 کونے میں یہ ہوٹل بناتا ہوں۔ کشمیری بھائیوں سے کھانا پکانا سیکھتا ہوں.... تور لگایا ہے اور
 گرم گرم روٹی بناتا ہوں.... لیکن ادھر پاکستانی بھائی تو نہیں ہوتا.... جو ہوتا ہے وہ ادھر کچھ
 مال لاتا ہے اچھا نہیں ہوتا تو آپ کدھر سے آیا؟“

”شاہ جی۔ ہم کفر اور الحاد اور جھٹکے کی مرغیوں اور حرام گوشت سے تنگ آ کر
 ادھر آ گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ کھانے کو کیا ملے گا؟“

”صاحب مجھے تو اتنا خوشی ہے کہ میرے پاس بھائی آیا ہے۔ بہن آیا ہے، آپ
 مجھ پر اعتبار کرو جو کھلائے گا انشاء اللہ اچھا کھلائے گا....“ وہ تبتی سید شکل سے ایک لٹی
 بھی ہو سکتا تھا.... مانسہرہ وادی کا باشندہ بھی ہو سکتا تھا.... ”آپ مجھ پر اعتبار کریں“
 ”کر لیا....“ سُہری بابا نے کہا۔ ”لیکن آپ کا فوڈ کتنی آئی سی کا ہوگا؟“
 ”آپ بھول جاؤ صاحب.... زیادہ نہیں ہوگا۔“

”پھر بھی کیا کھلائے گا؟“ اور یہ سوال قطعی طور پر بیسودہ تھا کیونکہ ہم بھوک کی
 اُس حالت میں تھے کہ وہ اگر کتا کہ صاحب لحم سگال ہے.... کوفتہ ہائے بلیاں ہے جب بھی

تو آج بھی اسی کیفیت کا ایکشن ری پلے ہو رہا تھا۔
ہم نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہماری زندگی ہے۔ ہم نیپال میں قیام پذیر ہیں۔
اب تک ہم اس ہوٹل تاج کے بھاری رہیں گے۔

کھانے کے بعد قہوہ آیا اور اُس سے فارغ ہو کر جب پوری ٹیم اُونگھنے کے موڈ
میں تھی میں نے جیتی سید کو بلایا اور ذرا ہولے سے پونچھا ”سید بادشاہ یقین کیجئے کہ آج
میں پشتر ٹیچے کبھی شائبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ تبت میں بھی سید ہوتے ہیں۔ تو یہاں کھٹنڈو
میں۔۔۔ کیس مغل شہزادی حضرت محل کی قبر ہے۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ کہاں ہے؟“

سید بادشاہ میرا خیال ہے اُونچا سنتے تھے۔۔۔ کان پر ہاتھ رکھ کر بولے ”ہاں جی ہم
یہاں بہت خوش ہیں۔۔۔ مسلمان ادھر نیپال میں صرف پانچ فیصد ہیں لیکن امن آشتی سے
رہتے ہیں۔۔۔ پچھلے برس تھوڑا سا ہندو مسلم فساد ہوا تھا لیکن حکومت نے بہت سختی سے
اپنے لوگوں کو دبا دیا۔۔۔ اب دیکھیں ناں ادھر اس روڈ پر دو مسجدیں ہیں۔۔۔ نیپالی اور
ٹہیری۔۔۔ لیکن کبھی بھی یہ کوشش نہیں کی گئی کہ ان کے سامنے یا پسوں میں کوئی مندر بنایا
جائے۔ حکومت نے بھی منع کر رکھا ہے کہ یہ مسلمان لوگوں کا علاقہ ہے ان کو اپنے خدا
کی پرستش کرنے دو۔۔۔ یہ نیپالی لوگ امن اور آشتی سے رہتے ہیں جناب۔۔۔“

”ہم بھی رہتے ہیں۔۔۔“ میں نے فوراً کہا ”صرف یہ ہے کہ ہم نکانہ صاحب میں
گورودوارہ جنم استھان کے عین سامنے۔۔۔ جہاں سکھوں کے بابا نانک کا جنم ہوا تھا اُس کے
سامنے۔۔۔“

”مارڈ صاحب ایک تو ہم آپ کے اس سکھ کامپلیکس سے بہت عاجز آ چکے
ہیں۔۔۔“ ہمشیرہ نے نہایت ناپسندیدگی سے کہا۔ حالانکہ موصوفہ میرے حصے کی مکھن دال
میں نوش کر چکی تھیں۔

”میری بات تو سن لیجئے ہمشیرہ۔“

”سنتے ہیں۔“ اُنہوں نے بیزار ہو کر کہا۔

”تو ہم اُس گورودوارے کے عین سامنے جہاں اُن کے پیغمبر کا درود ہوا تھا ایک
مٹا نشان مسجد ضرور تعمیر کرتے ہیں تاکہ اُن کافروں کے کانوں تک پیغام توحید ضرور
پہنچے۔“

وغیرہ کو دیکھ کر آپ کو کچھ ہونہ گیا ہو۔۔۔ کہاں تھے آپ۔۔۔“
”جہاں فاروق، ہمشیرہ صاحبہ اور شہری بابا تھے۔۔۔“

”اُن کو بھی آپ نے اپنے ساتھ گم کر لیا۔“ گمشدہ نے سادگی سے کہا۔ اور اس
سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔۔۔ ”انا پورنا کے مندر کے بعد ایک دورا ہا آیا تھا۔ تو
کچھ دیر کھڑے رہے کہ پتہ نہیں آپ نے کونسا راستہ اختیار کیا ہے اور پھر دائیں چائے
چلے گئے۔“

”اُن کو ادھر ایک نیپالی سرگڑیوں کی دوکان نظر آگئی تھی۔۔۔“ ملک صاحب
بے چارگی سے بولے۔ ”پھر ہم چلتے چلتے گئے اور یہ تالاب نظر آیا تو اس کے کنارے
کنارے چلتے گئے تو آپ سامنے سے آگئے۔۔۔“
چنانچہ گمشدہ اور ملک صاحب اب ہمارے درمیان موجود تھے۔

اس مسلمان خوراک نے ہمیں عجیب مست کر دیا بلکہ تھوڑا سا است بھی
دیا۔۔۔ اگرچہ نصرت فتح علی خان تو یہی الپتا تھا کہ یہ جو ہلکا ہلکا سا سرور ہے، یہ تری نظر
قصور ہے۔۔۔ لیکن ہمارے تن بدن میں جو اُس شام سرور تھا یہ جیتی شاہ جی کی خوراک
قصور تھا۔۔۔

اس سرور سے میں ایک مرتبہ پھر فلیش بیک میں چلا گیا۔

جب انگلستان میں پورا ہفتہ میں اپنی لینڈ لیڈی کی بنائی ہوئی۔۔۔ اسپل پائی، روسا
بیٹ، کڈنی پائی اور یار کشار پڈنگ کھا کھا کر موجود محبتوں سے بھی بیزار ہو جاتا تھا اور وہ
اینڈ پر لندن کا ٹکٹ کٹا لیتا تھا۔ پکا ڈلی سرکس کی قربت میں ایک پاکستانی ریسٹوران
”کوہ ٹور“ نام کا ہوا کرتا تھا۔۔۔ میں وہاں ناشتے کے بغیر، لچ کے بغیر تقریباً تین بجے پہنچتا
اپنا مختصر آرڈر ویٹر کے گوش گزار کر دیتا۔۔۔ دو تندوری چکن پرائٹھے، ایک ڈش مشروبات اور
قیمہ، بھنا گوشت اور دال ماش۔۔۔ سلاد اور مشروبات کے علاوہ۔۔۔ پہلی بار ویٹر نے جب
تاخیر کر دی تو میرے سرزنش کرنے پر بولا ”صاحب آپ کا ڈوسرا گیٹ آجائے گا تو
گرم لے آئے گا“ اس پر میں نے بولا ”میں واحد گیٹ ہوں۔ لے آؤ“ یہ پاسن
خوراک کھانے کے بعد جب میں لندن کی شام میں نکلتا تو ایک مست ہاتھی کی طرح
ہوا نکلتا۔۔۔ راہ گیری سمجھتے کہ میں مکمل طور پر ”ٹن“ ہوں۔۔۔

بہندر کے چوٹی مجسموں کی اُس ہوا میں جس میں وہ جنسی سانس لیتے تھے.... جہاں کوئی
 ایسا نہ تھا آل تیمور کے خاک ہونے کا.... شب کی تاریکی میں.... ایک نائیلون کی رتی کو
 لٹکانے کو لانا.... آہنی پینڈل کو زور لگا کر آزاد کیا تو وہ دروازہ یوں آہستگی سے کھلا جیسے
 برے ہی بس کا شہر تھا۔

یہاں اس لئے شب کی سیاہی تھی کہ شب تھی۔ ہر مزارِ ماغریباں نے چرانے نے
 مزار کے اُوپر ایک بلند دیوار اُٹھتی تھی۔

دیوار پر ایک ہیڈ ڈریسر.... ایک بیوٹی سیلون اور ایک ٹریول ایجنسی کے بورڈ اعلان
 کرتے تھے.... ہیڈ ڈریسرنگ ان کھنڈو.... بیوٹی فائی یور سیلف.... ٹریول ان نیپال....
 اور اُن کے نیچے.... جب آہنی دروازہ وا ہوا اور میں اندر گیا تو صرف ایک قبر

فری کھنڈو ٹائٹ میں گھری ہوئی....

اُس کے گرد دو چوتھے تھے اُس کا احاطہ کرتے ہوئے جن پر وِٹکا روزیا یعنی

ادب ہمار کے پودوں کے گلے دھرے تھے.... پڑمردہ اور بے زوج.... سدا ہمار کا پھول

دراصل پھول کھلانے کا مستحق ہی نہیں ہے.... یہ ہمار کا ایک ہمانہ ہے ایک مفاہمت

ہے.... پھول ہمیشہ وہی خوبصورت ہوتا ہے جس کی زندگی چند روزہ ہو.... قبر کے سرہانے

ایک کتبہ بھی تھا جو تاریکی میں کم دکھتا تھا اور اُس پر جو کچھ درج تھا وہ مٹ چکا تھا.... پڑھا

نہیں جاتا تھا.... حضرت محل کی قبر دیکھ کر مجھے افسوس نہیں ہوا.... کیونکہ میں بہت سی ایسی

قبریں دیکھ چکا تھا جو اپنی عظمت اور جلال کا اعلان نہیں کرتیں.... بلکہ پوشیدہ رہنا چاہتی

ہیں۔ دمشق میں صلاح الدین ایوبی کی قبر.... جامع اُمیہ کے پہلو میں نہایت سادہ اور گوشہ

گشا ہے.... دمشق ہی کے قبرستان باب الصغیر میں حضرت بلال حبشی ایک سادہ آرام گاہ

مٹا خاک نشیں ہیں، وہاں اُمت المؤمنین کے مدفن بھی ہیں اور کربلا کے شہداء کے

مقبرے.... فلارنس میں میں مائیکل انجلو کی قبر انجانے میں بیٹھ گیا تھا۔ دارا شکوہ کی بیگم تادہ

مقام حضرت میاں میر کے مزار کے سامنے دفن ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں۔

کھانا میں باہر کی قبر کی کوئی توقیر نہیں....

لیکن اس کے باوجود.... آپ بے شک دُنیا کے بہترین ماہر تعمیرات سے عالی شان

مقبرہ تعمیر کرائیں.... تاریخ کا ایک اپنا مقبرہ ہوتا ہے....

”تو پہنچتا ہے؟“

”نہیں۔“

”لاؤڈ سپیکر کے بغیر پہنچاتے ہوں گے۔“

”نہیں....“

”تو پھر کیوں نہیں پہنچتا؟“

”کیونکہ وہ ہماری نسبت کہیں زیادہ توحید پرست ہیں.... بلکہ اس معاملے میں

اتنے بنیاد پرست واقع ہوتے ہیں کہ اپنی عبادت گاہ میں سوائے ایک گرتھ صاحب کے

کوئی بت، کوئی تصویر کوئی شبیہ نہیں رکھتے۔“

”واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔“

”اس لئے کہ آپ اپنے سچ سے باہر نکل کر کبھی یہ نہیں کہتے کہ ذرا ادھر بھی

جھانک لیتے ہیں۔“

تبی شاہ جی ذرا پریشان ہو گئے کہ ہم کدھر سے کدھر نکل گئے ہیں۔

تو میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال بہ آواز بلند دوہرایا ”ادھر کہیں اس شہر میں....“

ایک مغل شہزادی کی قبر ہے.... حضرت محل.... جس نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف

جنگ کی تھی.... آپ جانتے ہیں کہ کہاں ہے؟“

”اچھا شہزادی صاحبہ کی قبر....“ شاہ جی نے سر بلایا ”آپ جن میٹھیوں سے اُز

کر ہوٹل میں آئے ہیں وہاں دوسری میٹھی کے برابر میں ایک آہنی جنگلا ہے.... اُس کے

اندر ہے.... شہزادی صاحبہ نے جنگ لڑی تھی؟“

”ہاں۔“ میں نے قہرے کا آخری گھونٹ بھرا۔ ایک سگریٹ پیا اور اٹھ کھڑا

ہوا.... کسی نے بھی یہ نہ پوچھا کہ کدھر جاتے ہو....

باہر تاج ہوٹل کی میٹھیوں کے برابر میں ایک لوہے کا گیٹ رات کی تاریکی میں

بمشکل دکھائی دیتا تھا۔

نائیلون کی ایک بوسیدہ رتی اُسے بند رہنے پر مجبور کرتی تھی۔

کھنڈو کی سیاہ رات میں.... جو اُس مہاتما بڈھ کے بدن کی طرح سیاہ تھی ہے

ایک بھاری ریگ مال سے چکاتا تھا۔ دھوکا دربار اور لوئگ گاڈیس کی نگری میں۔

ہر خاک نشین کا حساب کتاب ہوتا رہتا ہے۔
 وہ بے شک کسی محل میں دفن ہو جائے یا کھنڈو کے تاج ہوٹل کے ایک
 کونے میں، اُس کا حساب کتاب تاریخ کرتی رہتی ہے۔ اُس کے کھاتے میں نفع نقصان
 اندراج ہوتا رہتا ہے۔ قبروں کی عظمت یا سادگی یا گمشدگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
 جانتا ہے کہ ارسطو کہاں ہے۔۔۔ ہو مری قبر کہاں ہے۔۔۔ اور قلو پطرہ کہاں دفن ہے۔۔۔
 اردو ادب کے ایک معتبر نقاد مظفر علی شید نے کھنڈو یا ترا سے پیشتر۔۔۔ اپنے ایک
 زدہ بدن سے مختصر سانس کھینچتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ تم حضرت محل کی قبر پر ضرور جانا۔
 تو میں نے عرض کیا تھا۔۔۔ شاہ جی اگر میں وہاں تک پہنچتا ہوں تو وہی دیکھوں گا۔
 دوسرے دیکھتے ہیں، ایک قبر کے سوا کیا دیکھوں گا۔
 تو اُن کی شرارت بھری آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی تھی۔۔۔ مجھے یقین
 کہ تم کچھ اور دیکھو گے۔۔۔
 اور وہ کچھ اور کیا تھا۔۔۔

حضرت محل کی قبر کے درمیانی مستطیل کپتے حصے میں سے اُبھرتا ہوا ایک ناقہ
 یقین حد تک نیپال گمری کی رات میں بلند ہوتا ہوا سرو کا ایک درخت۔۔۔
 ٹیڑھا اور قدرے خشک ٹہنیوں والا سرو کا درخت۔۔۔
 کسی بھی قبر کی مٹی میں سدا ہمار کے بے معنی پھول لگائے جاسکتے ہیں۔۔۔ اُس
 کچی مٹی جب بارشوں سے بیٹھتی ہے تو کسی بھی قبر پر خود رو بد نما گھاس سر اُٹھا سکتی ہے۔
 نامعلوم جھاڑیوں کے بیج پھوٹ سکتے ہیں۔۔۔ بول کے پودے اُگ سکتے ہیں لیکن۔۔۔ ایک
 سرو کا درخت وہاں کیسے اُگ آیا۔۔۔ حضرت محل کے سینے میں جڑیں پھیلائے اور یہ جڑیں
 فرغانہ تک جاتی تھیں ایک سرو کا ٹیڑھا ترچھا درخت تھا جو کھنڈو کی ملد شب میں۔۔۔
 میں ایک ہجاری مہمانا بُدھ کے مجھے چکاتا تھا اور انا پورنا دیوی کے مندر کی گھنٹیاں بجنی
 تھیں اور حضرت محل کی قبر کے پار سڑک کے دوسرے کنارے سے وہ تالاب شروع ہوا
 تھا جس میں نامعلوم دیوی کے چرنوں میں چراغ جلتے تھے اور ادھرتے چراغ۔۔۔ وہ
 یوں بلند ہوتا تھا جیسے عرش پر دستک دینے کو جاتا ہے۔۔۔ فریاد کرتا ہے کہ میں تجھ تک
 نہیں سکتا کہ میرے راستے کو ایک ہیڈ ڈیسر، ایک بیوٹی سیلون اور ایک ٹریول ایجنسی کے

کرچن.... جس کا بھید ہم جان چکے تھے، کوئی ایک نظر اُس پر کرتا تھا، جو تیری
ہم کہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ، نظر ہوتی تھی۔
دپتی، اوشا اور پرکاش نہایت اُن تھک اور اپنے اپنے عجیب لہجوں میں انگریزی
سلل بولتے تھے....

مسعود.... طالبان کے افغانستان کا مسعود اپنی نوجوان ریش میں ملبوس اپنے ایمان
اسلامت رکھنے کے لئے خواتین کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔
بلکہ دہشی خواتین اپنے سر جوڑے.... سرگوشیاں کرتی تھیں.... بلکہ سروں کے
جوڑے جوڑے سرگوشیاں کرتی تھیں....

پونی ٹیل والا نیپالی کیمرہ مین اور ہدایت کار.... دینپندرہ گاؤچن اپنے مستقبل کے
رزق کے لئے کرچن کو متاثر کرنے کی کوشش میں تھا۔

اور وہاں ایک خاتون.... نیپال میں ہی تعینات تھیں.... شاید امریکن تھیں.... این
سکاٹ وٹ نام کی تھیں.... نہایت بے ضرر اور نفیس خاتون تھیں لیکن گھوڑا خاتون
نہیں.... میں بدتمیزی اور بے ادبی کو بُرا سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں کہ میرا مشاہدہ ہے، ہم
میں سے پیشتر لوگ اگر ہم غور کریں تو کسی نہ کسی جانور سے مشابہت رکھتے ہیں.... یہ
مشابہت بہت خفیف بھی ہو سکتی ہے اور روشن اور چونکا دینے والی بھی.... مثلاً میں ان
دلوں آکھینے میں اپنی شکل پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک غصیلے نل
ڈوگ کو دیکھ رہا ہوں.... ”کالاسترا“ کے مصنف داسیایانہ نے ہزاروں برس پیشتر عورتوں
کی تین اقسام گنوائی تھیں.... بہنی عورتیں، تھنی عورتیں اور گھوڑی عورتیں.... اگر آج
لا این سکاٹ وٹ کو دیکھ لیتا تو اُن میں گھوڑا عورتیں کی ایک قسم بھی شامل کر لیتا....
میں بہت شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اُس کی جانب دیکھتا تھا تو وہ مجھے ہنساتی ہوئی لگتی
تھی....

اور پاکستانی وفد کیا کر رہا تھا اس نیپالی پرنس کیپ میں....
ملک صاحب ہم سب پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ ہم شرافت اور گوری تہذیب
کے دائرے میں رہیں اور تنقید سے پرہیز کریں۔

فاروق.... مونچھیں سنوارتا تھا.... اور تب زیادہ سنوارتا تھا جب وہ چیتا خاتون روپا

”دربار مرگ... شراب حاضر کباب غائب“

ایگزائڈر سوٹزے نٹن کا ناولٹ ”اے ڈے ان دی لائف آف آہون
ڈانسوچ“ مجھے بے حد پسند ہے.... اور میں نے اسے بنیاد بنا کر ایک کہانی ”غلام دین۔
عرف آہون ڈانسوچ“ بھی تحریر کی تھی....

یہ ایک اوپن ایئر قید خانے میں بند ایک قیدی کا روزنامہ ہے کہ صبح بیدار ہو کر
رات سونے تک وہ کن کٹھن کلفتوں میں سے گذرتا ہے.... اور یہ ناولٹ مجھے پسند
لئے ہے کہ آہون کا شیڈیول اور روزمرہ کی زندگی ہو ہو وہی ہے جو ہمارے معاشرے میں
کسی بھی حلال کی روزی کمانے والے شخص کی ہوتی ہے۔ وہ بھی خاندان، روزی روزگار
اور معاشرے کے اصولوں کی قید میں ہوتا ہے، وہ اس خاص شیڈیول کے مطابق جکڑا ہوا
زندگی بسر کرتا چلا جاتا ہے۔

کھٹنڈو کانفرنس بھی ایک ایسا ہی قید خانہ تھا اگرچہ ہوٹل سولتی کی دنیا کی بہترین
سہولتوں میں تھا جس میں ہم ایک لگے بندھے شیڈیول کے مطابق زندگی بسر کرتے چے
جاتے تھے....

نیپالی سفید کمر والی چیتا حسینہ روپا گوری بے آقاؤں سے بڑھ بڑھ کر گوری ہو رہی
تھی....

میری این.... حسب سابق اپنے حفوظ شدہ چہرے کے ساتھ.... بلا بلا.... بولے ہیں
جا رہی تھی....

قیدیوں نے اپنی کلائیوں میں جکڑی ہوئی تہذیب اور شانگسی کی بیڑیوں سے اپنے
پاؤں کو آزاد کیا۔۔۔ اپنے پر کھولے۔۔۔ جو بدنوں سے چپک چپکے تھے۔۔۔ پرندے جو اپنی اڑان
بھول چکے تھے۔۔۔ اپنا آسمان بھول چکے تھے۔۔۔

جو کھنڈوں کے اُن گوشوں پر اُترنے کے لئے بے چین تھے جو اب تک اُن کی
اڑان سے باہر تھے۔۔۔

سُہری بابا۔۔۔ ایک احتیاط پسند پرندہ تھے۔۔۔ جو آفیشل اُڑان کرتے تھے اور اُن
پنڈل بہت کچھ کر گزرتے تھے۔۔۔

فاروق۔۔۔ لو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ والے پرندے تھے۔۔۔

ہمشیرہ صاحبہ۔۔۔ ایک نہایت مدبر۔۔۔ اندر سے ہوشیار اور کائیاں۔۔۔ ایک بار بار
انہیں جھپکنے والا پرندہ تھیں۔

ملک۔۔۔ گوروں کے جال میں جکڑے ہوئے ایک بڑے تھے۔۔۔ جو بے بس اور
دبھے ہوئے تھے۔ اور گمشدہ۔۔۔ ایک ایسی بلبل جو صرف اُس نشی پر بیٹھتی تھیں جہاں
الطینان سے ”راگ شاپنگ“ گاسکے۔۔۔

اور ان کے سوا میں۔۔۔ جو اپنی راکھ میں جل کر تقض نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ راکھ ہی
ہتا تھا۔ جس کے پر جھڑ چکے تھے اور اُس میں ہوس ہی ہوس تھی۔۔۔ زندگی کی۔۔۔ شاہ
لوری کی اور انا پورنا کی۔۔۔ اُس کی چونچ ڈھیلی ہو چکی تھی اور اس کے باوجود وہ چگنا چاہتا
۔۔۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ دن قریب آ رہے ہیں جب وہ ایک ایسی جھیل کا رخ کرے گا
جس پرندے مرنے کے لئے آجاتے ہیں۔

اور پاروشنی اُس کے مُردہ بدن کو اُٹھا کر کے گی، اور اُس کی چونچ میں پانی
بٹے ہوئے کے گی ”تم بھی اس جھیل پر مرنے کے لئے آگئے ہو۔۔۔؟“

پرندہ کوئی جواب نہ دے گا، وہ مرچکا ہوگا۔۔۔

میں وہی پرندہ تھا۔

شام کے لئے منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔۔۔

”نارڈ صاحب۔۔۔ نکل چلیں“ گمشدہ نے ایک پیاسی اور خوفزدہ فاختہ کی طرح

بولتی تھی۔۔۔ ہمیشہ بہت دیر تک اپنا نکتہ نظر بیان کرنے کی کوشش اور اجازت میں ایک
ناتواں سا ہاتھ بلند کرتی تھیں اور ہیڈ ماسٹر کو یہ سمجھتا تھا کہ وہ پہلو بدل رہی ہیں۔
ہمشیرہ کو بولنے کا موقع نہ ملا تو وہ باقاعدہ خفا ہو گئیں۔۔۔

میں بھی بہت دیر تک۔۔۔ ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے۔۔۔ چپ بپ
تماشہ دیکھتا رہا تو جانے ہیڈ ماسٹر کو میرا خیال کیسے آگیا ”ماسٹر تارڑ آپ کیوں نہیں بول
رہے؟“

”ہر کانفرنس میں کم از کم ایک صابر و شاکر سامع بھی تو ہونا چاہئے اور وہ میر
ہوں۔۔۔ آپ لوگ چپ کریں گے تو میں بولوں گا ناں۔۔۔“

خالدہ سرگوشی۔۔۔ گمشدہ ہو چکی تھیں۔۔۔ وہ چپکے سے کھسک گئی تھیں اور جانے
کہاں بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔

اگرچہ آغاز سے اب تک ایک غیر تحریری اصول کے مطابق کانفرنس ہال میں
”نوسموگنگ“ پر عمل درآمد ہو رہا تھا لیکن میں نے۔۔۔ صرف اپنی سرکشی کے مظاہرے کے
طور پر ایک سگریٹ سلگایا اور اُس کا دھواں دُور تک پھیلایا تاکہ دیگر مندوبین ”غیر
متحرک سگریٹ نوشی“ کی زد میں آکر بیٹھے کینسر کا شکار ہو جائیں۔

فاروق نے میری جانب مسکرا کر تشکر آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنی جیب میں
سے اُس پیکٹ کو آزاد کیا جو قید تنہائی سے تنگ آچکا تھا۔۔۔

میری این نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی اور میں نے اُسی سرکشی کے ساتھ اُس
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ جو کرتا ہے کر لو۔۔۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔۔۔ اگر وہ
مجھے تنہا اور برہنہ کسی تاریک بارشوں والے گھنے جنگل میں بھی مل جاتی تو میں اُس کی
بجائے کسی نزدیک ترین درخت کے تنے کو آغوش میں لے لیتا۔۔۔

اور کانفرنس ہال کے بارونیشن بلائینڈز کے پار میرے وہ تینوں دوست سُرخ اور
سفید لپ سنک کے بوسوں سے لٹھڑے ہوئے چیری کے درخت مجھ پر لعن طعن کرنے
تھے۔۔۔ مجھ پر تمہرا بھیجتے تھے۔۔۔

مجھ آئیوں ڈ۔۔۔ نسوج کو فرار ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

سیشن کا اختتام ہوا۔۔۔

”جی تو تارڑ صاحب... کدھر چلنا ہے...“ سُہری بابا اپنی داڑھی سنوارنے لگے
 ”میں ذرا موقع محل کی مناسبت سے مناسب ڈریس زیب تن کر آؤں...“
 ”ابھی پتن باقی رہ گیا ہے جو دھوکا دربار کے بعد کھٹنڈو کا سب سے بڑا ٹیپل
 ہاپلیکس ہے۔“
 ”وہ پھر کبھی دیکھ لیں گے“ ہمشیرہ نہایت بیزار ہو کر بولیں ”مندر وغیرہ بہت

”ہو چکے۔“
 ”تو پھر ہم ٹورسٹوں کے گڑھ... کھٹنڈو کے سب سے رونقی علاقے تھمل میں
 چلے ہیں۔“
 ”یہ... حمل کیا جگہ ہے...“ سُہری بابا نے خواتین کی موجودگی کا ڈرہ بھرا احساس

نہ کیا۔
 ”سریہ تھمل ہے... حمل نہیں...“
 ”Indeed...“ انہوں نے کہا...
 ”لیکن ابھی ہم کانفرنس سے فارغ ہوئے ہیں... تھکے ہوئے ہیں، تو آج کی آوارہ
 گردی تو منحصر ہے اس بات پر کہ آپ اپنے اپنے کمروں میں جا کر کتنی دیر کے بعد فریش
 ہو کر نکلتے ہیں...“
 ”کس کے ساتھ فریش ہو کر...“ فاروق ہنسنے لگا... اور پھر ہمشیرہ کی قبر آلود
 نظروں کی تاب نہ لا کر لبوں کو بھیج کر خاموش ہو گیا۔

”پلیز آپ زیادہ فریش نہ ہوں...“ میں نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی ناکام
 کوشش کی ”دراصل آج کے پروگرام کا انحصار ہے آپ کے بننے سنورنے اور پھر لابی
 ٹما اُترنے کے وقت پر...“

”ویسے آپ کا کیا خیال ہے تارڑ صاحب...“ تھکی ہوئی گمشدہ اتنی تھکی ہوئی
 تھی کہ اپنی بھاری پلکیں بھی نہیں اٹھا سکتی تھی...
 ”میرا تو یہ خیال ہے کہ ہم باہر نکلیں... زیادہ سامان اٹھانے کی ضرورت نہیں
 صرف ایک ایک ٹوتھ بُرش جیب میں ڈالیں... ڈالر تو ہماری جیبوں میں پہلے سے موجود
 تھا اور دو ٹیکسیوں میں سوار ہو کر گمر کوٹ کے لئے روانہ ہو جائیں، ڈیڑھ گھنٹے میں ہم

فریاد کی...“

”ذرا باہر جھانک لینے میں کیا حرج ہے...“ ہمشیرہ صاحبہ گویا ہو گئیں۔
 ”شاہ جی...“ فاروق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا... اور اُس کی آنکھیں
 ہمیشہ فروغ سے سے چراغاں لگتی تھیں ”بلکہ سرجی جوانی بوسیدہ ہوتی چلی جا رہی ہے تو
 کھٹنڈو بائی ٹائٹ ہی دکھا دیں۔“
 ”کیوں میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کھٹنڈو بائی ٹائٹ دکھانے کا... میں بھی آپ
 طرح پہلی بار یہاں آیا ہوں...“
 ”لیکن سرجی تجربہ بڑی چیز ہے... آپ ہمارے گروپ کے گرگ بزرگ ہیں۔
 ہمیں راستہ دکھائیں بابا جی...“

میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ سکول ایج کے زمانے میں، ٹین ایج کے دنوں
 میں... میرے جو کلاس فیلو تھے وہ اگر تب ذی شعور اور دانائے تھے تو اب بزرگ ہو کر ان
 دانائی مستحکم ہو گئی تھی۔ اور اگر تب وہ احمق اور اُتو کے ٹھپے تھے تو ایک دو اشتنا کے علاوہ
 بزرگی تک پہنچ کر وہ جوں کے توں تھے غمراور تجربہ انہیں بگاڑ نہیں سکا تھا تو بہت سارے
 بزرگوں نے شدید ”مانڈ“ کیا تھا... تو یہ بزرگی بھی ایک عجیب لبادہ ہے جس میں آپ
 تمام تر حماقت اور کم علمی پوشیدہ ہو جاتی ہے... اور آپ کو صرف سفید بالوں کی وجہ سے
 وعظ کرنے کا حق مل جاتا ہے...“

میں اگرچہ گرگ بزرگ ہو چکا تھا... لیکن مجھے تجربے نے نہیں... صرف اُن
 نے بزرگ کر دیا تھا۔

”سرجی...“ فاروق کہہ رہا تھا ”پتہ نہیں اس کھٹنڈو ٹائٹ میں ہمارے لے کیا
 تھے ہیں جو خوبصورت لباسوں میں بند ہیں اور ہم بند قباکھول نہیں رہے آپ نے وہ ٹھ
 تو مٹنا ہو گا کہ...“

تھی حیا مانع فقط بند قبا کھلنے تک
 پھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا... ایسا کھلا
 ظاہر ہے فاروق نے یہ شعر... ایک ایسی سرگوشی میں بیان کیا جو برابر میں
 گمشدہ سرگوشی کے کانوں تک نہ پہنچا...“

وہاں ہوں گے.... کسی نیپالی ہوٹل میں قیام کریں، آج کی شب نگر کوٹ کے پہاڑی بازار میں دیگر سیاحوں کے ہمراہ چمپل قدی کریں اور کل سویر.... طلوع آفتاب اپنی ان آنکھوں سے دیکھیں ماؤنٹ ایورسٹ پر.... اناپورنا اور کتور ہندوستان کی برفانی زنجیر اور ناشتے کے فوراً بعد ہم نوبے تک اس عقوبت خانے میں لوٹ آئیں.... کیا خیال ہے؟“

”تارڑ صاحب ہاتھ ملائیں....“ ہیشیرہ کی نہ صرف آنکھیں چمکیں بلکہ عینک کے شیشے بھی جگمگانے لگے ”بلکہ ہاتھ نہ ملائیں.... لیکن کیا زبردست آئیڈیا پیش کیا ہے.... میں چلی اپنا ٹوتھ برش لانے....“

”سمر جی آپ بے شک مجھ سے ہاتھ ملائیں“ فاروق جذباتی ہو گیا ”بس جی ڈن ہو گیا.... ڈنر بھی نگر کوٹ میں ہی کریں گے....“

”وہاں کوئی شاپنگ ہوگی۔“ گمشدہ نے ذرا افسردگی سے اور ذرا سہم کر پوچھا۔
”وہاں ایورسٹ ہوگی خریدنے کے لئے۔ اناپورنا کی برفوں کا سودا بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے بیزار ہو کر کہا....

”ناراض کیوں ہوتے ہیں میں نے تو یونہی پوچھا تھا.... ٹھیک ہے نگر کوٹ چلے ہیں“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ ملک پتہ نہیں کہاں کس سوچ میں تھا یکدم بیدار ہو کر ہوشیار ہو گیا۔

”ہم نے کانفرنس بھگتالی ہے بلکہ بھگتالی ہے اب یہ شام ہماری ہے ہم جہاں جانا چاہے جائیں.... کل نوبے واپس پہنچ جائیں گے“

”نہیں سمر آج شام تو آپ کہیں نہیں جاسکتے.... پورے سات بجے یونیمف کے یورپی ڈائریکٹر کی جانب سے معزز مندوبین کے اعزاز میں ایک ریپشن ہے.... ہمیں“

”آپ کو کرنا ہے۔“ میں ذرا گرمی کھا گیا ”ہمارا آپ کا معاہدہ صرف کانفرنس اینڈ کرنے کا ہے، دیگر لوازمات میں شریک ہونے کا نہیں ہے۔ یوں بھی اگر ہم اس ریپشن میں نہیں شامل ہوتے تو کون دیکھے گا۔“

”سمر پلیز....“ ملک نے اپنے بال درست کئے ”آپ سب کا ہونا بے حد ضروری

ہے۔ تارڑ صاحب پلیز آپ بقیہ ڈیلی گیشن کو قہے کہانیاں سنا کر بدگمان نہ کریں.... اگر مجھ سے پوچھ لیا گیا کہ پاکستان وفد کہاں ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔“

”آپ کہہ دیجئے گا کہ وہ نگر کوٹ گئے ہیں ایورسٹ پر طلوع آفتاب دیکھنے....“
”پلیز سمر.... ایسا نہ کریں میری جواب طلبی ہو جائے گی“

ہم سمجھتے تھے کہ ابھی ہم آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کو ہیں لیکن ملک کے دھبے اور گذار شانہ لہجے نے ہمارے پر کاٹ دیئے تھے.... اور اس کے ساتھ ہی ایورسٹ اور اناپورنا پر سورج کی پہلی کرنیں خواب ہو گئیں۔

اور جب پر کٹ جائیں تو پرندہ پرواز کے قابل نہیں رہتا.... صرف پھدک سکتا ہے۔

چنانچہ ہم پھدکنے لگے ”کیا ریپیشن پورے سات بجے شروع ہو جائے گا.... ڈیوٹوار گھنٹو کا دورانیہ کتنا ہو گا اور کیا کھانا فوری طور پر شروع ہو جائے گا اور ہم اس کے بعد نگر کوٹ نہ سہی کھنڈو کی رات میں تو جاسکتے ہیں نا؟“

”کیوں نہیں....“ ملک نے نہایت یقین سے کہا ”آپ لوگ آٹھ بجے تک فارغ ہو جائیں گے.... ویسے تارڑ صاحب کرپشن اور میری این کچھ دیر کے لئے اپنے آفس جا رہے ہیں کوئی مینٹگ وغیرہ کرنے کے لئے....“

”یہ آپ نے مینٹگ کہا ہے یا مینٹگ کہا ہے؟“

”مینٹگ سمر....“ ملک نے نہایت بھولپن سے جواب دیا۔ ”اگر آپ پسند کریں تو وہ آپ کو ساتھ لے جاسکتے ہیں اور دربار مرگ میں اتار دیں گے.... ایک گھنٹے کے بعد پھر پک کر لیں گے اور ریپشن کے وقت تک واپس لے آئیں گے“

”یہ دربار مرگ کیا ہے“ میں نے پوچھا.... اور پوچھتے ہی انوس ہوا اور میں نام لگاؤں لگے پچھلی شب ہم اسی مرگ ناگمانی کے لئے نجل خوار ہوئے تھے۔

”کرپشن....“ سلمان اپنے نیپالی باس سے ذرا فرینڈل ہو کر مخاطب ہوا.... اور یہ لیکن اس کانفرنس کے دوران یا تو میری این کو دیکھتا تھا اور یا یہ تذکرہ کرتا تھا کہ وہ ”ہیکٹی سٹیٹ“ ایسے لازوال ٹیلی ویژن پروگرام کے ساتھ متعلق رہ چکا ہے.... کس مثبت میں؟ اس کی تفصیل سے وہ گریز کرتا تھا.... شاید تخلیقی سطح پر.... یا کیا پتہ ایک لائٹ

”تو آپ اُس بوتیک سے ہو کر آئیں ہم ذرا دربار مرگ کے اس فٹ پاتھ پر
ہل تڑی کرتے ہیں اور رونق میلہ دیکھتے ہیں۔“
”شور۔“ اُس نے بھی ہم تینوں سے پیچھا پھرانا مناسب جانا۔ اگرچہ اُس کے
”بیچے“ میں بھی کوئی دل کشی نہ تھی۔ اُسے بھی کھنڈو کی اس شب میں دربار مرگ کی
اس ذہن لاتی شام میں ہم تینوں کے چہرے ایک رندے ہوئے شہتیر کی طرح بے جان اور
ہل لگ رہے تھے۔ وہ ڈیزھ گھسنے کے بعد ہم سے اسی سپاٹ پر حاضر ہونے کا وعدہ لے کر
ہل گئی۔
دربار مرگ میں شانتی بہت تھی۔

جیسے یورپ کا باسی کراچی آتا ہے تو اُسے ہر شے... سنت اور ٹھہری ہوئی لگتی
ہے۔ کراچی کا رہنے والا لاہور آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ حرکت کیوں نہیں کرتے۔
اسی طرح لاہور کا لہوریا جب دربار مرگ کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے چار پھیرے نگاہ
الٹا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر جانب ایک خوبانک ٹھہراؤ ہے۔ نہ ہارن چیختے
ہیں نہ لوگ غل مچاتے ہیں۔ نہ کوئی خواتین پر آوازیں کستا ہے اور نہ کسی نے کسی جانا
ہے اور نہ کسی نے کسی سے آنا ہے۔ ایک عجیب پُر امن پوستی ساما حول ہے۔

اسی لئے دربار مرگ میں شانتی بہت تھی۔
فاروق اور سُہری بابا ایک ہینڈی کرافٹ کی دوکان میں گھس گئے اور میں ایک
فائینٹ کا لطف لینے کے لئے بے مقصد گھومنے لگا۔
شاندار اور مہنگے ہوٹل، ایئر لائنز کے دفاتر... بوتیکس، کورین، جاپانی، چینی اور
نئی ریسٹوران... شراب خانے لیکن سب کے سب ایک ٹھہراؤ اور شانتی کے سکوت
ٹٹا، کوئی ہنگامہ نہیں... کوئی شور وغل نہیں۔

میں ایک ریسٹوران کم بار میں چلا گیا اور اُونچے سٹول پر بیٹھ کر ایک سرد
ٹھاب کا آرڈر دیا۔ دربار مرگ کا سارا منظر شیشوں کے پار دکھتا تھا اور فٹ پاتھ پر سے
اُترنے والے ایک خاموش فلم کی طرح چلتے جاتے تھے، ویٹرس جس نے میرا آرڈر لیا
کرت اور بوٹائی میں ملبوس ایک نیپالی خاتون تھی اور ایسی مٹختی اور واجبی تھی کہ اُسے
غلام کی رکھ کر بھی نہیں چھیڑا جاسکتا تھا۔

میں کی حیثیت سے... ”کرپچن... یہ دربار مرگ کیا ہے؟“
”میٹ پلیس اِن ٹاؤن۔“ اُس نے صرف اتنا کہا اور میری این کی طرف
دیکھا۔ میری این اُس کے دیکھنے سے کمپیوٹر کے روپ میں سے نکل کر فوراً عورت
ہو گئی۔
چنانچہ ہم تینوں کو... خواتین اپنے اپنے کمروں کو جا چکی تھیں، اس لئے ہم تینوں
کو... دربار مرگ میں ڈراپ کر دیا گیا صرف ڈیزھ گھسنے کے لئے... کہ آپ قیدی حضرات
ذرا گھوم پھر لیں پھر آپ کو پک کر کے واپس ریسپشن اینڈ کرنے کے لئے ہوٹل پہنچا
جائے گا۔

ہمیں بہت حیرت ہوئی جب میری این کو بھی ہمارے ہمراہ اتار دیا گیا۔ شاید
میٹنگ کا پروگرام مؤخر کر دیا گیا تھا۔ اُس کے باوجود ہم تین ہی تھے... عین فاروق اور
سُہری بابا کیونکہ میری این سپریز سٹیج تھی اور ہم میں شمار نہیں ہو سکتی تھی۔
دربار مرگ اس لئے دربار مرگ تھی کہ اس کے اختتام پر شاہ نیپال کا دربار
نہیں پیلس تھا۔
”میں نے یہاں ایک ونڈر فل بوتیک دریافت کی ہے“ میری این ہم پر مہمان
ہو گئی ”میں نے اُسے چند ڈریز کا آرڈر دیا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اُس کے ڈیزائن
بہت مارولس ہیں“

وہ اب بھی کانفرنس ہال کی طرح ایک کمپیوٹر کی طرح اطلاعات فراہم کرتی تھی۔
”اور اس بوتیک کے ریش کیسے ہیں؟“
”نیویارک کے مقابلے میں... ڈرٹ چیپ...“
اگرچہ ایک اجنبی وادی میں پھیلے شہر میں... یورسٹ اور اناپورنا کے پہلے نہ
کے شہر میں دربار مرگ میں جو شام اُترتی تھی... شاہ نیپال کا محل ذہند میں گم ہوتا تھا۔
”یاک اینڈ یے ٹی ہوٹل“ کے قمار خانے میں رونق اور روشنیاں تھیں اور یہ ایک ایسا
ماحول تھا جس میں کسی بھی بت پرست کے لئے کالی دیوی کی پرستش بھی جائز ٹھہرتی تھی
لیکن اس کے باوجود اس ماحول میں بھی مجال ہے کہ میری این کے چہرے پر کشش کی ایک
کرن بھی پھوٹی ہو۔

”انڈین پنجابی؟“ اُس نے مشروب میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے پوچھا
 ”نہیں... پاکستانی پنجابی۔“

”پاکستانی؟“ اُسے اتنی زیادہ حیرت نہ ہوئی جتنی حیرت کا اُس نے اظہار کیا۔
 پاکستان میں کہاں سے آئے ہیں؟“
 ”لاہور۔۔۔۔۔“

”مجھے اس شہر کا نہیں پتہ... کراچی... اسلام آباد... میں صرف یہ جانتی ہوں۔“
 ہم اپنی اپنی جنم بھومی میں کتنے گم اور پُر تکبر ہوتے ہیں۔ دلی جو ایک شہر تھا
 میں انتخاب... لکھنؤ کی نزاکت... پشاور کی قصہ خوانی اور لاہور کی زندہ دلی... فلائنگ
 کوفہ... ٹیکٹو... ریوڈی جنیرو... شیرازہ... بنارس... کو بے... کاشغر... کتنے بے شمار
 ہیں جن کے باسی اپنے آپ کو اُس بستی کی نسبت سے یکتا گردانتے ہیں... اور دنیا کو ان
 کے نام کا بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ بستیاں بھی ہیں... جیسے اس زمین کا محور چھوڑ جانے
 خلا باز جب مریخ کی جانب سفر کرتا ہے تو بے انت سیارے اور زمینیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔
 اور جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو لاکھوں روشن چمکتے جگنوؤں میں سے کوئی ایک اُس
 زمین ہے... اور تب اُسے احساس ہوتا ہے کہ کسی ایک زمین کے ساتھ اُس کی دائرہ
 کتنی سطحی اور بے معنی تھی...
 چنانچہ جب اُس نیپالی ویٹرس نے یہ کہا کہ مجھے اِس شہر... لاہور کا نہیں پتہ...
 میں نے بھی یہی محسوس کیا... کسی ایک شہر یا بستی کے ساتھ وابستگی کتنی سطحی اور بے
 ہوتی ہے... اور شاید کسی ایک ملک کے ساتھ بھی!

اس بار کے عقب میں ایک صحن تھا... جس میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک
 اوپن ایئر ریسٹوران تھا جو ابھی رات کی رونق کا منتظر تھا۔
 دربار مرگ... موت سے... مرگ سے... بہت پہلے دیکھنے کی چیز تھا اور میں
 قربت مرگ میں آیا تھا...
 تب آتا... جب جھیل جنیوا کے کنارے نیلی جین میں کسا ہوا میرا چہا بدن
 ردپا کی کمر کو شرماتا تھا... تب کوئی اور داستان ہوتی۔
 اور اب کوئی داستان نہ تھی۔

ہوٹل سولٹی ہالڈے ان کے ریپشن ہال میں ہم اگرچہ تاخیر سے پہنچے لیکن کسی
 نے بھی نوٹ نہ کیا کہ ہم پہلے وہاں نہیں تھے اور اگر اب ہیں تو اس سے فرق تو پڑتا نہیں
 لہذا۔۔۔۔۔

اس قسم کی پارٹیوں کا ایک خاص سلیقہ ہوتا ہے نہایت قرینے سے اپنے آپ کو
 رات میں رکھنا پڑتا ہے... خصوصی پوز یہ ہے کہ آپ اپنے شام کے بہترین لباس میں
 دن بار بار نائی کی گرہ درست کریں، اگر تو آپ نے اسپینڈر زیا کیلنس کے ذریعے اپنی
 دلون کا سارا دے رکھا ہے تو آپ بے فکر ہیں کہ یہ آپ کے موٹاپے سے کھسک کر
 نہیں پر نہیں آگرے گی اور اگر آپ نے اُس پر بیلٹ لپیٹی ہوئی ہے تو اُس کا دھیان
 رکھنا پڑتا ہے۔ گلاس آپ کے ہاتھ میں ہے اور اُس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سادہ پانی بھی
 دے سکتا ہے اور واڈکا اور جن بھی ہو سکتے ہیں۔ اپہل جوس اور سکاچ کارنگ بھی ایک جیسا
 داتا ہے چنانچہ ایک شخص نے اگر بہت بے دلی سے پچھلے ایک گھنٹے میں اپنے گلاس کا
 ہاں روسیا ہے جس کو سے سے قطعی طور پر نشاط وغیرہ کی غرض نہیں ہے... چنانچہ آپ
 گلاس ہاتھ میں تھامے مختلف گروپس میں ”ہیلو... آئی ایم...“ کہہ کر شامل ہوتے ہیں، کچھ
 پر خوشگوار گفتگو کرتے ہیں اور پھر... ”ایکس کیوز می“ کہہ کر کسی اور جانب چلے جاتے
 ہیں۔

ہم جب ریپشن میں داخل ہوئے تو یہی کچھ ہو رہا تھا...
 البتہ بیشتر خواتین دیوار کے ساتھ لگی آرام دہ کرسیوں اور صوفوں پر براجمان
 ٹیبلٹ الی کرم دیکھتی تھیں۔
 ملک صاحب نے مودب ہو کر ایک بزرگ و برتر ہستی سے میرا تعارف کر دیا جو
 ٹیبلٹ میں یونیٹف کا ٹاپ مین تھا۔

ٹیبلٹ میں متعدد کاک ٹیلز اُنڈیلنے کے بعد ٹاپ فارم میں تھا۔
 طشتری بردار ویٹرز مشروبات کفر کی نمائش کرتے ہم سب کو دعوت خمار دیتے

تھے۔ ایک ایسے ہی ویٹرنے جب صوفے پر بیٹھی نہایت غصیلی حالت میں بیٹھی بیٹھی سامنے جھک کر یہ مشروبات پیش کئے تو ہمیشہ نے صرف ایک لفظ کہا ”رفع....“
ہم ظاہر ہے اتنے بد تمیز نہ ہو سکتے تھے۔

ان ساتی گری کی شرم رکھنے والے ویٹرنز کے علاوہ کچھ اور ویٹرنز تھے جو ان خوراک کی طشتریاں اٹھائے ہوئے تھے جو عام حالت میں نہایت عامیانہ لگتی ہے لیکن حالت خمار میں نہایت دیدہ زیب لگتی ہے.... سرکے میں بھگوئے ہوئے زیتون، ساج، پڑ اور کھیروں کے سینڈوچ، نیپالی سمو سے اور پتہ نہیں کیا کیا الابل....

ٹاپ مین سکیڈے نیویا کے کسی ملک کا رہنے والا تھا اور ایک ایسا شخص تھا شکل سے ایک ایماندار آئرش دہقان لگتا تھا جو سارا دن گھوڑوں کی مدد سے اپنا کھیت کرتا ہے اور شام کو مقامی شراب خانے میں جا کر جی بھر کے بیڑ پیتا ہے اور پھر ”بہ آئرش آنکھیں مسکراتی ہیں“ گاٹا ہوا اپنے فارم پر چلا جاتا ہے۔ اُس میں انگریزوں امریکیوں کا کوئی احساس برتری نہ تھا....

”مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر ایک فرانسیسی نے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں جانور اور پرندے گفتگو کرتے تھے، کیا یہ ناقابل یقین نہیں ہے؟“

”نہیں ہے“ میں بھی قریب ہی کھڑا تھا ”سینکڑوں برس پیشتر مشرق میں کلیڈ نے لکھی گئی.... فرید الدین عطار کی ”مطلق الطیر“ میں پرندے گفتگو کرتے ہیں....“
”واقعی؟“ اُس نے بے حد حیرت سے کہا ”میں نہیں جانتا“
”اس لئے کہ ہم تو مغرب کو جانتے ہیں لیکن مغرب ہم کو.... مشرق کو نہیں جانتا۔“

”روپا جو شی نے آج کی شام کے لئے خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ اُس نے ایک ایسا بلاؤز پہن رکھا تھا جو لوگوں کو گرم کرنے کا ایک بہانہ تھا.... اگرچہ فرنٹ کچھ ڈھکا ہوا تھا لیکن پشت اور کمر پر اُس کے کوئی آثار نہ تھے اور اُس کی چیتا کراتی زندہ تھی کہ گمان ہوتا تھا کہ روپا ہمیں سے بولتی ہوگی....“

ہنگلہ دہشی خواتین بسکٹ نہایت رغبت سے کھا رہی تھیں اور اورنج جوس کو بھی

اچھ لگتی تھیں.... البتہ ہندوستانی وفد کی ایک دو خواتین ایسی تھیں جو سر جھکتی تھیں تو بیا بیا جھومتی بھی تھیں۔

اگرچہ ہمیشہ گان کا برادران کو اشارے کرنا ذرا معیوب فعل ہے لیکن ہماری نظر کہ ہمیشہ ایک صوفے پر براجمان مجھے نہایت غصیلے اشارے کر رہی تھیں، میں اُن کے ”بہ چلا گیا“ ”جی فرمائیے“

”بھئی یہ لوگ ہمیں اب شراب ہی پلاتے رہیں گے یا کچھ کھانے کا بندوبست ہی کریں گے؟“

”ہمیشہ.... آپ بھی؟“

”لا حول ولا....“ اُنہوں نے سخت ناگواری سے کہا اور اُن کی ناگواری کی دھند ان کی عینک کے شیشوں کو بھی دھندلا گئی۔ ”یہ مومے بسکٹ اور پیئر کے منحنی سینڈوچ کھا لھا کر طبیعت مقدر ہو گئی ہے“

”جی میں مسلمان سے پوچھتا ہوں“ میں ملک کی جانب کوچ کر گیا ”مسلمان، ہمیشہ ریاضت کر رہی ہیں کہ یہ لوگ ہمیں شراب ہی پلاتے رہیں گے یا کھانے کا بھی کوئی بندوبست ہے....“

”مارٹ صاحب میں کچھ نہیں کہہ سکتا....“ اُس نے فوراً سرکاری احتیاطی لہجہ اختیار کر لیا ”لیکن ڈائریکٹر جنرل آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے کہ یہ جو بھی شخص ہے دلیل انفارمڈ ہے اور انگریزی اچھی بولتا ہے۔“

”میں دلیل انفارمڈ اس لئے ہوں کہ یہ میرا پروفیشن ہے اور اگر وہ میری انگریزی کی تعریف کر رہا ہے تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس کی انگریزی کیسی ہوگی....“
”نہیں، ہمیشہ کی طرف چلا گیا“ ہمیشہ.... مسلمان فی الحال کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس کے بعد کھانا ملے گا یا نہیں.... لیکن آپ اب تک کیا کرتی رہی ہیں؟“

”یہ گوڑے اور نچ جوس کا کوئی سولہواں گلاس ہے.... میرے اندر تو مچل فروٹ ڈرام اگنے کو ہے۔“
”تو پھر؟“

”یہ پھر یہ کہ ہم سب نے بڑی حماقت کی جو یہاں آگئے.... ہم اس وقت نگر کوٹ

میں ہوتے.... یہ سب آپ کا قصور ہے.... اگر آپ تھوڑے سے اور بد تمیز ہو جاتے مگر
کے ساتھ تو ہم سب اس وقت نگر کوٹ میں ہوتے....“

مسعود مسلسل زیر موچھ مسکرا رہا تھا اور خوش تھا اور باقاعدہ اپنا گلاس ذرا بند
کر کے رکھتا تھا تاکہ جو تصویریں دھڑا دھڑا تر رہی تھیں اُن میں یہ صاف نظر آئے کہ
طالبان کا یہ نمائندہ صرف اور سچ جوس پی رہا ہے حالانکہ اُس میں سفید واڈ کا کی آمیزش ہو
ہو سکتی تھی جو کہ اگرچہ نہیں تھی۔

”د تھمل میں حمل... لا رڈ بُدھا اونٹلی فالو ہنڈر ڈ...“

”اچھا تو خواتین و حضرات۔“ پارٹی کے چیف گیٹ نے مندوین کو مخاطب کیا
اور ہم جیسے خوراک کے شیدائی فوراً متوجہ ہو گئے کہ اب ڈنر کا اعلان ہو گا لیکن اُنہوں
نے جھک کر نہایت باوقار انداز میں ہمارا روایتی شکریہ ادا کیا اور زخمت ہو گئے.... چنانچہ
یہ کھلا کہ صرف پینے کا بندوبست تھا کھانے کا نہیں۔ شاید اُنہوں نے ہمیں ایک ارفع مقام
پر پہنچایا تھا کیونکہ یورپی تہذیب کے ایک سیانے نے کہا تھا کہ کھاتے تو جانور بھی ہیں لیکن
انسان میں یہ خوبی ہے کہ وہ پیتا بھی ہے.... انسانیت کے اس بلند مقام پر پہنچنے کے باوجود
ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔

باہر.... وہی خشک ہوا تھی جو انا پورنا اور ایورسٹ سے آتی تھی....
میرے دوست درخت شاید خوابیدہ ہونے کو تھے لیکن میرے قدموں کی چاپ
ن کر اُن کے شگوفے کھلنے لگے اور وہ نیم تاریکی میں ہونے کے باوجود ایسے روشن ہوئے
کہ میری جرأت نہ ہوتی تھی کہ میں اُنہیں چھوڑ کر آگے چلا جاؤں....
وہ اُس لمحے کھٹنڈو کی رات میں.... ایسے برگد تھے جن کے نیچے تین مہمانا بُدھ

”تار صاحب.... اب کیا کریں؟“ گمشدہ بھی خوراک کی نایابی کے باعث نڈھال بڑ کر ڈینا کو بھول سکتے تھے....
ہو رہی تھی اور اس قحط کی وجہ سے شاپنگ کو فراموش کر چکی تھی۔

دنیا میں کوئی شخص چاہے وہ کتنا ہی عام اور اُن پڑھ کیوں نہ ہو.... شہروں کی
نذیب سے دُور ویرانوں، صحراؤں اور کھیتوں میں مشقت کرنے والا کیوں نہ ہو.... جو یہ
لگا نہ جانتا ہو کہ آج کیا تاریخ ہے.... اس ملک کا حکمران کون ہے.... اور میرے کنوئیں
سے پرے دنیا بھر میں کوئی اور کنواں نہیں.... پر یقین رکھتا ہو.... اُس کا بھی کوئی نہ کوئی
ذکو ضرور ہوتا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر وہ زردان حاصل کرتا ہے....

”Indeed....“ وہ فوراً شرمندہ اور معذرت طلب ہو گئے....

”چلیں گمشدہ؟“

”ہاں.... ابھی چلیں.... میں نے سنا ہے کہ وہاں تبت کے بے ہوش کھیں“

”بگ بھی ملتے ہیں“

”کیوں فاروق؟“

”خدا کے واسطے کہیں تو چلیں....“

”ہمشیرہ؟“

”ذرا جھانک لینے میں کیا حرج ہے....“

وہ بے شک ایک کیکر ہو....
ریت کا ایک ٹیلہ ہو....
ایک ہتھر ہو....
گندم کا ایک خوشہ ہو۔ ٹوبے کا گدلا پانی ہو.... دیسی تمباکو کا ایک کش ہو.... سٹو
اٹھت ہو.... نسوار کی ایک چٹکی ہو.... سردیوں کی صبح میں جامنی رنگ کا ایک شلغم ہو....

دیے میں نے انہیں سختی سے منع کیا کہ بی بی آپ جب ”ہائے تارڑ صاحب“ نہیں تو میرے ذہن میں عجیب سی تصویریں آتی ہیں آپ اس سے اجتناب کریں۔۔۔ انہیں ہاگندہ کامیں بے حد شکر گزار بھی ہوں کہ اُس نے عینی اور میمونہ کے لئے متعدد ہدایات تجویز کئے جو وطن واپسی پر میری نیک نامی کا سبب بنے۔

ذیورات کی دوکانوں کے برابر میں ایک پُل تھا جس کے پار اصل تمھل بازار شروع ہوتا تھا۔۔۔ یہ ایک اور بازار مصر تھا جہاں ہر شے فروخت ہو رہی تھی۔۔۔ وہاں جتنی بی دوکانیں تھیں، ریسٹوران اور جگمگاتے کوزی سے خانے تھے اُن میں ایک عمرگذاری لکھی تھی۔۔۔ ان کی جازبیت ان کے مختصر اور زندگی کے رنگوں میں رنگے ہونے کی وجہ سے

تمھل کا بازار لاہور کا ڈبئی بازار یا سوہا بازار بھی ہو سکتا تھا لیکن یہاں صرف نالے اڑے اور ذیورات نہیں بکتے تھے بلکہ اور بہت کچھ بھی برائے فروخت تھا جو وہاں بیوغ تھا۔۔۔

یہاں ایک بوسیدہ محاورے کے مطابق کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔۔۔ اور ایسے ایسے لوہے تھے کہ اُن کا کیا بیان ہو۔۔۔ یہاں ہر رنگت اور ہر نسل کا کھوا تھا۔ سکھ سردار بھی نئے اور سویش لڑکیاں بھی۔۔۔ اور لڑکے بھی تھے جو ہمیں لڑکیاں لگ رہے تھے کیونکہ ہم بے خطوں میں سے آئے تھے جہاں پشاور بھی تھا اور علمانوں کی نوید بھی دی گئی تھی۔۔۔ اور بی اور جاپانی سیاح۔۔۔ امریکی بے فکرے کوہ پیا اور کوہ نور۔۔۔ تبتی قالین، نیپالی ہینڈی ٹائٹس، میڈونا کی آواز پر پڑھتی آشا بھوسلے اور نصرت فتح علی خان کے الاپ۔۔۔ سے نفل کے در کھلے۔۔۔ کھڑکیاں روشن۔۔۔ دیس دیس کی خوراکیں اور ایک کوہ نور ہوٹل کھلے۔۔۔ ہم نے نظر میں رکھا کہ واپسی پر ادھر سے چکن ٹکڑے اور نان کھائیں گے۔۔۔

ذیابھر میں جہاں بھی سیاح پہنچتے ہیں وہاں اپنی ثقافت اور خواہش کے مطابق کوئی کوئی بازار تخلیق کر لیتے ہیں۔۔۔ وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ مقامی لوگ اُن کو اپنی پچھانتیں ہیں اور اُن کے ذوق اور شوق کے مطابق اپنی مقامی ثقافت کو ڈھال لیتے

بھینس کے دودھ کی ایک دھار ہو۔۔۔ مضبوط پشت پر اُچھلتا ایک پراندا ہو۔۔۔ کی اُس کے وہ برگد ہوتے ہیں جو اُسے نروان سے آشنا کرتے ہیں۔۔۔ اور نوجوں نوجوں علم بڑھتا جاتا ہے یہ طے نہیں ہوتا کہ کس برگد کے نیچے زمین پر رماں تو نروان حاصل ہو گا۔۔۔

اسی لئے میں نے ان تینوں دوست درختوں سے اجتناب کیا اور آگے چلا گیا۔ اور جب ہم دو ٹیکسیوں میں لد کر دربار چوک میں اُن لوڈ ہوئے۔ اُترے۔۔۔ اور نیپالی بادشاہ کے وسیع محل کے باہر جو آہنی ریلنگ احاطہ کرتی تھی اُس کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتے اور پھر تمھل کی روشنیوں میں آئے تو مجھے ایک مرتبہ پھر شاہ شمس اور مولانا زوم کی پہلی ملاقات یاد آئی کہ۔۔۔ یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے۔۔۔ اور تمھل وہ تھا جسے ہم نہیں جانتے تھے۔۔۔

پورا کھٹنڈو چُپ اور نیم تاریک تھا لیکن تمھل میں وہ رونقیں تھیں جو صرف فقیروں کے ڈیروں پر ہوتی ہیں۔

اور یہاں دنیا بھر کے فقیر جمع تھے۔۔۔ آوارہ گرد اور فقیر میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا، دونوں اپنی اپنی دنیا اور اپنے سچ تیاگ کر نکلتے ہیں۔

یہ وہ گلی کوچے تھے جن میں جو شکل نظر آئی۔۔۔ تصویر نظر آئی۔۔۔ اور ماحول ایسا تھا کہ اگر میری این کا چھلا ہوا سفید بے رنگ چہرہ بھی یہاں نظر آتا تو تصویر نظر آتا۔۔۔

یہ ایک ایسا دیار تھا جس کے بغیر کھٹنڈو کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ ہم بہت بد قسمت ہوتے اگر تمھل نہ دیکھتے۔

اگرچہ ذیورات کی پہلی دوکان پر ہی گمشدہ لٹو ہو گئیں اور شہ کی سڑ پر گھومتی چلی گئیں۔ باہر نکلنے کا نام نہ لیتی تھیں اور ہم حد ادب کی وجہ سے موصوفہ کو بھیج کر بھی باہر نہیں نکال سکتے تھے۔۔۔

”ہائے تارڑ صاحب۔۔۔“ وہ کسی ایک بندے پر نندا ہو جاتیں۔۔۔ ”ہائے ہائے تارڑ صاحب۔“ وہ انگوٹھیوں میں جڑے پتھروں پر داری ہوتی چلی جاتیں۔۔۔

”لارڈ بڈھا.... اونٹی فائو ہنڈرڈ نیپالی.... آئی گو یو گڈ پرائس....“
”نہیں....“

میں اس قسم کے گھاگ بچہ لوگ سے بخوبی واقف تھا.... وہ اپنے تجربے کی وجہ سے فراڈ سے بڑے نفسیات دان ہوتے ہیں.... ٹورسٹ کو گھیر کر ایسی جگہ پر جا مارنا جہاں پانی نہ مانگے اُن کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ سکندر یہ کی بندرگاہ سے شہر آتے تھے اسی قسم کے شاطر بچے سے پالا پڑا تھا جو ہمیں کہانیاں سنانا کڑا اور وصول کر لیتا

”لارڈ بڈھا.... ویری چیپ۔“

”نہیں۔“ میں نے اُسے جھڑک کر کہا۔

چوک سے آگے تھم میں سے بہت سی گلیاں نکلتی تھیں اور ہر گلی ساجن کی گلی نہ تھی.... کوچہ یار کی طرح بلاق تھی لیکن ہم کس کس گلی میں جاتے.... اس لئے رہے چلتے گئے۔

”لارڈ بڈھا.... اونٹی فور ہنڈرڈ نیپالی.... آئی گو یو گڈ پرائس“

”گم ہو جاؤ بچے....“

”میں گم نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے وطن میں ہوں۔“ میں یہ فقرہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ دھوکا دربار کے پرکاش کی زبان سے.... چونکہ دن میں درجنوں بار وہ یہ فقرہ عاجز آئے تھے اس لئے اُن کے پاس گھڑے گھڑائے جواب ہوتے ہیں جو آپ دلجو اب کر دیتے ہیں۔

”باباجی کھانا کہاں کھاتا ہے؟“ سُہری بابا نے ایسی تمکنت سے پوچھا جیسے وہ سینڈ ٹینٹ ہوں اور میں اُن کا ذاتی بیٹ مین ہوں....

”یہ سامنے والے کوریائی ریسٹوران میں....“

”حلال فوڈ ہوگی؟“

”ہاں.... بندر بھی حلال ہوں گے اور مینڈک بھی....“

سُہری بابا سخت خفا ہو گئے کہ اُنہوں نے ابھی یہ بھی پوچھنا تھا کہ بندر کتنے آئی کلس ہوگا۔

یہ ایک زمانے کا کابل کا بازار مرغ ہو یا تھران کا شارع امیر کبیر.... ہرات کی پوسٹینوں کا بازار ہو یا فلارنس میں دریائے آرنو کا پل.... ہسپانیہ کا کوئی ساحلی مقام ہو یا انگلستان کا ساؤتھ اینڈ.... یہ سب ایک بین الاقوامی نمک لئے ہوتے ہیں.... ان کی روعم ایک ہی ہوتی ہے.... سیاح یہاں پہنچ کر محفوظ محسوس کرتا ہے اور قدرے بے باک ہو جاتا ہے.... تھم کے بازار میں بھی ایک لاپرواہ دھڑکن تھی جو اُس میں داخل ہونے والے ہر بدن پر اثر کرتی تھی۔ سیاح اُن پیاسے اونٹوں کی طرح گردنیں اٹھائے پڑسرت ہوتے تھے جو صحرا کے طویل سفر کے بعد کسی ٹمبکو کے نخلستان میں آنکے ہوں۔

ایک چوک نما مقام آیا جہاں سے تھم کا بازار نوے درجے کے زاویے پر بائیں جانب چلا جاتا تھا....

ادھر ہر آوارہ گرد ڈکٹا تھا.... اُس کے چہرے کو نیون سائز کی لائٹس گلار کرتی تھیں اور تیز ڈھنیں اُس کا راستہ روکتی تھیں اور ہر زبان کی رنگینی اُسے رنگتی تھی.... اگرچہ اُس چوک نما سے کوئی اور راستہ نہ نکلتا تھا پھر بھی ہر آوارہ گرد ڈک کر سوچتا تھا کہ اب کدھر جاؤں....

یہاں ہم بھی رُکے....

گمشدہ فور آسنڈل کی لکڑی سے بنی ہوئی مالاؤں میں دلچسپی لینے لگی۔ فاروق دوکانوں کے اُپر جو اوپن ایئر ریسٹوران تھے اُن کے جھولتے تمبوں میں سے موسیقی اور رقص کی جو آوازیں اُترتی تھیں صرف اُن کو سنتا تھا اور مجھے ”چلیں تار ڈ صاحب“ نظروں سے دیکھتا تھا۔

ہمیشہ ہر شے کا معائنہ کرتی تھیں لیکن ایک لاتعلق سائنسی نقطہ نظر سے اور نہایت پڑسرت ہوتی چہل قدمی فرما رہی تھیں۔

اور ضیاء صاحب اپنی سُہری ریش کو سنوارتے نہ تھکتے تھے....

تھم کی اُس شب میں اُس چوک نما میں ایک آٹھ دس برس کا گھاگ بچہ ایک ایسے بڈھا کو تھا سے ہوئے میرے پاس آیا جو ہانگ کانگ میں لاکھوں کی تعداد میں پلاسٹک سے بنتے ہیں لیکن نہایت قدیم اور پڑوقار لگتے ہیں۔ بچہ خوبصورت تھا لیکن غلمان نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نیپالی مردوں میں غلمان بننے کی ہرگز صلاحیت نہیں ہے۔

ہاروہنی تھی وہ لائینوں کی تھی اور بہت ناکافی تھی ”سر آپ کون ہیں؟“

”میں تو آج تک اس سوال کا جواب نہیں دے سکا کہ میں کون ہوں؟“

”سر میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“

”میں پہلی مرتبہ نیپال میں آیا ہوں۔“

”ہارڈ صاحب...“ سرگوشی نے نہایت زور دار سرگوشی کی ”پلیز آپ اپنا

ذہن کروادیں، اگر یہ آپ کو پہچان گیا ہے تو لائینوں کی قیمت کم کر دے گا...“

”اور اگر نہیں پہچانتا؟“

”پھر بھی رعب تو پڑ جائے گا کہ آپ ٹیلی ویژن پر آتے ہیں۔“

میں نے ایک بازاری طوائف کی طرح اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ میں فلاں فلاں

...

جانے مجھے وہ جانتا تھا بھی یا نہیں... شاید اُس نے ترس کھا کر اُن کانغذی لائینوں

اقبت حیرت انگیز حد تک گھٹادی...

یہ سرخ لپ شیزڈ... چینی طرز کی لائین سیاہ بھندنے لٹکائے لاہور کی راتوں

ہا میرے لونگ روم میں تھمل بازار کی یاد دلاتی ہے اور نہ اس کا کانغذ بھورا ہوا ہے نہ

ما کو آگ لگی ہے بلکہ ہر روز اس کی روشنی میں شفق کی سرخی نمایاں ہو کر میرے گھر

ادواروں پر نیپال کی شبیہیں بناتی ہے۔ صرف ایک مسئلہ ہے کہ اُس پر جو نامعلوم سی

انماجھ کی شکلیں ہیں اُن کی وجہ سے میری ساس صاحبہ اُس کمرے میں نماز نہیں

تھیں۔

اسی راتس پیپر شاپ کے پبلو میں کشمیری پینڈی کرائٹس کی ایک منحنی سی دوکان

لے۔ ایک فاقہ زدہ کشمیری کی طرح... اور اُس میں پیپر ماشے کا کام تھا جو پاکستان میں اس

عائیں بڑھایا ہوتا ہے اور چمڑے کے کچھ بیگ اور پرس تھے جن پر میں اور گمشدہ باہم

اگر تو ہو گئے... لیکن قیمت ہماری جیب میں سوراخ کرتی تھی، اگرچہ ہم نے اُس کشمیری

نہیں برادر کو اُن کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں اپنی غیر مشروط مدد کا حوالہ دیا... اُن

نہیں کا تذکرہ کیا جو وہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتیں اور یو این او کی قرار دادوں کی یاد دلائی

نہیں کشمیری برادر عزیز مسکراتا رہا... اُس کے کانوں پر اگر ہم ایک خوردبین بھی فٹ

تھمل کے بازار میں جہاں تک نظر جاتی تھی... وہاں تک ایک شے تھی جو کوئی
کی رات میں سرخ روشنی سے جھللاتی تھی اور پھندنے والی تھی اور سخت اور نیکل
دیتی تھی۔ ایک سرخ چینی طرز کی لائین... اگر وہ زرد ہوتی تو میں اُسے ایک پاکر
املاس کا خون کے مینے کا ایک زرد ٹکٹا پھولوں کا گچھا جانتا... یا ایک ایسی زرد شہزادی جا
جو مدتوں سے میری منتظر تھی... لیکن یہ ایک سرخ لائین تھی۔

میں دوکان کے اندر چلا گیا۔

”سر یہ ٹریڈیشنل نیپالی کانغذ سے بنائی گئی لائینیں ہیں۔“ دوکاندار لپک کر

”رائس پیپر...“

”کوئی رائس... باسٹی یا کسی رائس... یا موٹا بنگالی چاول سے...“

”یو اینڈین؟“ وہ رُک گیا۔

”میں پاکستانی... ویری پاکستانی...“

”ویلم...“ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”میں ہندو... اینڈ نیپالی... وہی ا

پاکستان...“

”تھینک یو...“

”آپ اردو سمجھتا ہے؟“

”سمجھتا ہے... لیکن بولتا کم ہے کیونکہ یار لوگ ہماری اردو میں غلطیاں نکالتا

ہے... تم بولو۔“

”سر یہ لائین دراصل لونکا کی چھال سے بنتا ہے۔ اور یہ صرف نیپال میں اور

بہت دور کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔“

”لکڑی کا لائین ہے تو جل نہیں جاتا۔“

”نہیں صاحب... لونکا کے جنگلوں میں آگ نہیں لگتا اس لئے کہ اس کا چھال

آگ نہیں پکڑتا...“

یہ عجیب منطق تھی کہ لکڑی بھی ہے اور آگ بھی نہیں پکڑتی...“

”ہمارے پاس لائین بہت ہے، ہر رنگ اور ہر سائز میں ہے۔ اور لونکا کی چھال

کا ڈائری اور نوٹ بکس بھی ہے“ وہ آنکھیں میچ کر میرے قریب آ گیا کہ دوکان میں چینی

کرتے تو ایک بھی جوں ریگتی نظر نہ آتی۔ اور اُس نے قیمتوں میں کچھ کمی نہ کی۔

ایک مرتبہ پھر باہر... تھمل کے بازارِ عجائب میں...

”مارڈ صاحب، مارڈ صاحب۔“ گمشدہ نے تھمل کے ٹائٹ کلبوں کی بوہڑوں میں اور رنگ رلیوں اور لغویات میں بمشکل سرگوشی سے بلند آواز میں نچھے پکارا ”اگر آئیں۔“

ہم اُدھر چلے گئے۔

”اندر آئیں...“ وہ ایک دوکان میں گھس گئی... اور ہم سب اُس کے پیچھے پیچھے

تھمل میں گمشدہ بھینٹوں کی طرح...

اور اندر ایک عجائب گھر تھا۔

اور اس حیرت کدے میں ایسے ایسے عجیب رنگ اور شکلیں تھیں کہ ہم دنگ رہ گئے... ان شکلوں میں اُن دو تبتی خواتین کی شکلیں تھیں جن کے ناک اگرچہ چھپے تھے لیکن بدن ہرگز نہ تھے...

اُن میں سے ایک اُن خواتین میں سے تھی جو گردن سے نیچے اُترتے ہی بے قابو اور بلند ہو جاتی ہیں، لیکن ظاہر ہے گمشدہ نے نچھے ان پر نظرس سینکنے کے لئے نہیں بلایا تھا... اُن عجیب رنگوں کے لئے بلایا تھا جو تبتی دیہات میں ہاتھ کی کھڈی پر بنے ہوئے شوئرز بیگز میں تھے۔ پرس، تھیلے، پھندے... ہینڈ بیگ اور طرح طرح کے نوادر میں تھے اور ان کی قیمتیں بھی نہایت مناسب تھیں... بلکہ بقول میری این... ڈرٹ پیپ تھیں... اور بقول گمشدہ یہ کھٹنڈو کی بیٹ شاپنگ تھی۔

سُہری بابا ان عجائبات کی قیمت مزید کم کروانے کے لئے اُس ایک تبتی حینے کے رخساروں کو سو سو بہانوں سے... عذر ریش رکھتے ہوئے... چھوتے تھے اور کہتے تھے ”نہیں یہ بہت زیادہ قیمت ہے۔ ذرا تو کم کر دیں۔“

”نہیں۔“ وہ سر ہلا کر مسکراتی ہوئی کہتی...

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہم سے محبت نہیں کرتیں؟“

”نہیں۔“

”آپ کے رخساروں کی سرفخی کہتی ہے کہ آپ ہم سے محبت کرتی ہیں۔“

”نہیں۔“

اور اس گردانِ نہیں کے دورانِ مجال ہے جو اُس کی مسکراہٹ کم ہوئی ہو... میرا تو یہ جی چاہ رہا تھا کہ میں تبت کے اُس بلند حُسن کے زُخسار چھو کر کہوں ”بت ذرا تو زیادہ کر دیں۔“

دلائی لاما کی متعدد تصویریں اُس دوکان کی آرائش تھیں۔

تبت کا یہ زروحانی پیشوا ایک ایسا امام تھا جس کے پیروکار صرف ہندوستان اور بال میں تھے... دلائی لاما کی تصویر دیکھ کر ہم نے ویسا ہی محسوس کیا جیسا کہ غیر ملکی سیاح لام آباد میں کسی کابلی ریستوران میں جا کر احمد شاہ مسعود یا تبتی کی تصویر دیکھ کر کرتے۔ اور جب ہم اُس تبتی دوکان سے باہر نکلے تو سب کے سب ایسے لدے پھندے نکلے۔ ہم نیویارک کے باسی ہوں اور بجلی فیل ہو جانے کے باعث اپنی اعلیٰ اور دنیا بھر سے فخر تہذیبی اقدار کو یکسر فراموش کر کے متعدد پُرسٹورز کے شیشے چکنا چور کر کے اُنہیں نکلے ہوں۔

تھمل ایک ایسا نخلستان تھا جہاں ہم جیسے آزادی اور شاپنگ کے پیاسے اُونٹوں کو تپلے آجانا چاہئے تھا اور بعد میں بھی آتے رہنا چاہئے تھا۔ لیکن نہ ہم پہلے آئے کہ ہم وہ آئیون ڈانسوچ تھے جو ہوٹل سولتی کے عقوبت اُس میں بین الاقوامی معیار پر... فائو سٹار سمولٹوں کے ساتھ قید تھے... اور نہ ہم بعد میں آئے۔

میری بیٹی یعنی جب اپنے لباس کے ساتھ میچ کر کے ان تبتی رنگوں کے شوئرز بیک کاندھے سے لٹکا کر کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج میں جاتی ہے تو اُس کی دوستیں اُنہیں بکڑندہ سے سیاہ ہوتی ہیں اور پوچھتی ہیں ”یہ کہاں سے آیا ہے؟“

اور وہ کاندھے جھٹک کر لاپرواہی سے کہتی ہے مگر اس احتیاط سے کاندھے جھٹکتی ہے کہ وہ بیک اُس کے کندھوں سے گرنے جائے ”اوتو نیپال سے لائے تھے...“

تھمل... حسن بن صباح کی وہ جنت تھی جس میں دوبارہ جانے کے لئے انسان اپنی اُنٹوں کو داؤ پر لگا سکتا تھا... خلیفہ وقت کے سرہانے خنجر رکھ سکتا ہے۔

”لارڈ بڈھا... اولی تھری ہنڈرڈ نیپال... آئی گو یو گڈ پرائس...“ وہ گھاگ بچہ

ابھی تک میرے تعاقب میں تھا۔

”ون ہنڈرڈ...“ میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

”اوکے...“ اُس نے بڑھا کو میری جانب بڑھا دیا۔

میں فوراً ایک آؤٹ کر گیا کیونکہ یہ ایک بے توقیر... پلاسٹک کا بنا ہوا عارضی بڑھا تھا جو صرف کسی یورپی یا امریکی گھر میں سج کر نردان حاصل کر سکتا تھا... لیکن میں سرزمین گندھارا کا باسی تھا جہاں بڑھا کی قیمت پڑتی ہے اور وہ یوں بے توقیر نہیں ہوتا۔ میرے گھر میں ہزاروں برس پرانے ایسے بڑھا تھے جن کی جانب تادیر دیکھیں اُن کی پرستش کو جی چاہتا ہے... اُن پر ایک خاص زاویے سے روشنی پڑے تو اُن آنکھیں زندہ لگتی ہیں... لبادے کی شکنیں حرکت میں آ جاتی ہیں... وہ میری ساس ماد کی نماز میں بھی مغل نہیں ہوتے اپنے گیان میں اپنے دھیان میں گم رہتے ہیں... تو پلاسٹک سے بنے ہوئے اس بے روح کھلونے کو کیسے اُن کے برابر میں سجا سکتا تھا۔

تھمل ایک ایسا نخلستان تھا جس میں ہم پیاسے اُونٹوں کو بہت پہلے آ جانا چاہتا تھا۔

اور ہم نہیں آئے۔

اور نہ دوبارہ آئیں گے۔

”دیکھ سسرال... اور پرندے آزاد ہوتے ہیں“

”تارڑ صاحب آپ کو ہندوؤں سے بو آتی ہے؟“

”بالکل نہیں۔“

”اور ہندنیوں سے...“

”اُن سے تو بالکل نہیں آتی۔“

”لیکن مجھے آتی ہے“ ہمشیرہ نے سینے پر دو ہنڈرڈ سا مار کر کہا ”اب ذرا اس دپتی رانی کو دیکھیں۔ اچھی بھلی لگتی تھی گوری چٹی اور چھوٹی موٹی... اور آج جو اُس مندر ہو کر آئی ہے جس کا نام پتہ نہیں کون سے مہاراج جی ہے...“

”پشوپتی ناتھ جی مہاراج...“

”ہائیں آپ تو ہندوؤں کے نام اس طرح فر فر لیتے ہیں جیسے خدا نخواستہ خود ہندو“

”ہوں۔“

”کیا ہوں...“ ہمشیرہ غضب میں آ گئیں۔

”ہندو۔“

”دیکھیں تارڑ صاحب میں اس معاملے میں بے حد بنیاد پرست ہوں... اس لئے ہنڈرڈ سا تھ اس قسم کے ملحدانہ مذاق مت کریں۔“ ہمشیرہ بے حد ناراض تھیں...

”دیکھیں ہمشیرہ... میری اکلوتی ساس صاحبہ کے سگے نانا جان ایک سکھ بہر دار

نہے کی کان بنائے تو اُس مندر میں گئی ہے اور واپس آئی ہے تو ذرا دیکھیں کیا کیا اپنے
نے پر تھوپ کے آگئی ہے....“

دپتی کے سفید ماتھے پر سُرخ تلک تھے جن کا رنگ کچا اور بہتا ہوا تھا اور شاید
بہ چاول اور دالیں بھی تھیں جو اس تلک میں شامل تھیں۔
نینا کانفرنس کا یہ آخری اجلاس تھا....

کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لئے مختلف گروپ تشکیل پا چکے تھے جو اپنی
ادارات کو آخری شکل دے رہے تھے.... اور ملک صاحب اپنی اطالوی لہجے کی رُکی رُکی
ریڑی میں ازحد متحرک تھے۔ اور اُسی لمحے جب ہمیشہ صاحب دپتی تلک کی وجہ سے
فردخت ہو رہی تھیں یہ وہی لمحہ تھا جب یہ اس کانفرنس کا آخری لُنج تھا جو ہوٹل سولتی
، ڈاننگ روم میں جاری تھا اور دپتی اپنے ماتھے پر لمبو رنگ تلک لگا کر آگئی تھی اور
اُس کے چہرے پر ایسی روحانی مسرت تھی جو مقامات مقدسہ کے زائروں کے چہروں پر ہوتی
ہے.... اُس کے لئے پشوتی ناتھ جی کا مندر ایک مقام مقدس تھا....

”ہیں....“ یکدم گمشدہ نے گویائی حاصل کر لی ”آپ کی پلیٹ میں تو چکن ہے....
تو جھٹکے کا ہے۔“

”اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ مچھلی ہے.... اور مچھلی جھٹکے کی بھی جائز ہے....“
”تو کہہ میں یہ رہی تھی کہ.... اور قسم سے سچ کہہ رہی تھی کہ مجھے ان ہندنیوں
کا ایک خاص قسم کی منک آتی ہے۔ اور خاص طور پر جب یہ تلک وغیرہ تھوپ کر آجاتی
ہے۔“

”ہمیشہ.... کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ ہو سکتا ہے اُنہیں بھی ہم مومنین میں
کا کوئی خاص قسم کی منک آتی ہو۔“

”لو ہم تو روزانہ نہاتے ہیں.... صفائی نصف ایمان ہے۔“
”وہ ہم سے زیادہ باقاعدگی سے اشان کرتے ہیں.... بلکہ یہ اُن کے دھرم کا ایک
نہ ہے۔“

”ویسے آپ کس کی سائیڈ پر ہیں تارڑ صاحب۔“ گمشدہ بھی خفیف سی خفا
میں تھی۔

تھے.... جو بچپن میں گھر سے نکلے تو ایک عالم دین کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان
ہو گئے.... میری ساس صاحبہ جب فرید کوٹ میں بیابھی گئیں تو اُن کی سکھ برادری میں سے
جب بھی کوئی تاریخ بھگتنے یا کسی کام سے فرید کوٹ آتا تو وہ سکھ سردار.... سر جھٹکے
میرے سر صاحب کے دروازے پر دستک دے کر کہتا تھا ”ادھر ہماری کالی بیابھی آئی
ہے۔ اُسے کہیں کہ اُس کی ناؤ جی آئے ہیں اپنی ہتھیلی آگے کرے“ اور میری ساس
صاحبہ جو ہرگز میری بیگم کی والدہ نہیں لگتیں کہ وہ اپنے پچاسی ویں برس میں بھی ایک
نازک اگرچہ ادھیڑ عمر سفید سفید پری لگتی ہیں اپنی ہتھیلی پر دے سے باہر کرتی تھیں اور ناؤ
جی اُس پر نظریں جھکا کر چاندی کا ایک روپیہ رکھتے تھے اور تجھے بھاگ لگے رہیں کالی کہ
کر تاریخ بھگتنے چلے جاتے تھے....

”بھئی یہ تو بہت ہی کیوٹ بات ہے۔“ ہمیشہ فوراً موم ہو گئیں۔

”ہے ناں؟“

”میں بھی کہوں آپ ہر سردار کو دیکھ کر اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہیں۔ سراسر

کا معاملہ ہے ناں“

”اور یہ تارڑ بھی کسی گیلان، غزنی یا بغداد وغیرہ سے تو آئے نہیں.... ادھر کی ہی
پیداوار ہیں.... دریائے چناب کے جنگل بیلوں میں یا تو بھینسیں چراتے تھے یا چراتے تھے۔
اور تین چار نسلیں پیشتر شدید قسم کے ہندو ہوتے تھے یا پھر سردار ہوتے تھے۔ جو کچھ بھی
ہوتے تھے مسلمان نہیں ہوتے تھے....“

”یعنی آپ کی رگوں میں تو کفار کا خون دوڑ رہا ہے۔“

”مولانا احمد علی اور مولانا عبید اللہ سندھی کی رگوں میں بھی اسی قسم کا خون دوڑتا
تھا ہمیشہ صاحبہ.... ویسے میں اپنی پسند سے نہیں تاریخ کے جبر کے باعث نجیب الظرفین کا
ہوں....“

”لا حول ولا....“ ہمیشہ اب نہ غضب میں تھیں اور نہ ناراض تھیں بلکہ مسکرا

رہی تھیں....

”آپ باتیں تو کھری کرتے ہیں لیکن کچھ زیادہ ہی کھری کھری کرتے ہیں تو میں
صرف اس بات پر اپ سیٹ ہوں کہ یہ جو دپتی ہے چنگی بھلی گوری چٹی اور آنکھوں کو

”ہارڈ صاحب آپ نے تو پورے کا پورا فلسفہ رنگ و بو بیان کر دیا....“ سرگوشی

نے رادوی۔

”اس لئے کہ حضرت علامہ نے بھی تو کہا تھا کہ

نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو....

اور یہ وہی قافلے ہیں عقیدے اور نسل کے جن کے رنگ و بو الگ الگ ہوتے

ہا اور میں ایک اور گزارش کروں؟“

”آج اگر آپ گذارشات پر اترے ہوئے ہیں تو کر دیں۔“ سنہری بابا پہلی بار

بے کیونکہ وہ ڈانٹنگ روم میں ذرا تاخیر سے آئے تھے.... شاید آپ اپنے کمرے میں

پنے بچوں کے لئے خرید کر وہ پلاسٹک کے سومنگ پول کو ٹیسٹ کر کے آئے تھے اور چند

دوٹے کھا کر آئے تھے.... اُن کی داڑھی ابھی تک بھیگی ہوئی تھی۔

”مجھے وہ گزارش بھول گئی ہے۔“ میں یکدم بلیٹنگ ہو گیا کہ میں کتنا کیا چاہتا

”ہوں۔“ گمشدہ نے یہ ”ہوں“ اُس خوابیدہ شنزادی کی طرح کی جو شنزادے

کے انتظار میں برس برس خوابیدہ رہے اور پھر وہ آجائے اور اُس کے لمس سے بیدار ہو

کر کے ”ہوں۔“

”لیکن ہم نے تو سرسری بات کی تھی اور آپ پیچھے ہی پڑ گئے....“ ہمیشہ بنیادی

طور پر بنیاد پرست نہیں تھیں صرف شغل میلے کے لئے ہمیں دھمکانے کی خاطر اس قسم

کی بیان بازی کرتی تھیں۔ ”ویسے آپ غیر جانبدار نہیں ہیں کیونکہ آپ میں ہندو اور سکھ

فلن بیک وقت دوڑ رہا ہے۔“

”نجیب الطرفین کافر۔“ سنہری بابا نے تہقہ لگایا....

اس تہقے کی بلندی نے بلکہ سر بلندی نے دیتی کو ہماری جانب متوجہ کر لیا اور وہ

نوراً ہماری ٹیبل پر آگئیں.... یوں بھی یہ کانفرنس کا آخری دن تھا اور ٹرین کے ایک طویل

نرکے بعد منزل آجانے پر جیسے مسافر جذباتی ہو جاتے ہیں ایسے ہم سب بھی تھے۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ دیتی نے پوچھا۔

”میں تو آپ کے ماتھے پر تھوپے.... میرا مطلب ہے لگے ہوئے تلک کی تعریف

”میں شیر کی سائیز پر ہوں.... اور آپ گمشدہ ایک شیر ہیں اگرچہ ایک گمشدہ اور

شاپنگ کا شائق شیر ہیں.... لیکن آپ سے اور ہمیشہ صاحب سے ایک گزارش ہے کہ ہر

شخص کو دوسرے مذہب کے پیروکار سے کوئی نہ کوئی ہمک آتی ہے.... یہ ہمک اپنے

عقیدے کی سچائی اور گھمنڈ کی بھی ہوتی ہے۔ یوں بھی ہر نسل کی اپنی اپنی خوراک اور م

پہ لگایا جانے والا تیل مختلف ہوتا ہے۔ انگریزوں کو ہم پاکستانیوں سے ادراک اور لسن کی

آتی ہے اور ہمیں اُن کے پانی کے استعمال کے اجتناب اور صرف ٹائلٹ پیپر پر انھار کی

بو آتی ہے.... ٹیلی ویژن کے ایک اداکار کینیڈا میں چند برس گزارنے کے بعد پاکستان

صرف اس لئے لوٹ آئے کہ اُن کے بقول وہ اپنے ارد گرد جو ہیں گھنے ایسے لوگوں کی

موجودگی برداشت نہیں کر سکتے تھے جو گھر سے صرف ٹائلٹ پیپر سے اپنے آپ کو پونچھ کر

نکلے ہوں۔ میرے ایک دوست چین گئے تو ہمہ وقت ناک پر رومال رکھے پھرتے رہے

کراچی کھنڈو فلاٹ پر جو نیپالی مزدور تھے وہ صرف پانی سے گریز کی بنا پر ہی ہمک آ

نہیں تھے بلکہ اُن کے سر ایسے تیل سے چڑھے ہوئے تھے جس کی بو سے ہماری اپنائیت

فاد تھی....“

”بیان جاری رہے ہم ہمہ تن گوش ہیں....“ گمشدہ نے بھی چمک کر کہا۔ حالانکہ

اُس کا ہمہ تن ذرا مختصر تن تھا....

”مجھے اپنی سگی پھوپھی رحمت بی بی کے ہاتھوں اور بالوں سے لٹی کی بو آتی تھی

جب وہ مجھے پیار کرتی تھیں.... اور میں خود جب دیسی گھی سے چڑی ہوئی روٹی کھا کر

اُنگلیوں پر لگے گھی کو نہایت اہتمام سے اپنے ہاتھوں اور چہرے پر مل کر ”شکر الحمد للہ“

کہتا ہوں تو میرے بچوں کو اُس کی بو نہایت ناگوار لگتی ہے.... مجھے اُپلوں پر کڑھے دودھ

کی زردی اور اُس پر بالائی کی موٹی تہ سے بہتر دنیا کی کوئی اور نعمت نہیں لگتی اور میرے

بچے اُس دودھ کا ایک گھونٹ بھر کر اُبکائیاں لینے لگتے ہیں اور غسل خانے کی طرف بھاگتے

ہیں.... تو گزارش یہ ہے ہمیشہ محترمہ کہ یہ جو ہمیں بو آتی ہے تو ایک مختلف لائف سائیکل

اور عقیدے کی بو آتی ہے....“

”واہ....“ ہمیشہ خوش ہو گئیں ”ہم بھی جان بوجھ کر آپ کو چھیڑتے ہیں۔“

”آپ اگر بیس برس پیشتر ہمیں چھیڑتیں تو کوئی بات بھی تھی....“

کر رہی تھی کہ۔ دپتی کتنی دیوی سماں، حسین لگ رہی ہے“ ہمیشہ نے ایک حیرت انگیز پلا
کھایا۔

”میں آج پشوپتی ناتھ جی کے ہاں گئی تھی.... اُن کے چرن چھو کر شکر یہ ادا کیا
اُنہوں نے مجھے یہاں بلایا تھا.... یہ تلک تو میرا جھومر ہے.... ڈو یو لائک اٹ؟“
دپتی نے اگرچہ یونہی پوچھا تھا لیکن سُہری بابا نے یہ خیال کیا کہ صرف اُن سے
پوچھا گیا ہے ”اٹس کوئی....“

”بیوٹی فُل“ ہمیشہ نے عینک سنبھال کر تلک کا جیسے پہلی بار بغور معائنہ کیا۔
”سو کیوٹ....“ گمشدہ مدق دل سے کہہ رہی تھی۔

”تھینک یو.... ویسے میں جب دہلی واپس جاؤں گی تو میری ساس جی یہی کہیں گی
کہ۔ دپتی یہ پشوپتی ناتھ جی کیا ہیں.... ہمارے سرگودھا کے مندر میں جو بھگوان تھے بس
وہی دھرم، ارتھ اور کام کے دیوتا تھے.... تارڑ صاحب اُن کو اپنی جنم بھومی نہیں بھولتی....
آپ جانتے ہیں کہ گودھا ایک ہندو بھگت تھا جو ایک سر.... ایک تالاب کے کنارے دھونی
رمائے بیٹھا رہتا تھا۔“

”ویسے یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ شاہنوں کے شہر سرگودھا کا نام.... ہندو
ہے.... بدل دینا چاہئے“ ہمیشہ نے ذرا قربت میں آکر چپکے سے کہا۔
”ہاں.... میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ہمیشہ.... اور لاہور اور ٹوبہ ٹیک سنگھ اور
واں رادھا رام اور قصور وغیرہ کا نام بھی بدل دینا چاہئے....“

ہمیشہ چپ ہو گئیں....

”ویسے ہمیشہ ابھی ابھی کس بو کی بات کر رہی تھیں؟“

”کوئی بو؟ یہ نیپالی خوراک میں کسی تیل کی بو ہے ورنہ ہن دپتی تو میری بند

جان ہیں۔“

کانفرنس کا اختتام بے شمار تالیوں کی گونج میں ہوا۔

شاید یہ بالآخر قید سے رہائی کی خوشی میں بجائی گئی تالیاں تھیں.... یا اتنے دنوں

کے رفاقت کے بعد اب پھٹ جانے کی اُداسی کی تالیاں تھیں۔

میری این اتنے دنوں بعد اور آشنائی کے باوجود بے کشش تھی اور ایک روپوں

کا طرح.... ایک خاص مشینی ردھم میں.... بے اختیار تالیاں پیٹ رہی تھی جیسے اُس میں
پانی بھر دی گئی ہو....

نیپالی روپانے آج اپنی ساڑھی کو اتنی ڈھیل دے رکھی تھی کہ وہ کچھ بھی نظر
انہے جو آج تک نظر نہ آیا تھا۔ اور اُس کی سفید کمر تالیاں بجاتی تھی۔
وہ گھوڑا خاتون تو جیسے اپنے سُم ہلاتی تھی۔

بگلمہ دہشی خواتین نہایت احتیاط سے اور اپنے چہرے ڈھانپنے اپنی خوشی کا اظہار
رہتی تھیں۔

ہندوستانی وفد سب سے زیادہ پُرشور اور ہاتھ فضاء میں بلند کر کے تالیاں بجاتا
ناب.... پرکاش ایک سرکاری انداز میں دیکھ بھال کر آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہا تھا....

اور دپتی اپنے ماتھے پر تھوپے دال چاول کے خشک ہو جانے کے باوجود اپنے مدھر
روموٹے ہاتھوں سے تالیاں پیٹ رہی تھی۔

گمشدہ ذرا سُستی سے.... یہی عمل ایک سلوموشن میں دوہراتی تھی۔

کرچن مندوین پر ایک مرہبانہ نظر ڈالتا تھا.... جیسے ایک سفید فام ”تاریکی کے
دل“ میں اُترتے ہوئے اُس کے استقبال کے لئے آئے ہوئے ڈھول بجاتے ”وحشیوں“
کو دیکھتا ہو.... کہ میرے کندھوں پر ایک سفید فام کا بوجھ ہے جس کا بنیادی مقصد اگرچہ
نہارے تاریک براعظم کو لوٹ کر لے جانا ہے لیکن تم وحشیوں کو تہذیب سے آشنا کرنا
جی ہے....

کانفرنس کا اختتام ہوا تو نیپالی شمع دان میں جو دیا تھا اُسے بجھا دیا گیا۔

سب کے سب آئین ڈنسوچ آزاد ہو گئے....

لیکن وہ اُن پرندوں کی طرح تھے.... جو پرداز بھول گئے تھے۔ اپنا آسمان بھول گئے
نئے اور در قفس کھلنے کے باوجود واپس اپنے قفس میں آنا چاہتے تھے....

اور جب ایک عمر قیدی آزادی کر دیا جاتا ہے تو وہ کہاں جاتا ہے؟

نزدیک ترین قمار خانے میں....

تھے جس پر ہم پچھلی کئی شاموں سے زندگی گزارتے تھے۔ اور کیا خوب گزارتے تھے۔
اگرچہ آج صرف گانا نہ تھا بلکہ زندہ ناچ گانا تھا۔۔۔

ہمارا فیورٹ ویٹر تھا ہلپا۔۔۔ مسکراتا تھپ تھپ کرتا ہماری میز پر آگیا۔۔۔ نہ وہ انگریزی
باتا تھا نہ اُسے اردو کی سمجھ بوجھ تھی۔۔۔ بس جو بولتا تھا تھپ تھپ بولتا تھا اور وہ بھی
دوستی کے ہلے گلے میں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

اور جس ٹیبل پر ہم براجمان ہوئے وہاں بہت پہلے سے دپتی اپنے چوڑے ہنس
کے ساتھ بہت زیادہ براجمان تھی اور اُس کے ماتھے پر پشوپتی کا تلک بہا دکھلاتا تھا۔ دپتی
کے ہمراہ نہایت سادہ اور خوشگوار مزاج کی چترانیکا تھیں جو آل انڈیا ریڈیو میں بچوں کے
ڈراموں کی تمہانی پر معمور تھیں۔۔۔ البتہ اُن کے برابر میں بیٹھی ہوئی اُن کی بیزار شکل
کی منگ بیٹی بہت ہی بیزار تھی۔۔۔ یہاں اُس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی کوئی رفاقت نہ
فی اور وہ اپنی ماں کے بار بار ”تم بورتو نہیں ہو رہیں؟“ کے جواب میں منہ بسور کر کتی
نہیں۔۔۔ میں تو بہت انجانے کر رہی ہوں۔“

دپتی بے انتہا خوش تھی ”میں نے ابھی ابھی دلی میں اپنے اسپینڈ سے بات کی ہے
اور اُن سے پوچھا کہ کھنڈو میں ہماری آخری رات ہے تو میں کیا کروں؟ تو اُس نے پتہ
ہے کیا کہا؟۔۔۔ اُس نے کہا ”دپتی ڈارلنگ تم آج کی شام خوب مزے کرو اور جو اکیلے تو میں
ہا اکیلے آگئی۔۔۔ میں ایک مشرقی بیوی ہوں اور خاندان کا کما ماتی ہوں۔“
”آپ کچھ جیتیں؟“ گمشدہ جو کبھی جواری حسینہ کے لقب سے سرفراز کی گئی تھی
ازا بیدار ہو کر کہنے لگی۔

”پتہ نہیں۔۔۔ میں نے اپنے پرس میں جو نوٹ ہیں اُن کی دوبارہ گنتی نہیں کی۔۔۔
میں میں جیت گئی اور کہیں بڑی طرح ہار گئی۔۔۔“
”آپ جوانی میں تو کبھی نہیں ہاری ہوں گی؟“ میں نے سوچا ذرا سافلرٹ کرنے
لے کیا حرج ہے۔۔۔

دپتی باقاعدہ طور پر ہلش کر گئیں۔۔۔ اور اُن کا تلک دکنے لگا۔۔۔ یہ ایک حقیقت تھی
کہ وہ اپنے موٹاپے اور مختصر قد کے باوجود ایسی نرمہ زدہ بڑی بڑی آنکھیں رکھتی تھیں جو
باتی تھیں۔۔۔ اور یقیناً جوانی میں اُنہوں نے بہت کچھ بولا ہوگا۔ اور ہلش کرنے کے فوراً

”آخری قمار، خمار اور کمار۔۔۔ اٹھ فرید اُستیا“

قمار خانے میں یا کیسینو میں آج شب کچھ آزر دگی تھی۔
وہ رونق نہ تھی جو ہر شام اُتتی ہوئی چلی آتی تھی۔
نہ چیک شرٹ میں لمبوس۔۔۔ سلاڈ چپاتا۔۔۔ بیڑ کے گھونٹ بھرتا وہ چونکا جواری تھا
جو اپنے سامنے بیٹھی کمار کو بڑے وقتوں کے لئے بچا کے رکھتا تھا۔
اور نہ وہ ”زندگی ایک مرتبہ ہے“ کی باہر بہ عیش کوش والی حسینہ تھی۔

اور نہ ہی دوستو و سکی اور بابا ٹالرائی وہاں موجود تھے۔۔۔
میری زندگی میں شکر اور قناعت کا ایک وہ لمحہ بھی تھا جب اسٹنٹ پروفیسر
میری کوف نے دوستو و سکی کا ناول ”ایڈیٹ“ مجھے تجھے کے طور پر دیا اور اُس پر میرا نام
لکھ کر کہا کہ سوویت یونین میں سب سے پسندیدہ نثر نگار کے نام۔۔۔

اگر دوستو و سکی کے ناول پر۔۔۔ جو کہ میرے اُستادوں میں سے ایک ہے۔ ایسا
توصیف لکھ کر مجھے دی جاتی ہے تو مجھے اس ادب کی دنیا میں اور کیا درکار ہے۔
لیکن یہاں ادب کی نہیں۔۔۔ قمار کی اور خمار کی دنیا تھی۔
تو یہاں اس قمار خانے میں کوئی بھی نہ تھا۔۔۔

شاید وہ سب کچھ تھا جو پہلی شب میں تھا لیکن ہمارے وجود میں آخری شب کی
کھنڈو میں آخری شب کی اداسی تھی جو ہر سو بے رونق کرتی تھی۔
ہم پانچوں سوار کیسینو کی میزھیاں اُتر کر ریستوران کی اُسی ٹیبل پر براجمان

ہوتی۔ میں ڈر دی رب رب کر دی تے۔۔۔ لوکی کہن۔۔۔ پھوئی مونی۔۔۔ پھوئی مونی اور یہ
نیپالی بار پھوئی مونی کی ادائیگی کرتے ہوئے ایسی ستمی ایسے لجاتی جیسے اُس کے بدن پر بہت
ہوس بھرے ہاتھ ہوں۔۔۔

دلیر ممدی کے دلیر پنجابی الاپ کھٹنڈو میں ہماری آخری شب میں ایک قمار خانہ
میں دھال ڈال رہے تھے۔۔۔ اور ایورسٹ اور اناپورنا اگرچہ ایک طویل فاصلے پر تھیں لیکن
ان کی برفوں میں بھی ذرا سی لرزش تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی جب اُنہوں نے ڈھول کی
ٹاپ مٹی ہوگی۔۔۔

مجھے ایک زبردست کلچرل شاک پہنچا کہ پنجابی زبان کہاں پہنچ گئی ہے۔۔۔
پنجابی زبان ہم جیسے پنجابیوں کے باوجود۔۔۔ ہمیں فریب دے کر پوری دنیا میں
رہم اور رومان کی زبان بن چکی تھی۔

اگرچہ شوکت علی نے۔۔۔ پرویز ممدی، عیسیٰ خیلوی اور منصور ملنگی نے اپنے
آپ کو اس کے لئے وقف کیا لیکن۔۔۔ یہ نصرت فتح علی خان تھا۔۔۔ جس نے اقرار کیا کہ میں
اگر نر میں رہنا چاہتا ہوں تو صرف پنجابی میں رہ سکتا ہوں کہ یہ میرے دل سے ایک
ہوک کی طرح اٹھتی ہے۔ سُن چرنے دی مٹھی مٹھی ہوک۔۔۔ ماہیاوے میں تینوں یاد آواں
گئے۔ اُن کی زندگی کے آخری ٹیلی ویژن پروگرام ”تیرے نام“ میں اُنہوں نے اپنی زندگی
اور فن کے بارے میں آخری باتیں مجھ سے کیں۔۔۔ اُن کے پاؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی
تھیں۔ ہفتے میں تین بار ”ڈیلے سس“ کے ذریعے خون تبدیل کرواتے تھے۔۔۔ لیکن اس
کے باوجود جب اُنہوں نے اپنے ہارمونیم پر جھک کر الاپ شروع کیا تو گویا نر کی کائنات کی
نبضیں تھم گئیں۔ اور اُس کے چند روز بعد اُن کی نبضیں تھم گئیں۔۔۔ اکھیاں اُڈیکدیاں
دل واجل ماردا۔۔۔ ساہنوں اک پل چین نہ آوے جہاں تیرے بناں۔۔۔ دم مست قلندر۔۔۔
مست مست! اُن کے ایک محسن موسیقار پیٹر گیبیریل نے بھی کہا کہ ”لاسٹ مپٹیشن آف
کناسٹ“ کے اُس منظر کے لئے جب حضرت عیسیٰ کو سولی تک لے جایا جا رہا ہے آپ
اپنے وطن پنجاب میں موت پر جو بین کئے جاتے ہیں اُس قسم کے الاپ کریں۔۔۔ نصرت
سے ایسے بین کئے ایسے ماتم کئے کہ وہ یادگار ہوئے۔۔۔

اور اس کے باوجود مجھے ایک زبردست کلچرل شاک پہنچا کہ پنجابی زبان یہاں بھی

بعد انہوں نے مجھے گھورا۔۔۔ ”جوانی میں کیا مطلب۔۔۔ ہارڈ صاحب میرا سینیڈا تو اب مجھ
میرے پیر دھو دھو کے پیتا ہے“

”دہتی ایک تو یہ ہے۔۔۔ کہ کسی بھی خاتون کے پیر چاہے کتنے ہی صاف سحر
کیوں نہ ہوں اُنہیں دھو کر اور پھر بالٹی میں جمع شدہ پانی کو پینے کے لئے یا تو مکمل ملاقہ
درکار ہے اور یا مکمل خمار۔۔۔“

”آپ کو کبھی عشق نہیں ہوا ناں اس لئے آپ ایسا کہتے ہیں۔۔۔ میرے خاؤں
ایسے ہی ہیں۔۔۔“

میں نے اپنی زندگی میں جو چند ایک خواتین دستک دیئے بنا در آئی تھیں اُن کے
پاؤں کو یاد کیا۔۔۔ اور پھر یہ فرض کیا کہ میں ایک عدد جھانویں سے اُن کے پاؤں دھور
ہوں۔۔۔ اور میں مکمل طور پر اُن کے عشق میں فنا ہو چکا ہوں۔۔۔ تب بھی میں اُس پانی ا
پینے کا حوصلہ نہیں رکھتا جو اُن کے پیروں کی اور ناخنوں کی میل سے آلودہ ہو۔۔۔ میر
بے شک وحشت ہوس میں کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن۔۔۔ یہ نہیں کر سکتا۔۔۔

”آپ بیڑ پئیں گے؟“ دہتی نے آفر لگائی۔

”جی نہیں، شکریہ“

”میں پلاؤں گی۔۔۔ دے پارٹی اِز آن می“

”نو ٹھیکس۔۔۔“

”پلیز۔۔۔ اِس آن می“

یکدم موسیقی جو اب تک دھسے نروں میں تھی۔۔۔ لوریوں کی طرح گا گاکر
ٹھلانے والی تھی اور اہمات دینے والی تھی اُس نے کروٹ سی بدلی۔۔۔ بیدار ہوئی اور ایک
ہنگامہ سا برپا کر دیا۔۔۔ اُس کی ردھم بہت بلند ہو کر بدن کے بوسیدہ کواڑوں پر دستک دینے
لگی۔۔۔

سنج پر ایک نیپالی لڑکا پنجاب کے روایتی لباس میں لہکتا اور ”بلے بلے“ کہتا ہوا
دھڑام سے آیا۔۔۔ اگرچہ اُس کے چہرے پر سروسوں کا شباب نہ تھا۔ کپاس کی سفیدی نہ
تھی۔ دیسی گھی کی لٹک نہ تھی لیکن اُس کی آواز میں ایک پنجابی کھٹک تھی اور اُس کے
پچھے پچھے ایک نیپالی نار تھی۔۔۔ مانجھے کی جٹی کی طرح سنوری اور بیباک مورنیوں کی لٹھا

اگر یہ مہم جو رابرٹسن نے بھی ہمارے ہم وطن کالاش کافروں کے بارے میں یہی مانا ہے کہ یہ لوگ انکوور کی کشید کثرت سے پیتے ہیں اگرچہ وحشی ہیں لیکن میں نے اپنے برس کے قیام کے دوران کسی ایک کافر کو حواس کھوتے نہیں دیکھا، نٹن ہو کر ”یارو“ ہنسا رکھو میں نشے میں ہوں“ گاتے نہیں مٹا۔۔۔

چنانچہ طے یہ ہوا کہ شراب صرف مومنین پر اثر کرتی ہے کافروں پر نہیں۔۔۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سوم رس کے عادی ہوتے ہیں اور ہم۔۔۔ نہیں ہوتے۔۔۔ یقین ہے کہ اس قسم کے حالات اگر لاہور میں ہوتے تو وہاں غدر برپا ہو جاتا اور نوں کے پٹھے لگ جاتے۔۔۔

تھپا و میٹر تھپ تھپ کرتا ہمیں سرو کرتا رہا۔

اور جس سردار نے دلیر مہدی کے گانے ”ہو گیا بے پیار“ پر بلبے بلبے کیا تھا اب نکل اپنی سرداری کی کڑی نظر سے بچ کر ہاتھ زوم جانے کے لئے اٹھا اور لامحالہ ہماری ہل کی قربت میں سے جھومتا ہوا گذرا تو مجھے دیکھ کر ٹھنک گیا۔۔۔ یہ وہی کلکتے والا سردار مارو پنے والا تھا ”مہاراج مجھے چرن چھونے دو“ وہ فوراً جھکا اور اگر میں اُسے تھام نہ لیتا اور جھکتے جھکتے زمین بوس ہو جاتا۔۔۔

”سردار جی میں جانتا ہوں کہ آپ لاہور سے بہت محبت کرتے ہیں اور آپ کے ہائی امر تر سے وہاں فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔۔۔ آپ کا بہت بہت شکریہ“

”اے بھائی شکریہ نہیں۔۔۔“ وہ یکدم سیدھا اور ہوشیار ہو گیا ”مجھے تو آج پتہ ہے کہ آپ کون ہیں۔۔۔ میں نے تو پہلے پہچانا ہی نہیں تھا۔۔۔ شما کر دیں“ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کر دیا۔۔۔“

”مہاراج میرا پتر ہے ناں راج پال اور۔۔۔ میری نونہ ہے ناں کرن۔۔۔ ادھر لنگڑوں میں ہنی مون کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں آپ کا کارڈ دکھایا تو وہ کہنے لگے ”ہاں جی ہم تو اس بندے کے عاشق ہیں۔۔۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ادھر کھنڈو میں لگے۔۔۔“

”یہ نہیں کیا۔۔۔ مجھے شما کر دیں میں نے آپ کو پہچانا ہی نہیں تھا۔“

”کر دیا۔۔۔“

بچ گئی ہے۔ وہ نیپالی بچہ اور بچی پنجاب کے لباس میں ملبوس اگرچہ بہت لہکتے اور لپکتے لیکن اُن بے چاروں کے بدن میں ہرگز کوئی ایسا زاویہ کوئی ایسا ابھار نہ تھا جو ہوس بیدار کر سکے۔۔۔

اگر لہکتا۔۔۔ اور لپکتا۔۔۔ ایک نسوانی بدن کا ہوس کو بیدار نہ کر سکے تو پھر کاہے لہکتا اور لپکتا۔۔۔

پشتو فلموں کی ایک نگڑی۔۔۔ فربہ اور مرد نما ہیروئن نے ایک مرتبہ بیان دیا تھا اگر سینما سکرین پر ایک ہیروئن تماشائیوں کے جذبات کو مشتعل اور بے قابو نہ کرے وہ ہیروئن نہیں ہے۔

تو اُس حساب سے۔۔۔ کھنڈو کے قمار خانہ میں ناپتے یہ بچہ اور بچی نہایت مصو لگ رہے تھے۔

قطعاً طور پر کسی قسم کے جذبات کو مشتعل تو کیا بیدار بھی نہیں کر رہے تھے۔ ایسے گاتے اور رقص کرتے تھے جیسے کسی سکول کے فنکشن میں ٹیبلو پیش کرتے ہوئے۔۔۔ سنورے لیکن معصوم بچے۔۔۔

”چھوٹی مٹوئی“ کے بعد بچہ بچی نے ”ہو گیا بے پیار“ تپے کچھ نیوں رہنا شروع کر دیا۔ نیپالی نار ناہتی ہوئی اتنی بے قابو سی لگتی کہ سٹیج کی قربت میں بیٹھے ہوئے لوگ ہر لمحہ یہ توقع کرتے تھے کہ وہ لڑھک کر نیچے آگرے گی اور وہ اُسے کچ کر کے ہاؤ از دیٹ کا نعرو بلند کریں گے لیکن وہ ایسی بھی کچی بچی نہ تھی اور ناٹ آؤٹ رہی۔

دوسرا الاپ شروع ہوا تو ریسٹوران کے ایک کونے میں نہایت شائقی اور شراب کے دھیان میں گم ایک سردار جی نے نعرو لگایا ”بلبے بلبے“

اور یہاں اس قمار خانے میں اس کے مے خانے میں میں نے ایک عجیب مجر دیکھا۔

میں اور میرے ہمراہی۔۔۔ گمشدہ اور ہمیشہ بھی پچھلی کئی شاہیں اس غارت گر ہوش میں ہی بسر کرتے تھے جہاں شراب بھی تھی اور بہت تھی اور شباب بھی تھا اگرچہ شہوت سے عاری تھا لیکن اس کے باوجود ہم نے کبھی بھی کسی ایک فرد کو بھی اتنا مخمور نہ دیکھا کہ وہ اپنے اپنے میں نہ رہے اور ہلا گلا شروع کر دے۔۔۔

ہاپے غم وغصے کا اظہار کرتیں اُس نے جھک کر اُن کے پاؤں کو چُھو لیا۔۔۔
ہمیشہ ابھی اس شاک سے سنبھلی نہ تھیں کہ نوبیا ہتا سردار نے کرن نے بھی جھک
ران کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اگرچہ اُسے ٹائٹ جینز کی وجہ سے ذرا احتیاط سے جھکنا پڑا
اور میری بھی پھتھی ہیں۔۔۔“

ہمیشہ اب اس پھتھی کلچر سے بیک آؤٹ نہیں کر سکتی تھیں۔
”یہ سنہری بابا ہیں۔۔۔ یہ ملک صاحب ہیں۔۔۔ اور یہ گمشدہ ہیں جو ہرگز میری پھتھی
لا ہیں۔۔۔“

”تو پھر کون ہیں جی؟“
”یہ بس جواری حسینہ ہیں اور اگر آپ کو جوئے کے لئے کچھ ٹیس درکار ہیں تو
اسے رجوع کیجئے“

”نہ کریں ناں تارڑ صاحب۔“ گمشدہ نے خفیف سا احتجاج کیا۔
”آپ نے نہیں کہا تھا کہ لاس ویگاس میں۔۔۔“
”کما تو تھا پر دشمن ملک کے لوگوں میں تو مشہوری نہ کریں ناں۔۔۔ آخر
بڑا پاکستان بھی تو کوئی چیز ہے۔“

راج پال اور کرن پال کو دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا۔۔۔
جوانی کی نوخیزی میں، بخار بدنوں والے اور ابھی جذیوں کے نقشوں پر اپنی اپنی
ہونگی اور محبت کے شہر دریافت کرنے والے جوڑے مجھے ہمیشہ خوش کر دیتے ہیں۔۔۔
ہرگز بعد میں تو یہ نقشے ازبر ہو جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی بھید نہیں رہتا۔۔۔ اور آپ
نہیں ہند کر کے جذیوں کی اُن جھیلوں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں آب و ہوا گرم مرطوب
ہوتا ہے۔۔۔ راج اور کرن ابھی ایک دوسرے کی کائنات کے اور بدن کے بھیدوں کے وہ
نقشے تھے جو تجربے کی تکنیک سے ایک دوسرے کو دریافت نہیں کرتے تھے بلکہ بھٹکتے
اے انجانے میں کسی ایسی منزل پر پہنچ جاتے تھے جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوتی تھی۔۔۔
ان کے نقشے جب ازبر ہو جائیں اور رد عمل طے شدہ اور معلوم ہو تو انسان محبوب
ایک مشین میں بدل جاتا ہے۔۔۔ جیسے ایک اجنبی بستی میں کشش اور جذبے کا تناؤ
مضبوط تک رہتا ہے جب تک آپ اُس کے گلی کوچوں کے بارے میں یہ نہیں جانتے

”وہ دونوں مصروف رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہنی نمون میں بڑی مشہور ہے
رہتی ہے۔ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتے لیکن وہ آپ سے ملاقات کے لئے نکل آئے
ہیں۔ بلا لوں؟“

ریستوران کے ایک اندھیرے کونے میں ایک نوخیز سکھ۔۔۔ ایسی داڑھی والا سکھ
جو دینی مدرسوں کے طالبان کے گالوں پر کہیں ہوتی ہے کہیں نہیں ہوتی۔۔۔ اچھی پنجابی شکل
والا۔۔۔ گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے اور مدھسریاہ کشش آنکھوں والا اور اُس کے پہلو میں
کرن۔۔۔ جو ایک ٹی شرٹ اور جین میں تھی اور میز پر رکھے اپنے راج کے ہاتھ پر ہاتھ
رکھے اُسے دباتی تھی اور وہ دونوں مسکراتے ہوئے اور محبت بھری نظروں سے ہماری
جانب دیکھتے تھے۔۔۔

”اے آجاؤ۔“ سردار جی دوپٹے والے نے نعرہ لگایا۔
وہ دونوں تھکن کے ساتھ اُٹھے جو نوبیا ہتا جوڑوں کے بدن کو خوشی دیتی ہے اور
ذرا جھجکتے ہوئے ہماری ٹیبل پر آگئے۔

راج ابھی جوان ہوتا ہوا سکھ تھا اور نو عمری کے باوجود اُس میں نئی نسل کی ایک
گہری اور ٹھہراؤ والی دانش تھی جو پچھلی نسل میں کم کم تھی۔۔۔ کرن اُس کی ہم عمر لگتی تھی
اور وہ ایک اُبلتی ہوئی اور اپنے خاندان کے بدن کی باس لئے سکھتی تھی اور اُس ہنی نمون
زہند میں تھی جس میں کچھ بھی اور کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ وہ دونوں چونکہ
مشرقی پنجاب میں زیر تعلیم رہے تھے اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے میری شکل اور باتوں کے
صرف واقف تھے بلکہ بار بار ایسے نعروں کے حوالے دیتے تھے جو میں نے کئے تھے اور
میں اپنے کئے کو بھول چکا تھا لیکن وہ نہیں بھولے تھے۔۔۔

میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کروایا اور چونکہ مجھے ہمیشہ صاحب سے ”وہ جی
تارڑ صاحب کے رشتے دار آگئے“ کا بدلہ لینا تھا اس لئے اُن کو متعارف کرواتے ہوئے
میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور راج پال سے کہا ”سردار پتہ۔۔۔ ان سے ملو یہ میرا
پھتھی ہیں۔“

”پھتھی ہیں؟“ راج فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ”پھر تو جی یہ ہماری بھی پھتھی
ہیں۔۔۔ چرن چھوٹے دیں پھتھی صاحب۔“ اور اس سے پیشتر کہ ہمیشہ اس رشتے کے بارے

”نہیں انکل جی۔ میں شراب نہیں پیتا۔“
 ”یار تم کیسے سکھ ہو؟“

”میں جی بس ایسا ہی سکھ ہوں۔“ وہ خوش دلی سے ہنسنے لگا اور اُس کے دانت
 ن ہمار اور سفید تھے.... اُس کی داڑھی ابھی چھدری تھی اور اتنی گھنی نہ ہوئی تھی کہ
 اس میں سے اُسے اپنا منہ تلاش کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے....
 ”اگر تم شراب نہیں پیتے تو تم بلونت سنگھ کے سکھ نہیں ہو سکتے....“
 ”وہ کون ہیں جی؟“ کرن اتنے اٹھا کہ سے میری باتیں سن رہی تھی جیسے میں
 رتھ صاحب کا ہاتھ کر رہا ہوں۔

”وہ بھی میرے رشتے دار ہوا کرتے ہیں۔“ مجھے افسوس ہوا کہ وہ اُس شخص کو
 بل جانتے جس نے راجندر سنگھ بیدی کے ہمراہ اردو ادب کے بند کواڑ کھولے اور اُن
 پنجاب کی تازہ اور سروسوں سے مہکتی ہواؤں کے لئے راستے بنائے اور جس کی فضا کو
 ”کیا“ وہ راتوں کے بارے میں چوروں اور چاندنیوں کے بارے میں لکھا کرتے تھے....
 باب کے سکھ یا زمیندار کا اگر کوئی مقام ہے تو وہ بلونت سنگھ کی وجہ سے ہے.... پھر وہ
 پنے لاہور سے جدا ہو کر شاید احمد آباد چلے گئے.... اُنہیں وہاں کون جانتا تھا.... اُن کے
 رنے کی خیر جب پاکستان پہنچی تو ہم نے یہی کہا کہ.... بٹے رون گے ولاں دے جانی تے
 پے تیں گھٹ رون گے.... احمد آباد میں جانے وہ کس مرگھٹ میں جل کر خاک ہوئے
 ر احمد آباد کے لوگوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ کون جل کر راکھ ہوا لیکن اُن کی راکھ لاہور
 ل پہنچی اور ہم نے اُن کا سوگ منایا.... میں اُن سے کبھی نہیں ملا لیکن اُن کے روحانی
 باروں میں سے ایک ہوں.... وہ اگر کسی عورت کے حُسن کو اخیر جانتے تھے تو کہتے تھے
 لہ کیا ٹھوئیں ورگی رن اے....“

”Really؟“ کرن ہنسنے لگی....

”یہ ٹھوئیں کیا ہوتا ہے تارڑ صاحب۔“ ہمشیرہ جو اب تک بھتیجی صاحبہ ہونے
 کے شاک میں سے باہر نہیں آسکی تھیں بالآخر بولیں....
 ”بچھو کو ٹھوئیں کہتے ہیں ہمشیرہ۔“
 ”تو ایک حسین لڑکی کو بچھو کہہ رہے ہیں تو یہ کس قسم کا لڑچر ہوا؟“

کہ یہ گلی کہاں پر جا کر ختم ہوگی اور اس کو بچے کے اختتام پر کیا ہے....
 جہاں اجنبیت ختم ہوتی ہے وہاں سے جذبے سرد ہونے لگتے ہیں۔

”کا کا شراب پیئیں گا؟“ میں نے راج سے پوچھا.... پوچھ تو لیا لیکن فوراً ہی اپنی
 حماقت کا احساس ہوا کہ یہ کیا سوال ہوا.... ایک ہاتھی سے پوچھنا کہ تمہیں گئے پنڈ ہیں۔
 ایک اونٹ سے دریافت کرنا کہ تمہیں نخلستان اچھا لگتا ہے۔ ایک دریائی گھوڑے سے
 پوچھنا کہ تمہیں دریا پسند ہے.... غالب سے آمون کا میرے عطار کے لونڈے کا.... اور
 سے شاہ گوری کا.... کہ تمہیں پسند ہے کیا سوال ہوا.... میرا فیورٹ سکھ دوست سنگھ دیپ
 سنگھ راگنی خمینی کے انقلاب کے بعد تھران سے رخصت ہو کر آسٹریلیا جا آباد ہوا تھا کہ اُر
 کا بزنس ہاؤس تھران میں سکاچ وہسکی کا سب سے بڑا امپورٹر تھا اور ظاہر ہے خمینی کے
 تھران میں ٹھہرنا بھوکے مرجانے کے مترادف تھا.... ایک روز اُس نے مجھے اپنے بیٹے
 شادی کی دعوت دینے کے لئے آسٹریلیا سے فون کیا تو میں نے حال احوال دریافت کرنا
 کے بعد پوچھا.... سنگھ دیپ داڑو پھلکنے کا کیا حال ہے.... اور یاد رہے کہ اُس کا فلسفہ حیات یہ
 تھا کہ چوہدری داڑو نہیں تو سردار نہیں.... داڑو ہے تو سردار ہے.... تو سنگھ دیپ نے اڑ
 سفید ہوتی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا.... اگرچہ فون پر یہ تو دکھائی نہیں دیتا کہ فون کرنا
 والا اس لمحے کیا کر رہا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اس لمحے داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا ہو گا
 اُس نے کہا تھا ”چوہدری.... اب میں نے داڑو پھلکنا چھوڑ دیا ہے....“

اور مجھے اتنا ہی شاک ہوا جتنا کہ کسی کے مذہب چھوڑ دینے پر ہوتا ہے ”لیکن
 کیوں؟“

”یار ادھر میں شپ فارمنگ کرتا ہوں.... بھیڑیں پالتا ہوں.... تو شروع شروع میں
 داڑو پیتا تھا اور پھر اپنے فارم کی ایک بھیڑ روست کر کے یاروں کے ساتھ کھا جاتا تھا....
 ایک روز میں نے سوچا سنگھ دیپ تو بھیڑوں کا بیوپاری ہے.... اگر یہی معمول رہا تو اپنی
 ساری بھیڑوں کو کھا جائے گا.... تو میں نے داڑو چھوڑ دیا....“

سکھ اتنے پریکٹیکل بھی ہوتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا.... حالانکہ وہ ہوتے ہیں۔
 تو میں نے جب راج پال سے پوچھا کہ کا کا شراب پیئیں گا اور سوال پوچھنے ہی اپنی
 حماقت کا احساس ہوا لیکن ادھر سے جو جواب آیا اُس نے مجھے شرمندہ کر دیا۔

”دکھائی نہ دیں۔“

فلپس میری ان نیم وا آنکھوں کو بار بار چندھیاتا تھا۔
سینچ پر جو نیپالی بچہ لوگ تھے انہوں نے پبلک کے پرزور اسرار پر ”میں ڈردی
بازب کردی“ دوبارہ شروع کر دیا۔ اور اُس کی پُرجوش ردھم سے کیسینو کی میزوں پر
لمٹھے بھی لرزے لگے۔

فونو سیشن کے بعد میں نے راج پال سے کہا ”پتر آپ کے بھائی جی۔۔ سردار جی
پنے والے تو بڑے زبردست جواری ہیں اور آپ کی ماتا جی بھی سلاٹ مشینوں کے
نے بیٹھی سکوں سے بھرے کٹورے کے کٹورے خالی کرتی ہیں تو آپ نے بھی کچھ داؤ پر
؟“

”نہیں جی۔۔ میں جوا بالکل نہیں کھیلتا۔“

عجب غیر آئینی سکھ تھا۔ نہ شراب پیتا تھا۔ نہ جوا کھیلتا تھا۔

شاید وہ کرن جیسی بیوی کی موجودگی میں یوں بھی ہمہ وقت خمار بدن میں رہتا
... کسی داؤ پر کبھی ہارتا ہو کبھی جیت جاتا ہو۔۔۔ تو اُسے شراب اور جُوئے سے کیا لینا دینا۔
گشدرہ اور کرن امرتسر اور دہلی میں شاپنگ کے ممکنات پر تبادلہ خیال کر رہی
ن۔۔۔ اور گشدرہ اُس پر نچھاور ہوتی چلی جا رہی تھی، فاروق اور ملک غائب تھے۔۔۔ سُہری
زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتے ہوئے داڑھی نچوڑتے تھے اور نیپالی نار کا تفصیلی جائزہ
لے رہے تھے کہ شاید کہیں کوئی ثبات نظر آجائے۔۔۔ ہمیشہ اور دیتی شیر و شکر ہو رہی
ن اور شاید دوپٹہ بدل ہمیں بننے پر غور ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ راج اور کرن
اند پر دیتی ذرا چُپ ہو گئی تھی اور اُن کی پذیرائی پر قدرے آزرہ تھی۔

”چاچا جی آپ مٹا ہے کہ لکھاری ہیں تو کوئی شعر تو سنائیں۔“

”پتر میں شاعر نہیں۔“

”لکھاری شاعر نہیں ہوتے؟“ راج حیرت زدہ ہو کر بولا۔

”نہیں۔۔۔ لیکن تم دونوں کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ شعر میرے ہوں یا کسی

دکے ہوں۔۔۔ مثلاً۔۔۔ مائے نیں مائے میرے گیتاں دے نیٹاں۔۔۔ وچ برہوں دی رڈک
... کیسا ہے؟“

”ایک تو وہ کسی حافظ یا غالب کی عورت کے بارے میں یہ بات نہیں کر
رہے۔۔۔ یہ وہ ایک پنجابی عورت کے بارے میں کہہ رہے ہیں جو سراسر ایک مختلف میٹیز
ہے۔۔۔ اور دوسرا یہ کہ اگر آپ سردار ہوتیں اور اپنی زندگی کی حسین ترین عورت
دیکھتیں جو آپ کو ڈس کرنیلی پہلی کر دے تو اُسے آپ اور کیا کہیں گی؟“
”ہم خواہ مخواہ سردار ہوتیں۔“ وہ پھر تھا ہو گئیں۔

”آپ سردار تو نہ ہوتیں۔“ فاروق جو بہت مدت سے چُپ بیٹھا تھا میری مدد
آگیا ”سرداری ہوتیں۔ اور گرل گائیڈ ہمیشہ آپ رہنے والی تو چکوال کی ہیں اور ہم
متاثر کرنے کی خاطر اپنے شین قاف کو حلق سے یوں نکالتی ہیں کہ ہم پنجابی حضرات ہر
سکتے میں رہتے ہیں۔۔۔“

”بھئی کرن۔۔۔“ اور یہ جو کرن تھی اُس کی معصومیت اور بڑی بوڑھیوں دا۔
دانش مند رویے سے مجھے یوں لگا جیسے وہ میری اکلوتی بیٹی یعنی کی طرح ہے ”اس شین
قاف سے یاد آیا کہ۔۔۔ ایک سکھ سردار لکھنؤ کے ایک چوک میں سڑک پر پڑا لوٹ پوٹ
رہا تھا اور نہایت اذیت میں تھا اور قریب المرگ یعنی واہ گرد کی قربت میں جانے کو تھا
کسی نے یونہی پوچھا کہ اس سردار جی کو کیا ہوا ہے؟۔۔۔ جواب آیا کہ ذرا ”ق“ کو حلق
سے نکالنے کی کوشش کی اور وہ وہیں گلے میں پھنس گیا اور نکل نہیں رہا۔۔۔ اور تب۔۔۔
یہ حال ہے۔۔۔“

کرن اور راج اس جوک سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہوئے کہ اُن کے ہاں
شین قاف کا مسئلہ نہ تھا۔۔۔ صرف ہمارے ہاں تھا۔۔۔

کرن چپکے سے اٹھی اور اپنا نہایت تازہ ترین نیکنالوجی کایمرہ ایکو پمپٹ ہارڈ
میز کے سامنے اہستہ کرنے لگی۔۔۔ کیرہ شینڈ اور مختلف لائٹس کو وہ یوں سیٹ کر رہی
تھی جیسے کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آئی ہو۔۔۔ ”انکل اگر آپ مائٹ نہ کریں تو میں آپ کی
چند تصویریں اُتار لوں؟“

”انکل کو شروع سے تصویریں اُتوانے کا بہت شوق ہے۔۔۔“ میں نے اپنے
موٹاپے کو سانس کھینچ کر ذرا اندر کیا اور اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے اپنے چہرے پر ایک
ایسی مسکراہٹ سجالی جس کے پیچھے جو بد رنگ اور مستقبل قریب میں جھڑنے کو جو دانت

”یہ تو شوکار بیالوی ہے جی۔“

”ہے ناں؟.... اور میں اُس کا ایسا معترف ہوں کہ اُس کے صرف ایک مصرعہ اکثر ورد کرتا ہوں.... عشقے دا اِک پلنگ نواڑی دے آساں چانیاں وچ ڈاہیا....“

”تارڑ صاحب“ ہمشیرہ نے عینک اتار کر اُس کے شیشے صاف کئے اور پھر پین کر نہایت متانت سے پوچھا ”یہ عشقے وغیرہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ باقی کیا ہے.... اگرچہ ہم چکوال کے ہیں لیکن ایک مدت سے اردو بولتے ہیں اس لئے یہ ہمارے پلے نہیں پڑتا....“

”ہمشیرہ اس مصرعے کو سمجھنے کے لئے گرمیوں کی شب میں جب گاؤں کے پتے

کوٹھے ابھی حدت دے رہے ہوتے ہیں اور بہت دھیرج سے وہ ٹھنڈے ہوتے ہیں اور

ایک ہلکی ٹھنڈک کھیتوں کی جانب سے تیر کر آنے لگتی ہے اور چاندنی کا غبار آسمانوں سے

اُتر کپتے گھروں کے اندر تک جاتا ہے اور بچھے ہوئے دیئے کے طاقتے میں صرف اندھیرا

پناہ گزین ہوتا ہے ورنہ وہ ہر پڑچھتی اور ہر بھڑولے کو نمایاں کرتا ہے.... اور اُس چاندنی

میں اگر چھت پر سفید نواڑ کا پلنگ ہو تو اُس کی چھب دیکھنے کے لائق ہوتی ہے اور یہی

عشق کا نواڑی پلنگ ہے جس میں سُرِ دگی کی دعوت بھی ہوتی ہے اور ٹھنڈک کی خوبصورتی

بھی، تو اس مصرعے کو سمجھنے کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔“

”یہ آپ کن زمانوں کی بات کرتے ہیں؟“

”جب ایک پنجابی شاعر حافظ برخوردار کے بقول چاندنی اتنی سفید ہوتی تھی کہ

اُس میں اُڑتا ہوا سیاہ کوا بھی روئی کے ایک گالے کی طرح دکھائی دیتا تھا....“

”انکل شعر سنائیں۔“ کرن نے پھر کہا۔

اب شاعری مجھ پر اثر تو بہت کرتی ہے، اور میں نے کبھی اس کی زبان یا قویت پر

غور نہیں کیا صرف اس کے اثر کو قبول کیا ہے.... لیکن شعر یاد کرنے میں بالکل پھینڈی

ہوں.... لفظ ہمیشہ آگے پیچھے ہو جاتے ہیں اور ایام جوانی میں بھی جب عدم اور سار کے

شعروں کو رٹا لگا کر یاد کیا کرتا تھا تو اُس کو سامنے پا کر ہمیشہ بھول جاتا تھا.... لیکن کچھ شعر

ایسے ہوتے ہیں جو آپ کے بدن میں خود رو بوٹوں کی طرح اُگتے ہیں اور جڑیں پکڑ جاتے

ہیں، اُنہیں یاد نہیں کرنا پڑتا وہ آپ کے بدن میں چشموں کی طرح پھوٹتے ہیں اور جاری

ہو جاتے ہیں۔

”لو بھی راج اور کرن.... ذرا سٹنو....“

کس دادوش سی کس دانئیں سی.... امہہ گلاں، مَن کرن دیاں ننئیں

ویلے لنگھ گئے توبہ والے.... راتاں ہو کے بھرن دیاں ننئیں

کچھ اُنج دی راہواں اوکھیاں سن.... کچھ گل۔ وچ غم دا طوق وی سی

کچھ شر دے لوک وی ظالم سن.... کچھ مینوں مزن دا شوق وی سی....“

راج ایک عجیب سے سکوت میں چلا گیا اور وہ میری جانب ایسے دیکھتا تھا جیسے میں

بھی کوہ طور سے اُترا ہوں اور وہاں سے جو احکام موصول ہوئے ہیں اُن کو بیان کر رہا

ہوں۔ کرن کی سیاہ آنکھوں میں ایک حیرت اور اُداسی در آئی جیسے کسی مسافر کو سرشام

نیل سے بہت دُور بارش نے آ لیا ہو.... اور اُس کے سر پر جو زندگی کے کانڈ کے پنہول

ہوں وہ بھیگنے لگے ہوں۔

”یہ کس کے شبدھ ہیں انکل تارڑ۔“ کرن بھیگی ہوئی اور بے آسرا سی لگتی تھی

راتنی آہنگی سے پوچھتی تھی کہ گمشدہ کی سرگوشی بھی بلند لگتی تھی۔

”منیر نیازی کے۔“

”ذرا دوبارہ سنادیں گے.... پلیز“

وہ اپنے پرس میں سے ایک نوٹ بک نکال کر میری جانب ایک ایسے ساکلی کی

طرح دیکھنے لگی جس کی عرضی پر میرے دستخط ہو جانے سے وہ عمقید سے رہا ہو سکتا ہے۔

”یہ تو گرنتھ صاحب میں شامل کرنے کے لائق ہیں۔“ راج بھی بہت چُپ تھا

ادب بولا۔

”لوگوں کے دلوں میں جو گرنتھ صاحب ہوتا ہے اُس میں تو یہ شامل ہو چکے

ہیں۔“

”میں چلتی ہوں۔“ دپتی اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ دیئے.. پشوپتی ناتھ جی کا

کہ شاید منیر کی شاعری کے اثر سے اب بے رنگ ہو چکا تھا ”تارڑ صاحب آپ دہلی

آئیے تو ہم پہلے لوگ ہوں گے جو آپ کا سواگت کریں گے....“

چترا نگام اور اُس کی بیزار بیٹی نے بھی آنکھوں میں بھری نیند سے مجبور ہو کر

بلازت چاہی اور چلی گئیں۔

اُس نے ایسے پوچھا جیسے ایک زمانہ میں جب کم کم لوگوں کو بلاوا آتا تھا اور وہ ان بیٹے کی پیاس میں وہاں جاتے تھے جسے رُک رُک کہا گیا اور وہ اتنے ہزاروں برسوں سے نہیں رُکا... تو وہ ایک جرمہ پی کر واپس آتے تھے تو اُن سے پوچھا جاتا تھا... کہ آپ نہ ہواؤں میں سانس لے کر آئے ہیں جن میں اُن سانسوں کی خوشبو ہے تو ذرا یہ تو اُنہیں کہ وہاں مکان کیسے تھے، لیکن کیسے تھے، درخت کیسے تھے اور مٹی کا رنگ کیا تھا... ان نے ایسے ہی کھٹنڈو کے ایک قمار خانے میں گئی شب کی بے رونقی میں مجھ سے پچھا...

”میں ناک آنا... کی بستی نکانہ میں ایک مرتبہ گیا تھا... گورو دوارہ جنم استھان نے اُس مقام پر جہاں باباجی کی پیدائش ہوئی تھی اور یہ ایسے باباجی تھے کہ ہمارے علامہ بال نے بھی اُن کی شان میں شعر لکھے ہیں تو وہاں... پشتون سرداروں نے میرے عزت رانی کے طور پر میرے سر پر ایک پگڑی باندھی تھی جسے آپ شلوکا کہتے ہیں اور نکانہ اب کے سب سے خوش آواز راگی نے میرے سامنے بیٹھ کر مجھے بابا فرید کا وہ کلام سنایا جو گرنتھ صاحب میں شامل ہے ”اٹھ فرید استیا صبح نماز گزار...“

بہت دیر بعد ہمشیرہ بولیں کہ اُن کے لئے ہمارے گفتگو میں ایسی خبریں تھیں جو پہلی بار سن رہی تھیں ”تارڑ صاحب کیا سچ بچانے کی مقدس کتاب میں نماز گزارنے کی بات لکھی ہوئی ہے؟“

”ہاں... اور ان کے کتے مہینے یعنی دربار صاحب کی بنیاد میاں میر صاحب نے لکھی تھی...“

”واقعی؟“ مہتری بابا نے کہا۔

”نہیں تارڑ صاحب۔“ گمشدہ بھی بیدار ہو گئی۔

”یہ میاں میر کون تھے۔“ ملک نے دریافت کیا ”میاں نواز شریف کے رشتے دار تھے؟“

”نہیں... یہ سیاستدان نہیں تھے اگر ہوتے تو دارا شکوہ کی بجائے اورنگ زیب

بہاگتہ دیتے... اور میں نے نہیں ابن انشاء نے لکھا تھا کہ اورنگ زیب وہ حکمران تھا جس نے ساری عمر ایک نماز نہیں چھوڑی... اور ایک بھائی نہیں چھوڑا...“

”پتھر ہندو لوگ تو چلے گئے ہیں... تو اب آپ یہ بتائیں کہ اندرا گاندھی نے دربار صاحب پر حملہ کرنے کی حماقت کیوں کی تھی؟“

”چاچا وہ اور کیا کرتی... دربار صاحب پر سنت بھنڈر انوالا قابض ہو گیا تھا... ہمارے سکھ مذہب کا متعصب مولوی تھا... ہم سب تو اُس کے ساتھ نہ تھے... تو اندراج اور کیا کرتیں؟... چاچا ایسی باتیں نہ کریں...“ اُس نے فوراً گفتگو کا رخ موڑ دیا ”اتنی اچھی باتیں ہو رہی تھیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ یا تو وہ بہت دکھی ہے یا پھر اندرا گاندھی کے ایکشن سے بہت زیادہ اختلاف نہیں رکھتا تھا...

ویدر تھاپا بار بار تھپ تھپ کرتا ہمارے قریب سے گزرتا تھا، ہم نے بہت دیر سے نہ کچھ کھایا تھا نہ کچھ پیا تھا...

کرن نے وہی نوٹ بک میرے سامنے رکھ دی جس پر اُس نے منیر کے شعر نقل کئے تھے ”میرے لئے کچھ لکھ دیں... میں جب اپنی فرینڈز کو آج شب کی تصویریں دکھاؤں گی اور آپ کے آٹو گراف دکھاؤں گی تو وہ یقین نہیں کریں گی...“

میں نے اُس نوٹ بک پر منیر کو ہی دوہرا دیا... ”کس دادوش سی کس دانیں سی... امہر گلاں ہن کرن دیاں منیں...“ یہ میں نے پارٹیشن کے حوالے سے لکھا ہے جب آپ کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں کے خون سے اپنی کرپانوں کو سرخ کیا تھا... جو کالیاں کے گورو دوارے میں ہم نے بھی بہت ظلم کیا لیکن آپ کے ظلم میں وسعت بہت تھی... بیدردی اور سفاکی بہت تھی...“

راج اور کرن نے اداکاری نہیں کی بلکہ اُن کی حیرت اور بخل تھی... اور وہ یہ نہ جان سکے کہ محبت میں یہ شکایتیں کہاں سے آئیں... نہ اُنہیں بتایا گیا تھا اور نہ وہ جانتے تھے کہ اُن کی پیدائش سے پیشتر پنجاب کیسے لہو رنگ ہوا تھا۔ ایسی شکایتیں کبھی نہیں مرتیں... ان کی لاشیں صدیوں تک سامنے رہتی ہیں اور فریاد کرتی ہیں۔

”چاچا آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“ راج نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے درخواست کی... ”آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ کبھی نکانہ صاحب گئے ہیں؟ وہاں کے مکان کیسے ہیں؟ درخت کیسے ہیں؟ مٹی کی رنگت کیسی ہے؟“

”یہ ہندوستانیوں کے سامنے تو ایسی باتیں نہ کریں۔“ سرگوشی نے احتجاج کیا۔
راج کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کہاں سے کہاں کیوں نکل جاتے ہیں اُس
نے پھر میرا کندھا پکڑ کر پوچھا ”چاچا جی.... وہ شلوکا کہاں ہے جو بابا نانک کے جائے پیدائش
پر آپ کو باندھا گیا تھا؟“

”وہ میری سٹڈی میں کارل مارکس، نطشے، ہومز، مجید امجد اور قرآن العین حیدر
کے نیچے ایک دراز میں ڈھول جمع کرتا ہے.... اور اُس روز کا منتظر ہے جب
شکھ دیپ شکھ راگی یا ترلوک شکھ منڈیر پاکستان آئیں گے.... میرے گھر آئیں گے اور
میں اُن کی امانت اُنہیں واپس کر دوں گا کیونکہ وہ گڈری.... وہ شلوکا.... میرے عقیدے کے
تانے بانے سے نہیں بٹا ہوا.... میں شرمندہ بھی ہوتا ہوں کہ اُس کی قدر نہیں کر سکتا۔
بالکل اسی طرح.... جیسے آپ کو خلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا مل جائے تو آپ اُس میں ایک سیاہ
مٹل کے ٹکڑے کے سوا اور کچھ نہ دیکھ پائیں گے اور اُس کا اگر آپ بہت احترام کریں
گے تو پھینکیں گے نہیں کہیں سنبھال دیں گے اور وہ ڈھول جمع کرتا رہے گا.... اور اگر وہی
ٹکڑا میرے نصیب میں آجائے تو میں اُسے فریم کروا کے ایسے زاویے پر آویزاں کروں گا
کہ فجر کی نماز پر سلام پھیرتے ہوئے وہ میری نظروں میں آجائے....“

”ہم اگر پاکستان آئیں تو کیا آپ اُس شلوکے کو ہمیں دکھائیں گے؟“
”پتر تم آجاؤ تو شاید میں اُسے تمہارے سر پر باندھ کر تمہیں بخش دوں کہ
شکھ دیپ آسٹریلیا میں بھیڑیں پالتا ہے.... اور ترلوک انگلستان میں ریٹائر ہونے کے بعد
گولف کھیلتا ہے۔“

”ہم گمشدہ.... ہمیشہ اور سُہری بابا نہایت پیباکی سے مسلسل جمائیاں لیتے جا رہے تھے
اور مجھ سے عاجز آچکے تھے....“
”تارڑ صاحب.... صبح کے تین بج رہے ہیں۔“ گمشدہ نے اپنی کلائی پر بندھا
اُس مختصر گھڑی کو دیکھا جس کا ٹیم ایک کھتی سے بڑا نہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ سرگوشی نے
جو تین بج جانے کا اعلان کیا تھا وہ ریستوران کے کلاک پر نظر ڈال کر کیا تھا.... ورنہ کھتی کی
سویاں کہاں ہوتی ہیں....

”ہم چلتے ہیں جی۔“ راج اور کرن اپنی طویل موجودگی سے ذرا شرمندہ ہو کر

”ہم چلے ہوئے۔“ ہم نے بھی مارٹنگ فلائٹ سے واپس جانا ہے۔“
میں نے اپنی جیب میں سے دس روپے کا ایک پاکستانی نوٹ برآمد کیا اور کرن کی
ہنسی پر رکھ دیا ”جیسے میری ساس صاحبہ کے شکھ رشتے دار اُن کی ہتھیلی پر کچھ نہ کچھ
کتے تھے.... تو میری جانب سے.... اے کاکی یہ دس روپے تمہارے لئے ہیں۔ ہتھیلی آگے
لڑ میری جیب میں فی الحال یہی دس روپے کا نوٹ ہے۔“
ہمیشہ فوراً موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے دھم سے کود پڑیں ”تارڑ
صاحب۔ میرے پاس سو روپے کا نوٹ ہے.... بچی کو کم از کم سو روپیہ تو دیں۔“
”خاموش ہمیشہ....“ میں نے نہایت درشتگی سے اُنہیں جھاڑ دیا ”کیا آپ چُپ
نہیں رہ سکتیں؟“
کرن نے اُس نوٹ کو ایک صحیفے کی طرح سنبھالا اور پھر جھک کر میرے پاؤں کو
بُھا ”تھینک یو انکل....“
راج بھی جھکا اور میرے جو گرز کو ہاتھ لگا کر کھڑا ہو گیا ”ہم چلتے ہیں۔“ پھر جیسے
اُسے ایک عظیم غلطی کا احساس ہوا اور وہ مُڑ کر ہمیشہ کے پاس آیا اور اُن کے جو گرز کو
بُھوکنے لگا۔
”پچھتی صاحبہ.... ہم چلتے ہیں۔“
پچھتی صاحبہ نے پھنکار کر اُنہیں جانے کی اجازت دی اور اُن کے جانے کے بعد
ٹُپو برس پڑیں ”بھئی میں جو کہہ رہی تھی کہ میرے پاس سو کا نوٹ ہے تو بچی کو صرف
اُس روپے پر کیوں ٹر خا دیا؟“
”ہمیشہ صاحبہ آپ میرے مخدوش کردار کی تہ تک نہیں پہنچ رہیں۔ میرے
نُہے میں بھی سو کے متعدد نوٹ موجود تھے لیکن.... زیادہ جذباتی ہونا صحت کے لئے مضر
نہا ہے۔“
ہم بھی اٹھنے کو تھے کہ فاروق نے ہتھیلی سامنے کر دی جیسے ہمیں روکنے کو ہو
بلاکل کارپوگرام طے کر لیا جائے.... کل ہمارا آخری دن ہے....“
”کیوں تارڑ صاحب۔“ سرگوشی اُونگھتے اُونگھتے بولی....
”بھئی کل تو ہمارا نگر کوٹ ایڈو سنچر اس لئے ٹھس ہو گیا کہ ہمیں ملک صاحب

آجے گی جہاں کھڈیوں پر.... ہاتھ کی کھڈیوں پر پشمینہ بنا جاتا ہے.... مفلر بھی ہوتے ہیں، ہل بھی ملتی ہیں اور بازار سے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اور کندھوں پر ڈالنے والے ڈال بھی.... اور تارڑ صاحب اصل پشمینے کے ہوتے ہیں۔ اور اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی واقفیت ہے تو اور محل قیمت پر پندرہ فیصد ڈسکاؤنٹ بھی مل جائے گا تو.... آپ

ہری پوزیشن سمجھتے ہیں ناں.... تو اگر آپ مانڈ نہ کریں تو....

”ہم آپ کی پوزیشن بخوبی سمجھتے ہیں بی بی۔“ سُہری بابا گویا ہوئے ”ٹھیک ہے پشمینہ فیلٹری میں ہو آئیں بلکہ ہمارے لئے بھی ایک ایک شال خرید لائیں اور ہم ہنگر کوٹ ہو آتے ہیں۔“

”پھر میں بھی نہیں جا پاؤں گی۔“ ہمیشہ نے شاید اپنے آپ سے یا گمشدہ سے اس ہو کر کہا....

”نہیں نہیں آپ ہو آئیں ناں ہنگر کوٹ۔“ گمشدہ نے خفیف سا احتجاج کیا....

”بھی تم تمہا گئی تو کہیں کھو جاؤ گی.... تمہیں تلاش کرنے والا بھی تو کوئی ہونا پڑے.... تو آپ لوگ ہو آئیں....“

”ویسے تارڑ صاحب آپ جانتے ہیں کہ میری ایک ٹانگ میں لوہے کی سلاح کا ہے.... تو خواتین نہیں جا رہیں تو ہم جا کر کیا کریں گے.... ہنگر کوٹ یقیناً ایک پہاڑی رہے شاید میری ٹانگ کے لئے موزوں نہ ہو....“ سُہری بابا بھی بیک آؤٹ کر گئے.... آپ لوگ ہو آئیں....“

”ہم لوگ کیا ہو آئیں.... ہم تو بس ہو آئے۔“ میں نے جھجھ کر آخری بات کی.... تھپا تھپ تھپ ویٹر کی آنکھیں.... جو یوں بھی بہت مہین تھیں اب نیند کی وجہ بالکل ہی ہموار لکیر ہو رہی تھیں....

کیسینو میں ہمارے سوا بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے.... کیسینو کی رولٹ ٹیبلز، ٹمپشیں، کرسیاں اور سٹول ننگے ہو چکے تھے، دکھائی دیتے تھے.... آغاز شب میں بکے ہجوم میں وہ پوشیدہ تھے....

کیسینو سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

میراجی چاہا کہ کم از کم ریکارڈ کی شکستگی کے لئے.... میں کسی ایک سلاٹ مشین

کے دید لحاظ کی وجہ سے رپیشن اینڈ کرنا پڑا.... لیکن ہم کل ہر صورت.... بلکہ تمنا ہے رہے ہیں تو آج ہر حالت میں پانچ بجے بیدار ہوں گے اور....“

”دو گھنٹے سوئیں گے تارڑ صاحب۔“ سرگوشی کی نیند بھری بیزاری عروج پر تھی....

”بے شک آج نہ بھی سوئیں تو کیا فرق پڑتا ہے گمشدہ.... آج نیپال ٹکری میں ہمارا آخری دن ہے اور آخری چانس ہے ایورسٹ پر طلوع آفتاب کو دیکھنے کا.... تو ہم پانچ بجے روانہ ہوں گے.... عین وقت پر ہنگر کوٹ پہنچیں گے بلکہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ پہنچیں گے.... اُس طلسم ہوش ربا کا نظارہ کریں گے، پھر اطمینان سے بریک فاسٹ کریں گے.... ہنگر کوٹ کے گاؤں میں ایک مختصر سی واک کریں گے.... جلدی سے لہج کر کے واپس ہو ٹل سولتی میں.... سامان کیٹیں گے اور ساڑھے چار بجے کی بس پر سوار ہو جائیں گے کراچی کے لئے....“

”شاہ جی.... بس پر کراچی جائیں گے؟“ سُہری بابا کی داڑھی میں بھی نیند کا خمار تھا وہ چونک کر بولے....

”میری مراد ایئر بس سے ہے.... تو بس یہی پروگرام ہے.... کیا ہے؟“

”اعلیٰ ہے۔“ فاروق نے انگوٹھا اٹھا کر داد دی....

”تو پھر فجر کی نماز کے بعد چلیں گے....“ ہمیشہ بھی خوش ہو گئیں کیونکہ پورے کراؤڈ میں صرف وہی تھیں جن میں ایڈوچر کی سپرٹ کے جڑوے تھے....

گمشدہ نہیں بولیں ”کیوں گمشدہ آپ نہیں بولیں....“

”اس میں تھوڑا بہت رد و بدل ہے تارڑ صاحب۔“ گمشدہ بولیں ”ہم آپ کے ساتھ ہنگر کوٹ نہیں جا سکیں گے۔“

”ہم کون؟“

”ہم.... یعنی.... میں!“

”کیوں؟“

”میں تو دل و جان سے ہنگر کوٹ جانا چاہتی تھی لیکن ابھی ابھی ایک نیپالی خاتون سے دوستی ہوئی ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے پتن کے قریب اُس فیلٹری میں

لیکن میں ناکام رہا تھا....
ایورسٹ کا میں کیمپ تو کیا میں نگر کوٹ تک نہیں جاسکا تھا۔
اور آج ساڑھے چار بجے میں پی آئی اسے کی ایئر بس میں سوار ہو کر اپنے قیدی
ہمیں لوٹ رہا تھا.... ایک آئین ڈانسوچ کی مانند....

میں اُس زائر کی طرح تھا.... جو دمشق تو جاتا ہے لیکن قبرستان باب الصغیر میں
بلال حبشی کے مزار تک نہیں پہنچ پاتا۔ ایران جاتا ہے تو فردوسی، حافظ، سعدی اور
کی قوت میں نہیں پہنچتا.... فلانس میں کلیسا ڈومو میں مائیکل انجلو کے مدفن پر
بدھ فرشتوں کو نہیں دیکھ پاتا۔ پیرس جاتا ہے تو مونالیزا کے لبوں کے خم اور خم کو
دیکھتا....

استنبول پہنچ کر یا شرمکال سے ملاقات نہیں کرتا....

گجرات جاتا ہے تو چناب کو نہیں دیکھتا....

ایتھنز میں شب کرتا ہے تو اگلی سویر اکروپس میں حاضری نہیں دیتا۔

کوسٹہ میں سرینا ہوٹل میں پڑا رہتا ہے اور حنا جمیل کا رخ نہیں کرتا۔

نہ کوپن ہیگن میں رٹل میرمیڈ سے ملاقات کرتا ہے اور نہ لاہور پہنچ کر فاسٹنگ
کی زیارت کرتا ہے۔

تو یہ کیسا زائر ہے جو نیپال آتا ہے اور ایورسٹ کو نہیں دیکھ پاتا۔

یہ زائر نہیں.... ایک دنیا دار شخص ہے۔ جو چند روزہ آسائشوں کے لالچ میں....
ارامہ قیام اور بین الاقوامی حکام کی خواہش میں ادھر آیا تھا اور اب آج پچھلے پہر
لے چار بجے خالی ہاتھ لوٹ رہا تھا۔

نہ اُس نے.... کپل دستو کی یا ترا کی اور نہ وہ کشور ہندوستان کی فصیل ہمالیہ
ایورسٹ اور اناپورنا تک گیا تو پھر وہ کیا نیپال گیا.... ایک سفر رائیگاں میں گیا....

میری سنو جیکٹ، جو گرز اور اونی موزے اُن ہواؤں میں ایک سانس بھی نہ
جن کی آس پیاس میں اُنہوں نے یہاں تک کا سفر کیا تھا....

میں کیسا زائر تھا....

قمار، خمار اور کماریوں میں ہی اپنے روز و شب بسر کر دیئے....

سے خوار اٹھتے جاتے تھے.... چنانچہ ہم بھی اٹھ گئے۔

میں ایک سکہ ڈال کر ہینڈل گھما دوں تاکہ میں آئندہ یہ تو دعویٰ کر سکوں کہ جناب میں تو
جواری ہوں.... جو اٹھیل چکا ہوں.... لیکن میں ایسا نہ کر سکا کہ میں بچھ چکا تھا.... میں جو کچھ
جیتنا چاہتا تھا.... وہ نہ جیت سکا اور جو کچھ ہارنا چاہتا تھا وہ میرے پاس موجود تھا۔

سروانے کا کردار ڈان کیجوتے مجھ سے کہیں بڑھ کر خوش بخت اور جری تھا۔
کہ جس نے اپنا قدیم صندوق ایک تہہ خانے میں سے جھاڑ پونچھ کر نکالا اور اُس میں
محفوظ ایک پرانی زرہ بکتر پہنی اور اپنے خادم سانچو کے ہمراہ مرل گھوڑے روزی ٹانے پر
سوار ہو کر آفتوں، بلاؤں اور پن چکیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا
تھا....

میں اگرچہ ڈان کیجوتے کا معنوی شاگرد تھا لیکن.... میری آشفٹہ سری عمر کے
بھاری پتھر کے بوجھ سے آہستہ سانس لیتی تھی.... ڈان کیجوتے کے ملک ہسپانیہ میں
ایک اجنبی تھا.... جو سان سباستیان کی گرم شاموں میں تھا.... بل فاسٹنگ کے اکھاڑوں پر
تھا.... ٹوریا کی شب میں کسی چشم غزال کی دل نشینی کا مرکز تھا.... ”کبلا روخو“ یعنی سر
گھوڑے کے قرطبی ریسٹوران میں شاگنریا کی سرخ صراحی سامنے رکھے ناٹلا سجد کے
لبنائی ہونٹوں کی کاٹ کو اپنے بدن پر محسوس کرتا تھا.... اُس کے.... اور میرے درمیان
تقریباً تیس برس حائل تھے.... میں اب سہارالے کر چلتا تھا.... مجھے نگر کوٹ جانے کے
سہاروں کی ضرورت تھی.... جیسے میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر ایسے ہیں کہ کمر سے
اُن کا پورا دھڑ مفلوج ہو چکا ہے.... لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے.... جہاں جاتے ہیں وہاں
ایک نظر میں دیکھ لیتے ہیں کہ اس راہداری میں وہ کون کون سے مقام ہیں جن کو تمام
میں اپنے آپ کو دھکیل کر آگے لے جاؤں گا.... ہر پندرہ بیس قدموں کے بعد اگر وہ کو
شے کو تمام کر.... سہارالے کر اپنے آپ کو آگے نہ دھکیلیں تو وہ گر جائیں....

تو میں بھی اُنہی کی طرح اس عمر میں سہاروں کی تلاش میں ہوتا ہوں....

اور یہ سہارے ایک ایک کر کے نیپالی پوشینے کی فیکٹری کی جانب جا رہے تھے....
میں نے بھی اپنے ”ہسپانوی“ گے سوٹ کیس میں ڈان کیجوتے کی طرح کو
نوردی کے سب سامان اسی نیت کے ساتھ پیک کئے تھے کہ میں اپنے کسی نہ کسی ساتھی کو
بیوقوف بنا کر.... ایک سہارا بنا کر ایورسٹ کے بیس کیمپ تک لے جاؤں گا۔

ہرے لئے سربستہ رازوں کا کوئی ایک آخری گھر نہیں...
میں کس گھر کو آخری گھر قرار دوں؟..

میں کسی ایک گھر کا حوالہ دے کر باقی گھروں سے بے وفائی نہیں کر سکتا....

نہ بشام سے، نہ فیڑی میڈو سے.... واڈی روپل اور ترشنگ سے بھی نہیں....
ردس کی گھاس سے بھی نہیں.... پائیو کی شام سے بھی نہیں.... اشکو لے سے کیسے
بے وفائی کروں.... واڈی سوختر آباد کے سنوٹائیگر مجھے زرد نظروں سے دیکھیں گے.... جھیل
زومبر کے پانی مجھ سے خفا ہوں گے.... سنولیک پر رواں بادبانی کشتیاں مجھ سے شکایت
ریں گی... جرجی لاء کی ٹاپ سے جو عظیم ترین پہاڑی منظر دکھائی دیتا ہے.... اور جو صرف
مانے دیکھا ہے میرے سوا بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے.... تو یہ وہ گھر ہیں جن کے
واڈوں پر.... جب میں مزید بوڑھا اور لاچار ہو جاؤں گا تو دستک دوں گا....

تو ان گھروں میں ایک اور گھر.... بھگتا پور کا بھی سہی....

میں اور سُہری بابا ایک ٹیکسی میں سوار سربستہ رازوں کے آخری شہر بھگتا پور جا
ہے تھے.... ہم جا تو نگر کوٹ رہے تھے، ایورسٹ کے دودھیا درشن کے دوار پر.... لیکن
لیٹھینے نے ایورسٹ کو ناک آؤٹ کر دیا تھا.... سرگوشی نے بیک آؤٹ کیا تو ہمیشہ بھی
رہ ہو گئیں کہ یہ گم ہو گئی تو کون اسے تلاش کرے گا۔

ملک صاحب کانفرنس کی اختتامی رپورٹ تیار کر رہے تھے اس لئے حسب معمول
اساتھ نہ دے سکتے تھے۔

اور فاروق.... لاپتہ ہو گیا تھا.... ہر شخص کے اپنے اپنے راز ہوتے ہیں..

تو اب ہم دونوں تھے.... میں اور سُہری بابا....

”سُہری بابا.... کہاں جائے گا؟“ میں نے کھٹنڈو کے آخری ناشتے کے آخری لقمے

اختتام پر اُن سے بھد ادب پوچھا۔

بابر.... ہوٹل سولتی کے ڈائننگ روم کے باہر لان میں وہی فوارہ اُبل رہا تھا جو

نلڈو کی ہر صبح اُبلتا تھا.... پچھلی شب کی ناکامیوں کو یاد کر کے اُبلتا تھا اور ذرا زور لگا کر اُبل

بوریج کی پہلی کرنوں کے ساتھ بوسہ بازی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

”کہاں جائے گا؟“

”بگلا بھگت اور پچھلی سیرٹھی اور واڈی کھٹنڈو“

”سربستہ رازوں کا آخری گھر....“ کتاب کا نام ہے۔

نیپال کے بارے میں ہے۔

مصنف کا نام ای۔ اے۔ پاول ہے.... ۱۹۲۹ء میں شائع ہوتی ہے۔ آج سے تقریباً
ستر برس پیشتر.... اور پاول کتا ہے ”اگر نیپال میں اور کچھ بھی نہ ہوتا.... سوائے بھگتا
کے.... اور اُس کے دربار چوک کے.... تب بھی آدمی دنیا کی مسافت کے بعد وہاں پہنچ
جائز ٹھہرتا۔“

ہر مہم جو مصنف کی سٹی کسی ایک مقام، کسی ایک شہر یا چوٹی یا قصبے پر اگی ہوتا
ہے اور وہ یہی بیان دیتا ہے کہ نصف دنیا کا سفر اگر کیا اور اس مقام کے لئے کیا تو کیا
کیا....

کوئی ہنزہ میں قیام کرتا ہے، کوئی سات برس ثابت میں گزارتا ہے.... کوئی تبت
کو خدا مانتا ہے.... کوئی شاہ گوری کی پرستش کو ایمان جانتا ہے.... اور کوئی ریڈیو کٹنگ
واڈی کالا ش میں ایک ایسے شخص کو روانہ کرتا ہے جو بادشاہ ہو سکتا تھا لیکن اس کے پاس
لاہور واپس لوٹتا ہے اور زمزمہ کی توپ پر براجمان ہو کر اپنے آپ کو ”کم“ کا نام دے کر
عجائب گھر پر نظر رکھتا ہے....

ہر ایک کے لئے ”سربستہ رازوں کا آخری گھر“ الگ الگ ہوتا ہے۔

میں اگرچہ ایک اتفاقاً مہم جو ہوں، اتفاقاً مصنف ہوں لیکن اس کے بارے میں

وہ بتاتا کہ کتنا پیسہ....

”آئی سی میں کتنا؟“

وہ یہ بھی بتا دیتا.... ہم حساب کرتے تو وہ کرایہ ہمارے حساب کتاب سے بلند ہو کر بلا ہی بالا پرواز کر جاتا....

.... کہ ہمارا حساب اُس رقم میں قید تھا جو ملک نے جوئے کی میز پر جیتی تھی.... اگرچہ اُس نے یہ رقم دان کر دی تھی کہ آپ لوگ جی بھر کے اس حرام کی کمائی سے جو اٹھائیں.... لیکن ہم شرفا میں سے تھے اسے بچائے رکھا کہ اس غیر قانونی آمدنی سے نگر کوٹ کی زیارت کریں گے اور ایورسٹ دیکھیں گے.... نگر کوٹ چھیننے سے مار کھا گیا تو ہم نے اسے بھگتا پور کے لئے وقف کر دیا۔

ایک اور ٹیکسی تھی تو میں نے جنگ و جدل پر آمادہ ایک شمشیر بہ کف سپاہی کی طرح اُس کی جانب بڑھتے ہوئے سُہری بابا کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں پرے دھکیا اور ٹیکسی ڈرائیور نہ صرف موم ہو گیا بلکہ مجھے ایک اوتار جان کر درشتی نظروں سے دیکھنے لگا ”کیسا جانتا ہے کہ میرا نام تھا ہے۔“

”ہم بھگت لوگ ہیں آپ کا شکل دیکھا تو جان گیا کہ یہ تو اپنا تھا ہے۔“ اور حقیقت اس بھگتی کی وہی تھی جو میں بیان کر چکا ہوں کہ جیسے آپ اسی ہنرہ میں ہر دوسرے شخص کو ”بیگ صاحب کیا حال چال ہے“ کہہ سکتے ہیں اور وہ اپنا شخص بیگ ہی ہو گا.... اسی طرح نیپال میں ہر جانب ہر سائز کے تھاپاز پائے جاتے ہیں.... ”تو تھاپا بھائی.... ہم بھگت لوگ ذرا یا ترا کے لئے بھگتا پور جائے گا.... صرف جائے گا“

لئے گا نہیں.. تو کتنا کرایہ ہو گا۔“

”پانچ سو نیپالی۔“

”بھگت لوگوں کے لئے کم نہیں ہو گا؟“

”نیپال میں عام لوگ کم ہوتا ہے اور بھگت لوگ زیادہ ہوتا ہے.... ادھر دیوتا بھی

نہ ہے تو اُن کا بھگت بھی بہت ہے.. تو کیا کرے....“

”یار ہم غیر ملکی بھگت ہیں۔“

”بھگتا پور جائے گا۔“

”وہ کیا ہے اور کہاں ہے؟“

”وہ بھگت لوگوں کا.... ساہو سنت لوگوں کا شہر ہے.... پیروں فقیروں کا شہر ہے....“

”آئی سی میں کتنا ہو گا؟“

”پتہ نہیں.... یہ تو اُس ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھیں گے جو ہمیں وہاں لے جائے گا۔“

ہم دونوں شاید پہلی بار اس قیام نیپال کے دوران ہولٹل سے نکلے تو ہمارے نکلنے سے پہلے ہی ہمیں یاد آیا کہ ہمیں اس پاس تھی نہ ہمیشہ.... ذرا جھانک لیتے ہیں.... ہمارے ہم سفر تھری نے ملک تھا اور نہ فاروق۔

یہ عجیب شش جت گروپ تھا جس کے سارے کے سارے آئینے الگ الگ تھے.... اور ہر آئینے کا اپنا مزاج اور اپنی کیفیت تھی لیکن اس کے باوجود کوئی اپنے مزاج اور اپنی کیفیت کو دوسروں پر ٹھونکتا نہ تھا۔ بلکہ ہم مزاج و ہم کیفیت ہو جاتا تھا.... ان آئینوں میں صرف دوستی اور مفاہمت کی شکل نظر آتی تھی.... چنانچہ میں اور سُہری بابا قابل فہم طور پر قدرے اداس اور تنہا تھے.... جیسے چھ سُروں والے کسی ہندو دیوتا کے چار سر الگ ہو جائیں تو وہ صرف دو سُروں کے ساتھ اپنے سنگھاسن پر براجمان قدرے اداس اور تنہا ہوتا ہے۔

ہوٹل سولتی سے نکل کر ہم نے متعدد ٹیکسی ڈرائیوروں سے اُس گھونگھاٹل کے شہر باضی بھگتا پور تک کے اٹھارہ کلومیٹر فاصلے کے لئے مذاکرات کئے.... بلکہ صرف سُہری بابا نے کئے۔

سُہری بابا کسی بھی ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کرتے بلکہ حکم دیتے جیسے وہ اُن کے کسی ڈرائے میں بکنگ کا بیٹھو کابلی ویشن شیشن کی راہداریوں میں گھومتا سال ٹائم ایکٹر ہو۔

”بھگتا پور چلو....“

ایک دو نے تو کہا ”نہیں چلا۔“

اور پھر ایک نے کہا ”چلو....“

”کتنا پیسہ؟“

ڈسٹ لوگ کی مجبوری سے فی الفور فائدہ اٹھانے کی رٹی بھر کوشش نہ کرتی تھی.... کرایہ
بل نہیں کرتی تھی.... ان کفار کے طور طریقے ہماری سمجھ سے باہر تھے....
نیکسی.... تھپاکی.... مجھے اور سُہری بابا کو لے کر بھگتا پور کے لئے روانہ ہو گئی۔

وہ حضرت محل کی قبر کی قربت میں سے ہو کر گزری.... قبر دکھائی نہ دی صرف وہ
برو کا درخت دکھائی دیا جو دن کی روشنی میں بھی پُر مال تھا۔ ہلکی ہوا کے ساتھ ذرا خم کھا
رہتا تھا اور شاید میری طرف جھکتا تھا....

اُس کے سامنے دیوی کا استھان تالاب کے گدے پانیوں میں سویر کی اولین
وہ میں روشن ہو رہا تھا۔ اور مجھے پھر ہوٹل سولتی کے ڈائننگ روم کے باہر جو نوارہ
پہن ہو کر اُبلتا تھا.... وہ یاد آیا.... کہ وہ اس سے سُہری کرنوں میں رنگا جا چکا ہو گا اور
بپتے بدن کی طرح اُس کا ایک ایک رُوں.... پانی کا ایک ایک قطرہ اُس دھوپ میں
لٹک دکھائی دے رہا ہو گا....

میں نے جان بوجھ کر اپنے دوست درختوں کا ذکر نہیں کیا.... وہ جان چکے تھے کہ
کھٹنڈو میں میرا آخری دن ہے.... اُن کے شگوفوں کے الاؤ خوش تھے کہ میں قید سے
ل کر بالآخر اس شہر کی زنجیروں سے پرے کہیں اور جاتا ہوں.... کہ وہ یہی چاہتے تھے....
میں نے کل شام.... اتنے دنوں بعد ذرا فراغت پا کر اُس کارڈ کو بہ نظر غور دیکھا
اُس پر پتلے بانس کی چکیلی سیڑھی.... سری جانا شرما کا نام لکھا تھا.... کانفرنس کی قید میں تیس
نول چکا تھا کہ کبھی کراچی ایئر پورٹ پر ایئر بس میں داخل ہونے والے مسافروں کی طویل
ٹار میں وہ بھی تھی جس کے بیگ میں ایئیں بھری ہوئی تھیں اور اُس نے کارڈ دے کر
لما تھا کہ کھٹنڈو پہنچتے ہی مجھے فون کرنا.... تمہیں اپنا شہر دکھاؤں گی۔“
میں نے فون کیا....

”ہو آ رہو؟“ اُدھر سے ایک احتیاط پسند آواز آئی اور اس کے پس منظر میں ایسے
تھے اور ہلکی سرگوشیاں تھیں جو ایک کامیاب پارٹی کی دلیل ہوتی ہیں۔

میں نے اپنا نام بتایا اور مجھے عادت تھی کہ جب میں اپنا نام بتاؤں تو دوسری
اہب سے بدترین حالت میں بھی ”اوہو آپ ہیں....“ سنوں.... تو میں بے حد دل شکستہ ہوا
نب اُس نے کہا ”کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟“

”کیا کرے۔“

”یار ہم بگلا بھگت ہے کچھ تو کم کرو۔“

”یہ والا بھگت تو ہم نہیں جانتا.... چلو ساڑھے چار سو روپے دے گا۔“
”دے گا۔“

نیکسی میں بیٹھے ہوئے میں نے تھپا برادر سے یونہی پوچھا ”اگر ہم بھگتا پور سے
واپس بھی تمہارے ساتھ آئیں تو پھر کتنا پیسہ ہو گا؟“
”اُدھر کتنا تا تم ٹھہرے گا؟“

”اُدھر زیادہ تا تم نہیں لگائے گا.... اپنے بھائی بندوں سے ملے گا۔ درشن کرے؟
ماتھائی کے گا اور واپس آجائے گا۔“

”کس کو ماتھائی کے گا؟“ تھپانے اس کے بعد کوئی درجن بھر نہایت مشکل تاہوں
والے دیوی دیوتاؤں کے نام گنوائے اور وہ لوگ جو میرے نام کو مشکل سمجھتے ہیں اُر
اُنہیں ان نیپالی دیوی دیوتاؤں کے نام سنائے جائیں تو وہ غش کھا جائیں اور میرے نام کو
ہست ہی سہل جائیں۔

”ان سب کو ماتھائی کے گا....“

وہ ذرا ناراض ہو گیا اور کوئی ایک نام لے کر بولا ”اُس کو بھی ماتھائی کے گا.... وہ
کوئی اچھا دیوتا نہیں ہے۔“

میں جان گیا کہ یہاں بھی کوئی شیعہ سنی کا مسئلہ ہے۔ ”نہیں نہیں اُس کے
پاس بھی نہیں جائے گا تم بتاؤ کتنا پیسہ۔“

”چلو ساڑھے چار سو روپے.... یہ نہیں دیتا تو ہم جاتا ہے“

”یہ جانے جانے کا ہے؟“

”نہیں جانے آنے کا ہے۔“

”لیکن تھپا برادر ابھی ابھی تو آپ اتنی ہی رقم میں جانے جانے کا بتایا تھا۔“
”یہ بھی بولا تھا کہ وہاں سے آپ کو چھوڑ کر خالی واپس آئے گا.... خالی آئے گا؟“

آپ کو بھی بھڑا کر لے آئے گا تو کرایہ وہی ہو گا۔“

عجیب نامعقول قوم تھی کہ جانے جانے کا بھی وہی اور آنے جانے کا بھی دن

”کراچی ایئر پورٹ پر۔ ایئر بس میں سوار ہوئے تھے.... آپ کے بیگ میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں اور میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی کی کڑیوں کے الگ الگ ہو جانے کا خطرہ مول لیتے ہوئے وہ بیگ اٹھایا تھا.... یاد ہے؟“

”اوہو....“ اُس کی یادداشت فوراً لوٹ آئی ”تو یہ آپ ہیں.... آپ کہاں ہیں؟“

”ہوٹل سولٹی ان.... کمرہ نمبر پانچ سو پچاس۔“

”میرے پاس ابھی کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں، لیکن میں ابھی آتی ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر.... کیا آپ میرا انتظار کریں گے....“

”آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟“

”ہم دربار مرگ کے کسی ہوٹل میں کھانا کھا سکتے ہیں.... کسی بار میں بیٹھ کر ڈرافٹ بیڑی سکتے ہیں اور نیپالی سمو سے کھا سکتے ہیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں.... میں ابھی توڑی دیر میں آتی ہوں۔“

”ابھی تو نہیں۔“ میں ذرا جھجک گیا.... کیونکہ میں نے ایک سوشل کال کی تھی اور مجھے قطعی طور پر امید نہیں تھی کہ ادھر سے کوئی آفر آجائے گی ”ابھی ہم لوگ ذرا کیسینو تک جا رہے ہیں۔ اور کل صبح نگر کوٹ جا رہے ہیں تو....“

”نگر کوٹ۔ ادھر تو آپ نے جانا ہے تو آج شام ہی چلے جائے۔ وہاں جتنے بھی ہوٹل ہیں اُن سب کی کھڑکیاں ایورسٹ اور اناپورنا پر کھلتی ہیں.... صبح سویرے اُن کی برفوں کو دھیرے دھیرے روشن ہوتے دیکھئے.... اُن کے سامنے ناشتہ کیجئے اور واپس کھنڈو

آجائیے۔ صبح جانے کا کوئی فائدہ نہیں....“ اور اُس لمحے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم نگر کوٹ نہیں جائیں گے.... اور ایورسٹ کی بلندی ایک پشیمینی کی چادر سی بھی کم ہو جائے گی....

”بس اسی قسم کا پروگرام ہے.... تو....“

”تو پلیز آئندہ کسی بھی دن آپ مجھے ٹیلی فون کر لیں میں آپ کے ہمراہ چلوں گی

اور آپ کو اپنا شہر دکھاؤں گی.... ویسے آپ کو کورین فوڈ پسند ہے؟“

”نارتھ کورین یا ساؤتھ کورین....؟“ میں نے کہا ”لیکن آپ کیوں پوچھ رہی

ہیں؟“

”اس لئے کہ کھنڈو کی میر کے بعد میں جانتی ہوں کہ شہر میں بہترین خوراک ایک نہایت لاجواب کورین ریسٹوران میں ملتی ہے.... ہم وہاں کھانا کھائیں گے“

”اوکے“

”تو پھر میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی.... صرف یہ ہے کہ چار بجے تک میں اپنے آفس میں مصروف رہتی ہوں اور اُس کے بعد آپ مجھے فون کر لیجئے گا۔ کریں گے؟“

”بالکل۔“

اور میں اُس چمکیلی سیڑھی خاتون کو یہ نہ بتا سکا کہ میں نہیں کروں گا.... کیونکہ میں اگلی دوپہر ساڑھے چار بجے اُس کے شہر کو چھوڑ رہا تھا۔

”بالکل“ میں نے پھر کہا ”میں دوبارہ فون کروں گا۔“

”اور اُس بیگ میں اینٹیں نہیں، کتابیں تھیں۔ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا۔“

اُس کی مترنم جل ترنگ آواز آئی.... اور کھنڈو کی شب میں ایک فون پر ایک مترنم آواز کو سنتے ہوئے مجھے ”کاما سوترا“ کے مصنف کا ایک اور قول یاد آیا کہ جہاں ایک خاتون کے لئے کچھ بدنی اور کچھ حیاتی شرائط ہیں وہاں اُس خاتون کو مردوں کا دل بھانے کے لئے پانی سے بھرے متعدد پیالوں کو ایک چھڑی سے چھیڑتے ہوئے دل پذیر موسیقی تخلیق کرنے کا ہنر بھی آنا چاہئے.... جسے ہم ان دنوں جل ترنگ کا نام دیتے ہیں.... تو اُس بانس کی یڑھی کی آواز میں کاما سوترا کے جل ترنگ پیالے بجتے تھے۔

میں اور سُہری بابا قیام کھنڈو کے دوران پہلی بار اس شہر کی قید سے آزاد ہوئے....

شہر پیچھے رہ گیا لیکن آبادی ختم نہ ہوئی۔

جدید نلیٹ، پُرانے گھر.... کچے برتنوں کے شوروم.... آسمان وسیع ہو گیا.... اور حیرت انگیز طور پر ان ماڈرن فلیٹوں کو جاتے ہوئے راستے کچے تھے اور اُن کے آس پاس کھیت تھے جن میں موسمی سبزیوں کی بیلیں اور فصلیں تھیں اور جہاں کچھ نہ تھا وہاں گھاس تھی۔ اسی شاہراہ پر جس پر تھاپا کی ٹیکسی دوڑتی تھی اس کی دائیں جانب سڑک کی عین اوپر الیکٹرک کیبلز کا ایک سلسلہ تھا جس کے ساتھ جڑی ہوئی کوئی بس ایک ہموار رفتار سے کٹاف سمت میں چلی جاتی تھی۔

ہاتھ غیر میں موم بتیاں جلاتے دیکھا تو انسانی بدن کی یکسر یکسانیت سے آگاہ ہوا اور بیزار ہوا۔ اُس کا بھید اور شہوت صرف پردے اور لباس میں پنہاں تھی۔ تو میں دیکھ چکا ہوں۔ مجھے ترغیب نہ دیجئے۔۔۔“

”یہ تو عمر کا تقاضا ہے۔“ سُہری بابا نے ایک سُہری بچھو کی طرح سُہری ڈنگ مارا۔
 ”شاید ایسا ہی ہے۔۔۔ لیکن مجھے اب بھی ونیس ڈی میلو یا ڈیوڈ کے بدنی تناسب اہمیت کرتے ہیں۔۔۔ تو یہ ونیس اور ڈیوڈ اس دنیا میں کتنے ہوں گے اور کہاں سے لائیں گے۔۔۔ میرے لئے اب ونیس جھیل کرومہر کے پانی ہیں اور اُن میں اُترتی بیڑھیاں ہیں اور ڈیوڈ کی پرفیکشن مجھے کے ٹو میں نظر آتی ہے۔۔۔ اسے آپ عمر کا تقاضا کہہ لیجئے۔“

تھپا نیکی ڈرا سیر بہت زیادہ تھپا تھا یعنی بہت زیادہ سیر نہیں تھا اور مسافر حضرات کے ساتھ خوشگوار گپ شپ پر بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔۔۔ اس لئے ہم اطمینان سے خاموشی سے آس پاس کی لینڈ سکیپ پر نظر رکھتے ہوئے جا رہے تھے۔

بائیں جانب وادی کھنڈو میں پھیلی آبادیوں اور سرسبز ٹیلوں کے اوپر اُس آسمان کے بیچ جو دُھند سے خالی کبھی کبھی ہوتا تھا دو آنکھیں معلق تھیں اور ہماری اُس نیکی کو گھورتی تھیں جو ہمیں بھگتا پور لے جا رہی تھی۔۔۔ یہ سیاہ کھلی آنکھیں ایک ایسے ایئر بیلون پر پینٹ کی گئی تھیں جو وادی کے آسمان کے درمیان جا کر جیسے ٹھہر گیا تھا۔۔۔ نیپال کی پکوان۔۔۔ سنو پاکی دو آنکھیں جو اگرچہ انسانی ہاتھوں نے بنائی تھیں لیکن اُن میں ایک عجیب معرکش تھی کہ انسان اُن آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔۔۔

یہی دو آنکھیں وادی کھنڈو پر معلق ایئر بیلون پر کھلی تھیں۔

میں نے ایک ٹورسٹ میگزین میں اس کمرشل بیلون رائڈ کا اشتہار پڑھا تھا۔۔۔
 ”آئیے اور وادی کھنڈو کے اوپر ایک بیلون میں سوار ہو کر دنیا کے عظیم ترین نظاروں کی نہت میں ہو جائیے۔ اگر دُھند نہ ہوئی تو آپ کو ایورسٹ اور اناپورنا ایسے دکھائی دیں گے کہ آپ ہاتھ بڑھا کر اُنہیں چھو سکتے ہیں۔۔۔ بلکہ ان کی برفوں سے ایک مٹھی بھر کر اپنے ٹیمپین کی بوتل کی بالٹی میں ڈال سکتے ہیں۔۔۔ آپ دُھند ہونے کی صورت میں وادی کھنڈو پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ ڈیزہ گھنٹے کی اس بیلون فلائٹ کا کرایہ صرف دو سو ڈالر ہے۔۔۔ چانس کی نشست کے لئے صرف ڈیزہ سو ڈالر۔۔۔“

بس شاپوں پر لوگ کھڑے تھے۔۔۔ کھنڈو شہر میں روزی کمانے والے اُدھر جا رہے تھے جدھر سے ہم آ رہے تھے۔۔۔

بائیں ہاتھ پر جب عمارتیں کم ہوئیں اور وادی کھنڈو کی ہریالی وسیع ہوئی تو اُس میں ایک دریا پھیلنے لگا جس کے کناروں پر بے شمار خواتین یا تو گھریلو کپڑے بیچ کر دھرتی تھیں یا اُس میں اپنے آپ کو دھوتی اور اشان کرتی تھیں۔۔۔ اور ایسے کرتی تھیں کہ کھنڈو ایئر پورٹ پر متعین زنانہ پولیس کے براڈ ہنس کی مانند اُن کے براڈ ہنس بھیگتی ساڑھیوں میں بدن سے چپکتے نمایاں ہوتے تھے یا اُن کی ناف سے اوپر جو حصے تھے اُنہیں وہ تازہ ہوا اور دُھوپ سے آشنائی کی خاطر کھلا چھوڑتی تھیں۔۔۔

اور سوائے ہمارے اُنہیں کوئی نہیں دیکھتا تھا۔۔۔ کیونکہ ہم ایک پاک سرزمین سے آئے تھے۔۔۔ اُنہیں جی بھر کے دیکھتے تھے اور لاجول پڑھ کر اپنے اس گناہ کی تلافی کر دیتے تھے۔

”تارڑ صاحب آپ نے دیکھا؟“ سُہری بابا نے اپنی مومن داڑھی پر ہاتھ پھر کر کہا اور ایسے کہا کہ نظر دریا کنارے نیم برہنہ نیپالی خواتین کے بالائی حصوں سے ہرگز جدا نہ ہو۔۔۔

”سُہری بابا۔۔۔ میں نے آج سے تقریباً پستیس یا شاید اڑتیس برس پیشتر فرانس کے ایک ساحلی جزیرے ”آکل ڈی لیواں“ میں اتفاقاً قدم رنجہ فرمایا تھا اور اُن زمانوں میں ابھی ٹاپ لیس یا نیوڈ ساحلوں کا رواج نہیں ہوا تھا بلکہ آج کی نسبت تو نہایت پارہ اور پرہیزگار زمانے تھے تو اُس جزیرے میں داخلے کی شرط صرف یہ تھی کہ جو بھی آئے صرف برہنہ پا ہی نہیں برہنہ بدن بھی آئے اور اگر وہ ازحد شرمیلا ہے تو زیادہ سے زیادہ چالبلی شو مو پیلوان کی برائے نام سی لنگوٹی پہن کر آئے۔ اور یہ لنگوٹیاں وہاں لنگر انداز ہوتے ہی خریدی جاسکتی تھیں، تو اُس جزیرے میں میں انسانی بدن کی اکتا دینے والی یکسانیت سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ اول اول تو خون کی گردش تیز کرتا اور بے قابو کرتا ہے اور پھر مسلسل دیکھنے سے اُس کی عادت ہو جاتی ہے اور وہ آپ کو بالکل ٹھنڈا کر دیتا ہے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ مظاہر قدرت کے مقابلے میں۔۔۔ بھدا اور بے سُرا لگنے لگتا ہے۔ میں نے وہاں ایک پنڈ پپ سے پانی بھرتی خواتین کے ڈھیلے اور اُلجھتے ہوئے بدن کو دیکھا۔ مقامی چرچ میں انا

”دریائے ہنومانتے اور شائد... ایورسٹ کی برقیں“

”بھگتا پور... اس جانب“ کا بورڈ نظر آیا اور ہم اُس جانب مڑ گئے۔

دائیں جانب جو کھیت تھے اُن میں ہرا دل تو تھی لیکن واڈی مانسرہ کے دھان کے کھیتوں ایسی بھیکتی ہوئی گیلے سبز پینٹ والی تازگی نہ تھی...

اور سرسوں بھی تھی... لیکن اُس میں بھی وہ شوخی وہ دمک نہ تھی جو مئی جون کی گرمیوں میں ہمارے الماس کے پتھوں میں سے ایک ایسی پھوار کی صورت اُترتی ہے کہ ہوائیں اور چہرے اُس زرد پھوار سے زرد ہو جاتے ہیں... یہ کچھ بجھی بجھی سی برسوں تھی... اگرچہ ادھر بھی بسنت کا توار منایا جاتا تھا... لیکن یہ سرسوں کچھ زیادہ بسنتی نہ تھی۔

ہم سے نیچے بائیں جانب دریائے ہنومانتے تھا جو واڈی کے کھیتوں میں ایک اُدھیڑ لڑاڑھے کی مانند سُستی سے لیٹا ہوا تھا اور اُس کے اُوپر واڈی کی جو ہری اور کم بلند یوں والی اُونچائیاں تھیں اُن کے اُوپر کچھ برفوں نے جھانکا... اُنہوں نے بھی شاید ہمیشہ کا تکیہ قائم نہ لیا تھا کہ ذرا جھانکنے میں کیا حرج ہے... برف پوش ہمالیہ کی سفید زنجیر جھانکنے لگی لیکن اُس کے جھانکنے میں حرج تھا کیونکہ اُس نے جہاں میرا دل روک لیا تھا وہاں مجھے اُزدہ بھی کیا تھا...

میں نیپال میں آمد کے بعد پہلی بار ”پہاڑ“ دیکھ رہا تھا... یہ میری ملکیت تھی اور مگر آج سہ پہراں تک اپنا حق جتانے کے بغیر ساڑھے چار بجے کی ایئر بس میں اِن سے جدا

میرے جیسے بندے کی جیب میں اگر دو سو ڈالر فالٹو ہوں تو وہ خود طائر ہو سکتا ہے۔ اُسے کسی بیلون کی ضرورت پیش نہیں آئے گی...

ہم بہت مرتبہ طائر ہو چکے تھے...

منطق الطیر کے ایک طائر ہو چکے تھے... ایک پکھیر کی صورت میں...

واڈی سوختر آباد پر پرواز کر چکے تھے...

کے ٹوکے گرد ایک چمچریلی کاپڑ میں سوار اُس کی چوٹی کا طواف کر چکے تھے۔

اور اس کے باوجود ہمارے پر نہیں جلے تھے...

اگرچہ ہم ایک معصوم پرندے کی بجائے اب ایک تجربہ کار گدھ ہو چکے تھے۔

تو ہمیں پرواز کے لئے دو سو ڈالر خرچ کر کے کسی بیلون میں سوار ہونے کی

ضرورت نہ تھی۔

فرانٹے بھرتی اُس ٹیکسی میں سے صرف وہ بیلون دکھائی دیتا تھا جو ایک بیوقوف

لبوترے چاند کی طرح واڈی کھنڈ پر معلق تھا۔ وہ ستیج نہ دکتے تھے جو اُس کے نیچے لگتی

ایک بانس کی ٹوکری میں کھڑے اپنے دو سو ڈالر کے خرچے پر شاید نادام ہوتے تھے اور کہتے

تھے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا...

ہم زمین پر تھے اور وہ جو ڈالروں والے تھے آسمان پر تھے...

دریائے ہومانٹے کے نیم ٹرہڈ اٹوہا پانیوں میں اُس کی سفیدی کی کوئی جھلک نہ
 تھی کہ وہ ایک طویل فاصلے پر تھی۔

ہم جس روڈ پر سفر کرتے تھے اُسے چینی روڈ کہا جاتا تھا۔ بجلی کی تاروں سے
 بدھی ایک مسافر ٹرائی ہر چند منٹ کے بعد گزر جاتی تھی۔

اس چینی روڈ سے الگ ہو کر جب ہم بائیں ہاتھ کو ہو گئے تو وہاں سڑک کے
 کنارے ایک اور بورڈ نظر آیا ”نگر کوٹ۔۔۔ ۱۵ کلومیٹر“

”نگر کوٹ بھی ادھر ہے؟“

”جھلکا پور سے آگے فارٹی فائیو منٹ کا ٹریول ہے۔۔۔ جائے گا؟“ ڈرائیور نے

ہاں دیا۔

”کیوں سُہری بابا۔۔۔ جائے گا؟۔۔۔ رسم دنیا بھی ہے اور دستور بھی ہے۔“

”جناب ادھر کی خوبی تو یہی ہے ناں کہ وہاں سے ایورسٹ نظر آتی ہے۔۔۔ تو

ہاں سے بھی نظر آ رہی ہے۔۔۔“

”کوئی ہے؟“

”دریائے ہومانٹے کے اوپر جو برف پوش پہاڑ دکھائی دے رہے ہیں ان میں سے

کوئی سی بھی ہو سکتی ہے۔۔۔ تارڈ صاحب آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی ہے۔۔۔ برفیں

ماری کی ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔۔۔“

”سُہری بابا آپ میرے ایک بچپن کے دوست پھتوشخ سے کچھ مختلف نہیں

ہیں۔ وہ خواتین کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ ”رنگ برنگیاں ہانڈیاں تے تھلے اکو جئے۔۔۔“

”نہ کوئی فرق ہوتا ہے؟“ سُہری بابا تازہ کھا گئے۔۔۔

”اگر آپ کو اپنی ریش مبارک کے باوجود ہانڈیوں کا کوئی تجربہ ہو تو۔۔۔ فرق ہوتا

ہے“

”مثلاً؟“

”مثلاً کے لئے“ کاما سوترا“ سے رجوع کیجئے۔“

”میں آپ سے رجوع کرتا ہوں۔ اور جس قسم کی واہیات اور مخرب الاخلاق

لنگو آپ فرماتے ہیں اُس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک ماڈرن کاما سوترا لکھنے کی

ہو رہا تھا۔۔۔ میرے پاس ان کی قانونی ملکیت کے ٹھوس ثبوت تھے۔۔۔ میرے جو گزر ایک
 سنو جیکٹ، ٹریک سوٹ اور گرم بنیائیں جو ہوٹل سولتی کے کمرہ نمبر پانچ سو پچاس میں ایک
 سوٹ کیس کی تہ میں رکھے تھے اور میری ملکیت کے ڈاکومنٹس تھے۔۔۔

میں نے واخان پامیر ٹریک کے دوران واڈی سوئچ کے گھاس بھرے میدانوں
 میں۔۔۔ جہاں میرے گھوڑے کے سموں سے تلیوں کی سفید ڈھول اُٹھتی تھی خوشحال سے
 پوچھا تھا ”یہ وادی کس کی ہے؟“

”صاحب یہ وادی اُس کی ہے جس میں یہاں پہنچنے کی ہمت ہے۔“ اُس نے کہا

تھا۔

ایک آوارہ گرد۔ ایک کوہ نورد دنیا داروں سے اس لئے بہت سپر ہوتا ہے کہ
 وہ اُن خطروں کو مول لیتا ہے جو نہ اُسے دولت سے مالا مال کرتے ہیں اور نہ ثواب کا
 باعث بنتے ہیں۔۔۔ وہ کسی بھی غرض کے تحت اپنی جان کو داؤ پر نہیں لگاتا بلکہ یہ اُس کے
 من کی موج ہوتی ہے جو دنیا داروں کے حساب کتاب میں سراسر گھائے کا سودا ہوتا ہے۔

لیکن وہ بیوپاری نہیں ہوتا۔۔۔ چونکہ وہ بے غرض ہوتا ہے اس لئے وہ جس وادی میں پہنچتا
 ہے، جس جھیل تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ اُس کی ہو جاتی ہے۔۔۔ ان وادیوں اور
 جھیلوں کا کوئی شاک ایچینج نہیں ہوتا۔۔۔ ان کے حصے کبھی نہیں گرتے کہ یہ اُن کی پہنچ میں
 ہی نہیں ہوتے جو کاروبار کرتے ہیں۔

نانگا پربت کے دامن کی نیالی جھیل، سنولیک، جھیل کرومبر اور کنول لیک اور
 واڈی سوئچ اسی لئے میری ملکیت میں آچکی تھیں۔۔۔ اگرچہ فیصل کشور ہندوستان بھی
 میری ملکیت تھی لیکن اُس کی پکی رجسٹری تبھی میرے نام ہوئی تھی اگر میں اُس کے اندر
 تک پہنچ جاتا۔۔۔ اور یہ اب اور ساڑھے چار بجے کے درمیان ممکن نہ تھا۔

ان برف پوش ہمالیائی بلندیوں میں سے کوئی ایک ایورسٹ تھی۔۔۔ لیکن مجھے اُس

کی پہچان نہ تھی۔۔۔ بہت دنوں سے یہ بادلوں اور ڈھند میں چھپی ہوئی تھی اور آج پہلی بار

وہ ظاہر ہوئی تھی۔ ایک ایسے زائر کے لئے ظاہر ہوئی تھی جو آیا تو اُس کی زیارت کو فنا

لیکن راستے میں آسانسٹوں کے مندروں کی گھنٹیاں بجاتا رہا۔۔۔ اور قمار خانوں میں اپنا وقت

ضائع کرتا رہا۔

الہیت رکھتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟“

”یہ منحصر ہے اس بات پر کہ وہ ہانڈی کسی مٹی کی بنی ہوئی ہے.... اُس مٹی کے مزاج میں کیا کیا گندھا ہوا ہے.... وہ محبت کے آوے میں پکی ہوئی ہے یا چاک سے کچی ہی اتاری گئی ہے.... وہ سلگتے اُپلوں کی آگ پر چڑھ کر اپنے اندر پکنے والے گوشت کو نرم کرتی ہے یا لوہے کی طرح سخت اور بے جان کر دیتی ہے۔ یا پھر اُس کی مٹی کی مہک بند کمروں میں بھی ڈھوس میں چپاتی ہے اور جو کوئی دروازہ کھول کر اندر آتا ہے وہ جان جاتا ہے کہ یہ محبت کی آوے میں پکنے والوں کے سامان ہیں.... اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا....“

”اس سے زیادہ آپ اور کیا کچھ کہہ سکتے ہیں.... پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے.... شاید جنون میں کہہ رہے تھے.... چنانچہ ہم نگر کوٹ اس لئے بھی نہیں جاسکتے کہ ہم ساڑھے چار بجے روانہ ہونے والی فلائٹ کو مس کرنے کا رسک نہیں لے سکتے“

”سَر آپ بالکل درست فرماتے ہیں.... ہم دُنیا دار لوگ ہیں اور یہ رسک نہیں لے سکتے۔“

میں اگر تمنا ہوتا تو یہ رسک یقیناً لے لیتا.... کم از کم کچی رجسٹری تو ہو جاتی۔
زیادہ سے زیادہ ایک فلائٹ مس ہو جاتی.... ایورسٹ تو مس نہ ہوتی۔
ٹیکسی رُک گئی....

”بھگتا پور۔“ تھاپا نے ایسی میزاری سے کہا جیسے ایک گجری دیوار پر ایک اور اُپلا تھاپتے ہوئے کہتی ہے ”ایک اور اُپلا۔“

”بودی شاہ... مسلمان بُت فروش اور کالی دیوی“

قدیم دیو مالائی قصوں اور تبت کی بڈھ داستانوں میں بھی بھگتا پور کا ذکر آتا ہے.... اور اس کے شہر کو ایک سمندری گھونگھے کی شکل کا بیان کیا جاتا ہے جس کے اندر داستانوی حیثیت کے مندر اور عبادت گاہیں اور عمارتیں ہیں اور اس کی آبادی میں صرف وہ بھگت ہیں جو یہاں پر ستش اور نردوان کے لئے آتے ہیں.... ان میں ہم جیسے بگلا بگلوں کا ذکر نہیں۔ ٹیکسی رُکی تو میں نے باہر آکر ہالیہ کی دور دراز برفوں کو ذرا قریب لا کر دیکھنے کی کوشش کی.... اُس کی برفوں میں میرے سینے میں ٹھنڈ نہ پڑی کہ وہ بہت دور نہیں.... جیسے ناٹکا پریت کو شاہراہ ریشم سے دیکھ لیا جائے.... کے ٹوکو برتی لاء کے ڈرے پر لڑے ہو کر اُس کی سینکڑوں کلو میٹر دوری کو نزدیک لانے کی آرزو کی جائے.... جیسے ایک بُو ب چہرے کی تصویر ایک دھوکا ہوتی ہے.... ایسے یہاں سے بھگتا پور سے ایورسٹ کی نڈی ایک دھوکا تھی.... اگرچہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان ہالیائی چوٹیوں میں سے کونسی لگا ہے جو سر بلندیوں کی ملکہ ہے۔

”دو گھنٹے میں واپس آجائے گا؟“ تھاپا نے ناراض ہو کر پوچھا۔

”آجائے گا.... انشاء اللہ“

میرے انشاء اللہ کہنے سے تھاپا ذرا مشکوک ہو گیا ”آپ کیسا بھگت ہے؟“
یقیناً نیپال میں بھی بھگتوں کی مختلف اقسام پائی جاتی ہوں گی.... مختلف فرقے اور تہذیبوں ہوں گے.... شیعہ، سنی، بریلوی، اہل حدیث اور وہابی بھگت ہوں گے اور ایک

دوسرے کی جان کے پیاسے بھگت ہوں گے.... لیکن ہم تو آگاہ نہ تھے۔
 ”ہم دونوں بگلا بھگت ہے تھا.... میں ذرا سانولا بھگت ہوں اور یہ داڑھی والا...
 سُہری بھگت ہے اور یہ ہم دونوں کی ملی بھگت ہے....“
 ”کیسا بھگت ہے؟“

”بس ہم ایسا بھگت ہے اور بس دو گھنٹے میں واپس آجائے گا....“

ہم ٹیکسی سے اترے ہیں تو ایک خوشگوار نیپالی رنگ کی.... سرسبز اور زور برقانی
 کشادگی کا احساس ہوا جو کھنڈوں میں مقنود تھی.... یہاں سانس لینے میں آسانی تھی....

اور ہم ٹیکسی سے اترے ہیں تو.... ایک منحنی سا جھکا ہوا نہایت مسکین اور بجا
 ہوا سا شخص زندگی سے رنجیدہ اور ناخوش کہ.... زندگی نے اُسے کچھ نہیں دیا تھا ہمارے
 آس پاس جانے کس آس میں اپنی فاتحہ زدہ یا چرس زدہ کھال کھینچی ہوئی کھوپڑی کو سہلانے
 لگا اور اُس کی کھوپڑی پر جو چپکے ہوئے گل نماتھے وہ کم از کم دو تین ہفتے پیشتر کسی کھنڈے
 اُترے کی زد میں آئے تھے اور اس کھوپڑی کے اوپر ایک باریک نامعلوم سی چند باریک
 بالوں کی لٹ لٹکتی تھی اور یہ وہی بودی تھی جو ہمارے ہاں سیاسی کارٹونوں میں ہندوؤں کے
 سر سے لٹکتی ہے.... جانے ہندو کارٹونسٹ مسلمان حضرات کے کارٹون بناتے ہوئے اُن کے
 بدن کا کونسا حصہ لٹکاتے ہیں....

ظاہر ہے وہ ہماری توجہ کا طالب تھا....

”کیا ہے؟“ میں نے پوچھا.... اس بودی شاہ سے پوچھا....

جواب میں اُس نے صرف سکڑتی رگوں سے بنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ”گائیڈ“

ہے صاحب....“

”کیا دکھائے گا؟“ سُہری بابا نے نہایت تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا.... وہ اس
 سے بھی کسی ڈرامے میں اداکاری کے جوہر دکھانے کے تمنائی کسی سماں ٹائم ایکٹر کی طرح
 مخاطب ہوئے....

جواب میں بودی شاہ نے ایک نہایت عاجزانہ تقریر کسی نامانوس زبان میں کی جس
 کے آخر میں اُس سے بھی زیادہ نامانوس دیوبی دیوتاؤں کے نام عقیدت سے لئے اور پھر کہا
 ”صاحب میرے پاس لائسنس نہیں ہے؟“

”گھاڑی چلائے گا۔ پستول چلائے گا.... کس شے کا لائسنس نہیں ہے؟“

”جی صاحب....“ وہ پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا ”گائیڈ ہے صاحب“

”تو کس شے کا لائسنس نہیں ہے؟“

”صاحب ادھر نیپال میں گائیڈ کا لائسنس صرف اُسے ملتا ہے جو پڑھا لکھا ہو....

ہاں کیا ہو.... صاحب ہم پڑھا لکھا نہیں چوری چھپے یہ دھندا کرتا ہے لیکن صاحب.... ہم
 ہٹ پُور کارہنے والا ہے.... اس گائیڈ لوگ سے زیادہ جانتا ہے، ہمارا انگلش ٹھیک نہیں
 ہیں ہم جانتا ہے کہ کس دیوبی کی چرن چھونے سے آپ سُرگ میں جائے گا....“ وہ اتنا
 سکین اور اتنا اپنے آپ کو پیچھے پیچھے رکھنے والا اور آپ پر سوار نہ ہو جانے والا معصوم سا
 بڑھ تھا کہ میں انکار نہ کر سکا.... اور یوں بھی مجھے اُس کی بودی پسند آگئی تھی جو بھگت پُور
 لی ہواؤں میں ایک لال دوپٹے کی طرح لہرا رہی تھی۔

”کتنا آئی سی ہو گا؟“ یہ ظاہر ہے میرا نہیں سُہری بابا کا سوال ہی ہو سکتا تھا....

”سوروپے دے گا تو ہم خوش ہو جائے گا صاحب....“

”سچاس روپے دے گا۔“

”ٹھیک ہے صاحب....“ اُس نے بودی تسلیم خم کر دی....

بھگتا پُور کی یا ترا کے دوران مسلسل سُہری بابا صرف اس بات پر کڑھتے رہے کہ

اُرہم اِس بودی بابا کو پچیس روپے بھی آفر کر دیتے تو وہ مان جاتا....

ہم.... میں.... سُہری بابا اور جھکا ہوا بودی شاہ بھگتا پُور کے دامن میں کھڑے

تھے....

دامن میں ایسے کھڑے تھے جیسے شاہ گوری کے بیس کیمپ میں اُس پر نظر ڈالتے

ہیں....

ٹاپ میدان سے نانگا پربت پر سے اُترنے والے کسی برفانی تودے کی گونج اور

غیدی کوکتلتے ہوں....

لیکن بھگتا پُور کے دامن سے جو بُرج مینار سے دکھائی دیتے تھے وہ برف اور

پہاڑوں کے نہ تھے، پگڈوؤں، مندروں اور کئی سو برس قدیم آماجگاہوں کے تھے۔

بھگتوں کا یہ عجوبہ شہر جو ایک عجائب گھر کی طرح نیپال کی قدیم ثقافت اور آخرت

اور ہر شر آرزو عقیدے اور عشق کے نقشوں سے اور جذبوں کے اینٹ گارے
تخلیق ہوتا ہے۔

اور ہر ذی نفس کا شر آرزو الگ الگ ہوتا ہے....
سوہنی کے لئے چناب کے پھرتے پانیوں کے پار جو ایک کٹی یار کی دکھتی ہے....
ایک جھونپڑا مینوال کا جو نظر آتا ہے بس وہی شر آرزو ہے....

ایک کوہ نور کے لئے کوئی پانیوں کا شر.... ایک جھیل بھی آرزو کی تکمیل ہو سکتی
ہے....

ہم سیاہ غلاف کی پہلی بھلک پر اپنے سارے شر قربان کر دیتے ہیں اور سکھ نکانہ
مادب کے نظر آتے ہی جھک کر اُس مٹی کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

کسی اور کے شر آرزو میں داخل ہوتے ہوئے یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ
ہم اُس شوق اور دیوانگی کا ایک ڈرہ بھی محسوس کر سکیں جو اُن کے عقیدے اور عشق میں
ہے جن کا کہ وہ شر آرزو ہے۔

دروازے.... بھگتا پور کے دروازے تک اُٹھتی صاف ستھری سڑک کے کنارے
سب معمول ٹورسٹ حضرات کے لئے نیپالی ہینڈی کرائس اور یادگاری تحفے فٹ پاتھ پر
بچے تھے.... دوکانداروں کی بجائے وہاں زیادہ تر دوکانداریاں یعنی خواتین تھیں.... کچھ بستی
کچھ نیپالی لیکن ہر دو اقسام نہایت بے ضرر تھیں.... ایک نوجوان لڑکا لپکتا ہوا ہمارے
نائب میں چلا آیا اور اُس کے ہاتھوں میں بھی وہی پلاسٹک کالا رڈ بدھا تھا جو تھمیل میں
اُس نیپالی بچے کے ہاتھ میں تھا کہ آئی گویو گڈ پرائس.... لارڈ بدھا فار ٹو ہنڈرڈ روپیہ....

اور اس نوجوان نے بولی پانچ سو روپے سے شروع کی.... لیکن وہ اعصاب پر سوار
نہ ہوتا تھا نہایت دھیمے لہجے میں مہاتما کا سودا کرتا تھا ”اسے گھر میں رکھو گے تو ککشمی
اُڑے گی، نردان ملے گا۔ یہ اچھی خرید ہے.... پانچ سو میں لارڈ بدھا کیا بڑا ہے.... اس کے
گلے میں اگر کنول کے پھول ڈالے تو یہ خوش ہوگا.... نہیں ڈالو گے تو ناراض نہیں ہوگا....
لارڈ بدھا....“

”نہیں نہیں....“ میں نے مسکرا کر کہا ”ہم ان لارڈ کے خیالات اور شخصیت کے
انہجاری ہیں لیکن ان کے نہیں۔“

کے عقیدوں کو سنبھالے ہوئے تھا ہم سے ذرا بلندی پر اُٹھتا تھا.... اور اُس کے پڑانے
وجود تک ایک صاف ستھری سڑک اُٹھتی تھی جس کے آخر میں سیڑھیوں کا ایک طویل
سلسلہ تھا اور پھر وہاں ایک دروازہ تھا جو آپ کو اس شہر طلسمات کے اندر لے جاتا تھا۔
داخلے کے لئے ٹکٹ مقرر تھا....

اور ہم ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کی کھڑکی کے اوپر درج شدہ داخلہ رقم مبلغ تین سو روپے دیکھ
کر ہراساں ہو گئے کہ ہم اس شر کو دیکھنے آئے تھے، خریدنے نہ آئے تھے.... لیکن یہ شر
غیرملکیوں کے لئے تھی.... ڈالروں کے حساب کتاب کے مطابق تھی اور اُس کے نیچے
سارک ممالک کے غریب غریبا کے لئے صرف تیس روپے کی نوید تھی۔

میں اور سُہری بابا جو اس تین سو روپے کو دیکھ کر بھگتا پور یا ترا تیاگ دینے کو تھے.... میں
روپے کی نوید سے از حد نہال ہوئے....

میرے داخلے کے ٹکٹ کا نمبر ۹۹۳۵ تھا.... اور یہ میری یادداشت کا معجزہ نہیں ہے مجھے تو
اپنا ٹیلی فون نمبر بتاتے ہوئے بھی وقت ہوتی ہے.... یہ یہ کمال ہے اُس ٹکٹ کا جسے میں نے
سنبھال لیا تھا اور اب میری سنڈی ٹیبل پر میرے سامنے رکھا ہے.... اور اس سامنے والے
ٹکٹ پر تیس روپے کے انداز کے نیچے ”ویلم ٹودی شی آف کلچر“.... درج ہے.... ٹکٹ
پر بھگتا پور کے مندروں اور عبادت گاہوں کی ایک خوبصورت ڈرائنگ ہے.... اور یہ بھی
درج ہے کہ اس رقم سے بھگتا پور کی قدیم یادگاروں کی دیکھ بھال اور مرمت ہوتی ہے....
بلکہ یہ بھی کھلا کہ بھگتا پور میں ہمہ وقت جرمن آثار قدیمہ کے ماہرین کی ایک ٹیم موجود
رہتی ہے جو مندروں، لکڑی کے جھروکوں، کھڑکیوں، صحنوں، تالابوں اور مجسموں کو اُن کی
اصل شکل میں محفوظ رکھنے اور اُنہیں شدید موسموں کی خشکست و ریخت سے بچانے کا
جتن کرتی ہے....

اگرچہ میر نے بھی کسی سے پوچھا تھا کہ دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے.... لیکن ہمیں کسی
سے پوچھنے کی حاجت نہ تھی کہ ہم جانتے تھے کہ ہمارے سامنے جو راستہ اُٹھتا تھا تو یہ اُن
بھگتوں کے دل اور جان سے اُٹھتا تھا جو اس قدیم بستی کے درشن کو جانے کہاں کہاں سے
آتے تھے.... اور اس راستے کے اختتام پر وہ دروازہ تھا جس کی اندر اُن کا شر آرزو تھا....

”یہ تو کسی اور کے بھگوان ہیں صاحب... ہمارے تو نہیں... ان کے بیچنے سے ہمارا بچا جاتا ہے۔“ محمد اعجاز نیپالی کی اس منطق سے مجھے وہ سردار صاحب یاد آگئے جو ایک ندی نالی میں ہاتھ چلا رہے تھے اور ساتھ ساتھ دعائیں کر رہے تھے کہ یا اللہ میری چوٹی ماجائے... یا اللہ اس نالی میں جو میری چوٹی گر گئی ہے وہ مل جائے۔ ایک اور سردار جی کا لذر ہوا تو وہ سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے اوئے بھاپے کیسا خالص ہے کہ اللہ کا نام لے رہا ہے واہ گرو سے مدد نہیں مانگتا... تو نالی میں ہاتھ چلانے والے سردار صاحب نے کہا، لو نالی میں گری چوٹی کے لئے اپنے واہ گرو کو کیوں تکلیف دوں...

ویسے محمد اعجاز نیپالی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہم اپنے پیارے پاکستان میں اپنے گوانوں کو کھلے عام فروخت کرتے ہیں... ان کی بولی لگاتے ہیں... ان کے عذاب کی نوید سنا کر عوام الناس کا ستیاناس کرتے ہیں... وقت آنے پر تسبیح ہاتھ میں پکڑ کر اللہ ہی اللہ کرتے ہیں اور سوس پیسوں اور رائے ونڈ کی طرف نکل جاتے ہیں... اپنے گھوڑوں کو سوس ایکٹ کھلاتے ہیں... اور عوام کو کہتے ہیں کہ بھگوانوں کے لئے قربان ہو جانے کے لئے پار ہو جائیں...

”محمد اعجاز تم سے مل کر واقعی بے حد خوشی ہوئی...“ اور یہ حقیقت ہے کہ بھگوانوں کے شہر میں داخل ہوتے ہوئے یہاں کی اقلیتی برادری سے مل کر نہایت مسرت ہوئی... ہم اپنے ہاں تو اپنی اقلیتوں کے شائشی نگر اور مندر وغیرہ ڈھادیتے ہیں پتہ نہیں بھائی ہندو اپنے دھرم کو پوتر رکھنے کے لئے ایسے نیک اقدام کرتے ہیں یا نہیں...

محمد اعجاز وہ پاسان تھا جو بت خانے کے باہر اپنے ایمان کو سنبھالتا تھا... اور ہم وہ تھے جو آخری عمر میں مسلمان ہونے جا رہے تھے... اگرچہ خاک ہونے جا رہے تھے۔

بودی شاہ ہمارے آگے آگے چلا جا رہا تھا اور مسلسل کچھ جنتر منتر اور دیوی دیوتاؤں کے نام الاپتا جا رہا تھا... اور اس کی باریک بودی ایورسٹ کی برفوں کے پس منظر نما اور مارچ کے مہینے کی ٹھنڈک میں کبھی کبھی ہوا کے زور سے فضا میں ایک پڑمردہ نپولین کی طرح اٹھتی تھی اور پھر اُس کی گردن پر گر جاتی تھی... مجھے یہاں وہ پروفیشنل لمبے سیاہ چونوں والے حضرات یاد آگئے جو آپ کے

نوجوان ذرا ٹھنک گیا ”بڑھا کو نہیں مانتا“
”نہیں۔“

”شیوا کو مانتا ہے... اُس کا ماسک بھی میرے پاس ہے... ہونمان جی بھی ہے“
”یار ہم ان کو بھی نہیں مانتا... اور ان تینوں کے نزدیک ہم سخت بے دین ٹھہرتے ہیں“

وہ کچھ دیر خاموشی سے ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا... ذرا شش و پنج میں مبتلا رہا اور پھر کہنے لگا ”آپ ہندوستان سے نہیں آیا؟“
”نہیں۔“

”تو کدھر سے آیا ہے؟“

”پاکستان سے۔“

”اصل پاکستان سے۔“ اُس نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

”ہاں... سو فیصد کچل... چوبیس کیرٹ کے دکتے سُہری پاکستان سے...“ یہ جواب سُہری بابا کی جانب سے آیا...

”مسلمان ہے؟“

میں اگرچہ کہتا تو یہ چاہتا تھا کہ ہاں... نصف مسلمان ہے... سو نہیں کھاتا... البتہ دیگر قباحتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور بندہ سخت شرمندہ ہے لیکن میں نے صرف ”ہاں۔“ کہنے پر اکتفا کیا۔

نوجوان نے میرے چہرے پر سے نظریں ہٹائے بغیر بدھا زمین پر رکھا اور اُس کی شکل پر ایک ایسی خوشی آئی جو ایک بچے کے چہرے پر آتی ہے جب وہ زندگی میں پہلی بار آئس کریم کھاتا ہے۔

”السلام و علیکم۔“ اُس نے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

”وعلیکم السلام۔“ سُہری بابا نے فوراً اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔

”میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا نام محمد اعجاز ہے۔ نیپالی ہوں اور... آئی ایم اے“

”مسلم...“

”اچھے مسلمان ہونے کا کاروبار کرتے ہو۔“

در اپنے سینگوں کے درمیان ماتھے پر سُرخ تلک لگوا کر نہایت معزز اور برگزیدہ محسوس کر رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ یہ سارے ہار سنگھار اور چاہتیں تھوڑی دیر میں اُس کا گلا ہٹ کر رکھ دیں گے... جیسے عید قربان کے لئے تیار شدہ بکریا ہرگز نہیں جانتا کہ اُس کے رن کو جو مہندی لگائی جا رہی ہے اُسے سجایا جا رہا ہے اور سینگوں کے ساتھ گیس کے ڈارے باندھے جا رہے ہیں تو یہ سب کے سب سامانِ مرگ ہیں...

ساتھ مشد میں امام رضا کے روضے پر اپنے آپ کو ایک پر تقدس چال کے ساتھ نہتی کر لیتے ہیں... نذر لب... جانے کیا کیا پڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھر آپ کے ہاتھوں کو ایک دھکا دے کر کہتے ہیں ”ذُعا...“ اور جب آپ ذُعا سے فارغ ہو کر رُخصت ہونے لگتے ہیں تو وہ آپ کا دامن تھام کر دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہیں ”ذُعا کے پیسے...“ اگرچہ یہ بودی شاہ اُن کی نسبت نہایت دھیما اور مسکین تھا...

سڑک کا اختتام ہوا تو سیڑھیاں شروع ہو گئیں...

ان کے اختتام پر... بہت اُوپر بھگتا پُور کے شہر آرزو کا دروازہ کھلا تھا...

سیڑھیوں کے ساتھ جو دیوار اُٹھتی تھی... اُس میں طاق اور جھروکے تھے جن میں بچھے ہوئے دیئے اور ہار تھے...

اور شدید تھی کہ اگر آپ بھگتا پُور میں سرشام آئیں تو اُس کی جانب جانے والے تمام راستوں اور پگڈنڈیوں پر دیئے جلتے ہیں... اور اُنہیں جلانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی آرزوئیں ناتمام ہوتی ہیں۔

بھگتا پُور کے گیٹ سے ذرا اُدھر بائیں ہاتھ پر بودی شاہ کو بریک لگ گئی، وہ ڈکا اُدھر کو جھکا ہاتھ جوڑے، اپنی بودی کو سنوارا اور کہنے لگا ”یہ کالی دیوی کا مندر ہے۔“ بودی شاہ نے اگرچہ نام کسی اور دیوی کا لیا تھا جو میں یاد نہیں رکھ سکا اور اگر ہم اُسے کالی دیوی کہہ دیں تو کیا فرق پڑتا ہے... ایک بدھ یا ہندو کو بھی تو شیخہ، سنی یا وہابی سے کوئی فرق نہیں پڑتا...

وہاں اُس مندر کے جھروکے میں کوئی دیوی تھی... اُس کے آگے کچھ پجاری ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور مجھے جو دیوی نظر آئی وہ کچھ معیوب سی نظر آئی۔

مندر کے باہر ایک بنی سنوری بکری کھڑی تھی... جیسے کسی بیوٹی پارلر سے سنگھار کر کے آئی ہو... اُس کے سینگوں کے درمیان سُرخ رنگ کے تھوبے تھے جیسے دہتی اپنے ماتھے پر پشوپتی ناتھ جی کے ہاں سے تھپو کر آئی تھی...

”یہ بکری بلی ہکے لئے ہے...“ بودی شاہ بولا ”ابھی اس کا بلیدان ہو گا دیوی کے چرنوں میں...“

بکری بے چاری نہایت پُرسرت حالت میں کبھی کبھار ”ہاں آں“ کر دیتی تھی

لہ وہ انہیں دیکھ کر حیران ہو گا اور متاثر ہو گا... اور اس ڈیوٹی کو سرانجام دیتا ہے...
 بے شک اپنی سیاحتوں کے دوران وہ ہندوستان کے پنک سٹی جے پور میں ”ہوا محل“ کے
 اسم میں گرفتار ہو۔ مصر کے شہر سکندریہ کی کسی سانولی شکل میں اُسے عمر بھر کی مسافتوں
 کی سش دکھائی دے یا پیرس میں دریائے سین کے کسی پل کے کسی ایک مجستے کو نظر بھر
 دیکھتا رہے... پھر بھی اُس کی ڈیوٹی یہی ہے کہ وہ تاج، اہرام اور آئفل کے گن گائے...
 کچھ اسی طور ہمارے سوا جو ستیج تھے وہ بھگتا پور میں حیران اور متاثر ہونے کا
 بلہ کر کے آئے تھے۔

ذرا آگے ایک اور چوکور اور بلند دروازہ تھا۔

ایک چوکھٹا تھا جس کے پار بھگتا پور اور دربار سکور تھا...

اور اسی سکور کے بارے میں ای اے پاول نے کہا تھا کہ اگر نیپال میں اور کچھ
 نہ ہوتا... صرف بھگتا پور کا دربار سکور ہوتا... تب بھی آدمی دنیا کی مسافت طے کرنے کے
 بد صرف اُسے دیکھنا جائز ٹھہرتا...

اس دروازے کے پہرے دار دو شیر نما مجستے تھے جن کی گردن کے بال
 بیڑھیوں کی شکل میں گندھے ہوئے تھے جیسے ایک زمانے میں پنجاب کے دیہات میں
 لپاریں اپنے بال مینڈھیوں کی شکل میں گندھواتی تھیں اور اپنی طرف سے نہایت ماڈسکوڈ
 ہو جاتی تھیں... اگرچہ ان دنوں وہی سائل ”فرنج بن“ کی صورت میں قبول عام کی سند پا
 چکا ہے۔

بھگتا پور کی حفاظت پر معمور جو شیر تھے... اُن کے بال اگر مینڈھیوں کی صورت
 میں گندھے ہوئے تھے تو یقیناً اُن کی شیرنیوں نے پار سے گوندھے ہوں گے کہ ایک شیر
 چاہے وہ کتنا ہی شیر کیوں نہ ہو بہ ذات خود اپنے پنجوں سے تو اُنہیں گوندھ نہیں سکتا تھا۔
 ایک جھکا ہوا... بودی شاہ کا بھائی نیپالی چست پاجامے اور چادر میں لپٹا ہوا کاندھے
 پر ایک ہانس بیلس کئے اور اُس کے سروں پر دو ٹوکریاں اٹھائے ہم سے لا تعلق بلکہ
 رنجیدہ... چلا جا رہا تھا... جیسے ہمارے ہاں... دال اور چنے بیچنے والے اپنا بوجھ اٹھائے چلے
 جاتے ہیں...

بھگتا پور کے چوک میں اگرچہ اُس پر جھکا جو آسمان تھا جس کے ایک کنارے پر

”بھگتا پور... ہیون سانگ اور مار کو پولوان
 دربار چوک“

بھگتا پور کے شہر آرزو کے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہوئے ہم پر نہ رقت
 طاری ہوئی اور نہ ہمارے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں اتریں اس لئے کہ ہم جینوں کی
 بھگت نہ تھے... بلکہ بھگت تھے...

دروازے کے اندر دائیں جانب کچھ قدیم گھر تھے... کچھ نیم شکستہ مکان تھے جن
 کی اینٹیں دیواروں کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں... کھڑکیاں چوکور اور اندھی تھیں اور میں یقیناً
 ایک ایسے گھر میں اپنی زندگی کے آخری ایام نہیں گزار سکتا تھا... ایک عجیب مرونی تھی ان
 پرانی آماجگاہوں میں...

ہمارے سوا اور بھی ستیج تھے جو حیران اور متاثر ہونے کے لئے بھگتا پور آئے
 تھے...

یہ ستیجی رزمیے کا ایک عجیب قصہ ہے کہ ستیج پہلے سے فیصلہ کر کے آتا ہے کہ
 وہ تاج محل، اہرام مصر یا آئفل ٹاور کو دیکھ کر حیران ہو گا اور متاثر ہو گا... بے شک
 ان انسانی عجائبات پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد وہ دل ہی دل میں سخت مایوس اور ناامردا ہو...
 تاج محل کی قربت میں جنما کے کنارے وہ کچھ اور بھینسیں دیکھے... اہرام مصر کے بے ہنگم
 پتھروں کے مجموعے کو دیکھ کر مایوس ہو... یا آئفل ٹاور کو ایک مُردہ آہنی پرندے کی طرح
 پیرس کے آسمان پر اپنے منحوس سچے گاڑے دیکھے... لیکن وہ پہلے سے طے کر کے آتا ہے۔

کشور ہندوستان کی سفیدی تھی جو یہاں سے دکھائی نہ دیتی تھی... نیلا اور شفاف تھا...
دھوپ ہر شے کو ظاہر کرتی تھی... اُسے برہنہ کرتی تھی۔
دربار چوک کی سرخ اینٹوں کے فرش پر کوئی سایہ نہ تھا...

جو زینہ بہ زینہ بلند ہوتے چھتری نمائندہ تھے اور اُن کے کلس سُہری تھے... اور
ان کے عقب میں بھی سفید برفوں کی جھال تھی...

اور اُن کے وجود میں سُرخ کا رنگ گوزھا تھا، لیکن اس کے باوجود...

اس کے باوجود... کہ یہ لمحہ موجود میں تھا... یہ یہاں نہ تھا... ہزاروں برس پیشتر کا
ایک فلیش بیک تھا... لمحہ موجود کا پردہ اُٹھ چکا تھا اور ہم تماشائی تھے ایک ایسے منظر کے جو
ہندو اور بدھ مت کی ہزاروں برس سے کسی مندر یا گمشدہ سٹوپا میں بھوج پتیر لکھی گئی
فراموش کردہ پوتر تحریروں میں تھا... ہم ان کی عبادت پڑھنے سے قاصر تھے لیکن اُسے
اپنے سامنے دیکھ سکتے تھے... یا تو بھگتا پور کسی فلم کا سیٹ تھا... اور یا ہم ٹائم بیسیز کراس کر
کے بہت پیچھے سفر کر گئے تھے... یہاں اگر ہیون سانگ نظر آجاتا، مارکو پولو دکھائی دے جاتا...
یا ابن بطوطہ اپنی تازہ ترین اہلیہ کے ہمراہ طویل لمباے اور پھندے والی ٹوپی میں کسی مندر
کی گیلری میں واقع ریستوران میں بیٹھا کلب سینڈوچ کے ہمراہ ٹیورگ بیئر کے گھونٹ
بھرتا پایا جاتا تو ہمیں کوئی اچنبہ نہ ہوتا... اور ابن بطوطہ کی بیسیز سعودی عرب میں کشید کردہ
”نان الکوہک بیئر“ ہوتی... اور ہیون سانگ چینی رائس واٹن سے دل بہلاتا اور مارکو پولو
سُرخ کیانتی سے اپنا غم غلط کرتا کہ واپسی پر اُس نے اپنی زندگی کے آخری ایام ایک
عقوبت خانے میں بسر کرنے تھے...

جیسے نانگا پربت کے زوپل چرے میں داخل ہوتے ہوئے ٹاپ میدان میں ایک
ایسی ہی کیفیت مجھ پر اُترتی تھی کہ ہم کوہ نور دیکھنے کے لیے چلے گئے تھے... ہم ہالیائی
پہاڑوں کے اندر پوشیدہ ایک خطے میں داخل ہو گئے تھے کہ نانگا پربت پاکستان کی رینک
آئیز بلندیوں میں سے واحد چوٹی ایسی ہے جو کوہ ہالیہ کی زنجیر کی آخری کڑی ہے... تو یہی
کیفیت یہاں بھی تھی... بھگتا پور کے پس منظر میں جو کشور ہندوستان تھی اگر ہم پرندے
ہوتے اور اُس پر پرواز کرتے چلے جاتے تو نانگا پربت تک جا پہنچتے اور وہیں گھونسا بنا لیتے
کہ وہی ہمارا وطن تھا... وہی ہمارا گھونسا تھا...

بھگتا پور چوک میں صرف چند ایک سیاح تھے۔ جن کی ٹیلی جینیس، پریشان بال اور
بہرے اس گمان کو جھٹلاتے تھے کہ ہم اُن زمانوں میں نہیں ہیں جب ہیون سانگ ادھر
آیا تھا...

بودی شاہ مسلسل بولے چلا جا رہا تھا اور پتہ نہیں کیا کیا بولے چلا جا رہا تھا۔
ہم اُس کے عقیدے اور عشق سے نادانف تھے اور ناہمرد تھے... اس لئے وہ جو
ہی کہتا تھا اُس سے نادانف تھے اور ہم پر اثر نہ ہوتا تھا۔

میں اگر اس بودی شاہ کو دمشق کے قبرستان باب الصغیر میں مدفون بلال حبشی کے
مزار پر لے جاؤں اور اُن کی صفات بیان کرتا چلا جاؤں تو کیا اس پر اثر ہو گا؟...

اس دربار چوک میں جتنی بھی شاندار عمارتیں تھیں اُن میں سے بیشتر کا
سنگ بنیاد آج سے بارہ سو برس پیشتر رکھا گیا تھا... ابھی محمود غزنوی کی آمد میں دو سو برس
لاؤقتہ تھا... استنبول ابھی قسطنطنیہ تھا... قصر الحمرا اور مسجد قرطبہ ابھی وجود میں نہ آئے تھے
اور اُنڈلس موروں کا ملک تھا اور یورپ اپنے بدن کو کھالوں سے ڈھک کر ایک نیم وحشی
زندگی گزارتا تھا... تب ان عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا... اور وہ کیسے آرکیٹیکٹ تھے جن
کے ذہن میں ایسے محیر العقول نقشے آئے اور وہ کیسے باکمال معمار تھے جنہوں نے انہیں
تعمیر کیا اور وہ کیسے ذوق جمال کے لوگ تھے جنہوں نے ان کی آرائش کی... اگرچہ ان سے
بھی سینکڑوں برس پیشتر ”شکلنلا“ کا عظیم ڈرامہ نویس کلی داس گذر چکا تھا جو یونانی المیہ
نگاروں... سفو کولیس، یورپنی ڈیز اور ایس کلس سے کسی طور کم نہ تھا اور جس کے
ڈراموں میں ہرن یوں زقندیں بھرتے تھے کہ اپنے بدن پیچھے چھوڑتے تھے اور اُس کے
بیک اپ روم میں اداکارائیں وہی باتیں کرتی تھیں جو آج کے ٹیلی ویژن کے میک اپ
روم میں بھی... وہی باتیں کرتی ہیں۔

لیکن ہمارے سامنے جو عمارتیں تھیں وہ مکمل طور پر بارہ سو برس قدیم نہ
تھیں... مسلسل زلزلوں اور موسمی آفات کے باعث وہ مندم ہوتی رہیں اور پھر سے تعمیر کی
جاتی رہیں... یہاں بھی ایک اور گولڈن گیٹ ہے... جس پر تانبے کو ایسے ڈھالا گیا ہے کہ
اُس کے نقش باقاعدہ سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، کھنڈو کے اُس دروازے کی
مانند جسے فلارنس میں واقع ”گیٹ آف پیراڈائز“... گہرے کے تخلیق کردہ دروازے سے

تشبیہ دی جاتی ہے۔۔۔

اس گیت کے اندر تالیجو مندر ہے۔۔۔

اور ہمارا بودی شاہ منتروں کا الاپ کرتا ہمیں اس کے اندر لے جا رہا تھا۔۔۔
مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ یہ بودی شاہ جو شاید ٹورسٹ سیزن میں ہر روز
کسی نہ کسی آسامی کے ساتھ اس مندر میں جاتا ہے تو اُس کے الاپ میں کوئی مکاگی
کمرشل ازم نہ تھی کہ وہ صرف ڈیوٹی کے طور پر یہ شبد الاپتا ہے بلکہ ایسا لگتا تھا کہ وہ
ایک طویل مسافت کے بعد اس مندر میں پہنچا ہے اور پہلی بار اُس میں داخل ہو رہا ہے
اور لبیک کہتا ہوا اپنے خداؤں کی توصیف کرتا ہے۔۔۔

مندر کے اندر آب و ہوا گرم مرطوب اور بے آرام کرنے والی تھی اگرچہ یہ
مندر اوپن ایئر تھا۔۔۔ یہاں بھی کچھ زمینی بھگوان تھے جن پر اُبلے ہوئے رنگین چاول، تیل
اور گیندے کے پھول پڑے تھے۔۔۔ بائیں ہاتھ پر ایک منقش پتھر کا دروازہ تھا جس کے
اندر مندر کا پوشیدہ اور مقدس حصہ تھا۔۔۔ یہاں ایک بورڈ پر انگریزی زبان میں ایک
وارننگ درج تھی کہ یہاں سے آگے صرف ہندو جا سکتے ہیں۔۔۔ لیکن اس پر یہ درج نہ تھا
کہ اگر ہندوؤں کے فلاں فرقے کے لوگ عبادت کے لئے اندر آئیں گے تو جس جگہ پر
وہ عبادت کر کے فرار ہو جائیں گے اُسے کھود کر دوبارہ تعمیر کیا جائے گا تاکہ نپاکی دور کی
جا سکے۔۔۔

بودی شاہ اپنا رام نام چیتا دندنا ہوا اندر چلا گیا اور ہم دونوں رُک گئے۔۔۔

”کیوں تارڑ صاحب۔۔۔ اندر چلیں۔۔۔ کسی کو کیا پتہ کہ ہم کیا ہیں۔۔۔“

”ہمیں خود نہیں پتہ کہ ہم کیا ہیں۔۔۔ میں تو شکل سے خاصا براہمن اور رگ وید

کے وطن کا بچاری لگتا ہوں۔۔۔ لیکن آپ جیسا سُہری ہندو تو خال مال ملتا ہے۔۔۔“

”دیکھیں تو سہی اندر کیا ہے؟“

”سُہری بابا۔۔۔ اندر ایک مندر ہے۔۔۔ اندر وہی کچھ ہو گا جو ہم پچھلے ایک ہفتے سے

دیکھ رہے ہیں اور عاجز آچکے ہیں۔۔۔ یوں بھی ایک مندر کے لئے اپنا عقیدہ داؤ پر نہیں لگا

سکتا۔۔۔“

”کیا مطلب؟“

”کیا پتہ ہم اس کے اندر جائیں تو ہمیں کچھ ہو جائے۔۔۔“

”کیا ہو جائے؟“ سُہری بابا چونکے ہوئے۔

”یہ بھیدوں کی لہتی ہے۔۔۔ بھگتا پور ہے۔۔۔ اس مندر کے اندر جائیں تو کیا پتہ

ہمارے سروں سے بودیاں لٹکنے لگیں، ماتھے پر تنک نمودار ہو جائیں اور بت پرستی ہمارا

لٹار ہو جائے۔۔۔ تو یہ رسک نہیں لینا چاہئے۔۔۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ آخری عمر میں کیا خاک بٹ پرست ہوں گے۔۔۔ ہمیں یہ

رسک نہیں لینا چاہئے۔۔۔“

میں نے گائیڈ بک میں پڑھ رکھا تھا کہ مندر کے اندر جو تالیجو چوک ہے اور

لماری چوک ہے وہ قدیم نیپالی فن تعمیر کا ایک عجوبہ ہے۔۔۔ اور وہاں جو نقش و نگار اور

نورتیاں ہیں وہ ایمان کو متزلزل کرنے پر قادر ہیں۔۔۔ تو اسی لئے ہم نے اُس کے اندر

جانے سے پرہیز کیا۔ بودی شاہ کیونکہ اپنے آپ میں غرق تھا اور اُس کا خیال تھا کہ ہم بے

ام غلام بچاریوں کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اس لئے وہ سر ہلاتا منتر چیتا

ن مندر کے ستونوں کو بوسے دیتا، کبھی ادھر ہاتھ جوڑتا، کبھی ادھر ہر نام کرتا، کبھی فرش پر

اتھا ٹیکتا۔۔۔ بولتا چلا جا رہا تھا۔

اور ہم چوکھٹ کے اس جانب ”اوٹلی فار ہندوز“ کے بورڈ تلے رُک کے کھڑے

تھے۔۔۔ اور چوکھٹ کے پار تالیجو مندر کے دیران صحن میں بودی شاہ کے منتظر تھے۔۔۔

گویا یہ چوکھٹ ایمان اور کفر کی سرحد تھی جس پر ہم کھڑے تھے۔۔۔

کھینچنے ہے مجھے کفر۔۔۔

مندر میرے آگے۔۔۔

اگرچہ سُہری بابا یہ بیان دے چکے تھے کہ آخری عمر میں کیا خاک بٹ پرست

ہوں گے۔۔۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہم آخری عمر میں مسلمان ہو رہے تھے۔۔۔ کیا خاک

مسلمان ہو رہے تھے۔۔۔ اندر۔۔۔ مندر کے اندر۔۔۔ بودی شاہ ایک بے دام غلام کی طرح فرشی

ہنگولوں اور ہاتھ جوڑے رقص کے انداز میں ہتھ ہوئے دیوی دیوتاؤں کے چرنوں کو

ہنگولتا۔۔۔ ان چرنوں میں بھینٹ کئے ہوئے گیندے کے پھولوں کو سجدے کرتا جب ایک

لڑے لئے ہیبت ناک آفت نما دیوی کے سامنے ماتھا ٹیکتا اٹھا اور اٹھ کر خاصی دیر تک

بودی شاہ نے، کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی... کی نظر سے ہمیں دیکھا اور پھر ہمیں ایک پھرتی سے ہاتھوں اور فرشی بھگوانوں کو پھلانگتا بچپن کھڑکیوں والے عظیم محل کے پاس ایک یارڈ میں لے گیا جس کے پوشیدہ وجود کی خبر باہر سے نہ ہوتی تھی...

مندر کی ہتھیلی کائنات کا ایک کونے میں سے آہستہ آہستہ قدم دھرتے ایک نئے راستے پر قدم دھرتے جب ہم بائیں جانب ہوئے تو وہاں ایک عظیم الشان ناگ پھن پھلانے جیسے ہمیں کے لئے اُداس ہوتا تھا اور ہمارا منتظر ہوتا تھا کہ... وہاں آس پاس کوئی بلج نہ تھا... صرف ہم تھے... اور وہ ناگ تھا... اور وہ ناگ ایورسٹ کی برفوں کے پس منظر میں پھن پھیلانے کھڑا تھا۔

ایک سراسر خشک تالاب کے درمیان میں سے وہ سانپ دیوتا آٹھتا تھا... واسو کی ام کا سانپ سر اٹھاتا تھا اور اتنا بلند ہوتا تھا کہ اُس کے سٹہری پھن کے عقب میں ہالیہ کی درہنیں تھیں اُن پر بھی اُس کا سٹہری پن اثر انداز ہو کر اُن کی سفیدی میں زرد کرنوں کی آمیزش کرتا تھا۔

یوں لگتا ہے جیسے بھگتا پور کے مندروں کے شہر میں ایک زرافہ اپنی گردن مزید لہا کر کے آس پاس کا نظارہ کرنا چاہتا ہو... اور اُس زرافے کی گردن تھو تھنی سے ذرا اُدھر پٹی ہو کر پھیل گئی ہو۔

یہ شنید ہے... کہ یہ تالاب اتنا پوتر تھا کہ اس میں اشان کرنے کے لئے تبت اور ناس سے بھی پجاری آتے تھے...

اور دیکھا جائے تو یہ پجاری کوئی اتنا کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیتے تھے کہ یہ لوں ملک... نیپال کی قربت میں ہیں۔

تالاب کے ارد گرد مجتہدوں کی ایک زندہ ہوتی کائنات تھی۔

یہاں سے سات میل کی دوری سے زیر زمین پائپوں کے ذریعے تازہ پانی اس تالاب تک پہنچایا جاتا تھا تاکہ یاتریوں کے بدن کو اس دنیا کی میل سے صاف کیا جاسکے۔

میں اگر اس میں نہاتا تو میرے بدن کی میل سے تالاب کے پائپ بلاک ہو جاتے کہ میں نے سوائے اس دنیا کی میل کے اور کچھ حاصل نہ کیا تھا...

لیکن اب... اس لمحہ موجود میں... ہمارے سامنے جو واسو کی سانپ دیوتا کھڑا تھا...

اس دیوی کی فضیلت بیان کرتا رہا اور بالآخر پیچھے مڑ کر دیکھا... تو ہم نہ تھے...

اُس نے اپنی بودی کو ایک عالم حیرت میں سنوارا اور شدید حیرت ناکی سے اِدھر اُدھر نگاہ کی... پورے مندر کو اپنی مہین نشہ باز آنکھوں سے کھنگالا اور پھر ہمیں دریافت کیا جو ابھی تک چوٹ کے اُس پار کھڑے تھے۔

وہ جھکا جھکا ہمارے پاس چلا آیا ”صاحب آپ ادھر کیوں کھڑا ہے... امڈز کیوں نہیں آتا؟“

”بھئی بودی شاہ... سٹہری بابا نے نہایت مؤدب ہو کر کہا ”ادھر بورڈ پر درج ہے کہ ہندو لوگوں کے علاوہ داخلہ منع ہے...“

بودی شاہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ ہم کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں ”تو آپ بڑھ ہیں؟“

ظاہر ہے ہم نے ابھی تک بودی شاہ کے گوش گزار نہیں کیا تھا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں اور ہم تو وہاں ہیں جہاں سے ہمیں اپنی خبر بھی نہیں آتی...

”نہیں...“ سٹہری بابا جذبہ تقاخر سے سیدھے ہو گئے ”پاکستان... مسلمان“

بودی شاہ نے اپنی بودی اپنی ناتواں چنگلی میں بھر کر... اور وہاں بھرنے کے لئے چند بال ہی تھے... ذرا پریشان ہو کر کہا... اور ایسے کہا جیسے کوئی حسینہ اپنے ماتھے پر آئی لٹ کو

پریشان کرتی ہے اور اس شاہ صاحب کے گمان میں بھی نہ تھا کہ دنیا میں اُس کے عقیدے کے سوا کوئی اور بھی عقیدہ ممکن ہے... ”آپ تو گ...“ اور یہاں اُس نے درجنوں مشکل ناموں والے خداؤں کا تذکرہ کیا ”آپ لوگ... اُن کا پجاری نہیں ہے؟“

”نہیں...“

”آپ بدھ ہیں؟“

”نہیں...“

”تو آپ کس کے پجاری ہیں؟“

”ہم اب جس کے بھی پجاری ہیں ہمارے آباؤ اجداد صنم گرتے تھے... ہمارے کپے میں بھی... اگرچہ بتوں کی نسبت دور کی ہے لیکن ہے... بہر حال تازہ صورت حال یہ ہے کہ بت پرستی موقوف ہے...“

جس کے ارد گرد ایک زمانے میں سونے کے پانی میں نہائے ہوئے مجھے کھڑے تھے... اب یہ ایک ایسے کیکٹس کی طرح تھا اور پیاسا کھڑا تھا جس کے ارد گرد سوائے ایک لامتناہی صحرا کے اور کچھ نہیں۔

اُس کے پجاری، زخمت ہو چکے تھے۔

لیکن... یہ واسو کی سانپ دیوتا جانتا تھا کہ اُس کے پجاری سراسر زخمت نہیں ہوئے... وہ جانتا تھا کہ میں... جو اُس تالپو مندر کے اندر نہیں گیا اور کماری چوک کی کشش کے باوجود نہیں گیا اور اُس کے چوکھٹ پر ایمان سلامت رکھنے کے لئے ٹھہر گیا تھا صرف میں تھا... جو اُس کا پجاری تھا۔

میں نے اُسے... اور اُس نے مجھے پہچان لیا تھا...

یہ وہ ناگ تھا... جو مجھے ہر برس ڈستا تھا۔

یہ وہ سانپ تھا جس کے زہر کے بغیر میرا بدن ٹوٹتا تھا... میں سارا سال منتظر رہتا تھا کہ کب وہ مجھے ڈسے اور کب میرا بدن بحال ہو...

یہ آوارگی اور عشق خاص کا سانپ تھا جو ذرہ برابر لحاظ نہ کرتا تھا کہ میری عمر کیا ہے... میں اُس کے زہر کو سہار بھی سکتا ہوں یا نہیں... یہ لحاظ نہیں کرتا تھا... ایک نیا زہریلے کیکٹس کی مانند وہ ایک مدت سے خشک ہو چکے تالاب میں بلند ہو کر پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

”سائیں آجائیں۔“ سہری بابا کب کے اس ہیبت ناک سانپ کے بلند ہونے پھن سے تنگ آکر واپس اُس گولڈن گیٹ تک پہنچ چکے تھے جس کے اوپر پچپن کھڑکیاں جھکی ہوئی تھیں۔

میں اس مندر کے توبہ شکن ماحول سے باہر آیا تو باہر بھگتا پور چوک میں ابھی تک ہیون سانگ... مارکو پولو اور ابن بطوطہ گھومتے تھے۔

وہ تینوں اُس عجوبہ محل کو تکتے تھے جس میں پچپن کھڑکیاں کھلی آ نکھیں تھیں... اور ہر کھڑکی ایسی تھی کہ اُس کی قدامت اور کاریگری اگر تاج محل کے پیل بونوں سے بڑھ کر نہ تھی تو کم بھی نہ تھی...

لیکن یہ سب کی سب کھڑکیاں کھلی نہ تھیں... ان کے پٹ کھلے نہ تھے... مدت

سے بند تھے...

میں انہیں بھگتا پور کے چوک میں تادیر تکتا رہا کہ ان پچپن کھڑکیوں میں سے کوئی ایک کھڑکی تو کھلے... اور اُس میں سے کوئی شکل ایسی نظر آئے جو تصویر نظر آئے۔

اس لئے کہ میں کھڑکیوں کا شیدا تھا۔

کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک آوارہ گرد کے لئے... بے شک وہ عمر رسیدہ اور نکتہ ہو چکا ہو... کوئی نہ کوئی کھڑکی ضرور کھلتی ہے اور اُس میں سے ایک چہرہ، راکا پوشی کی برنوں میں ڈوبنے اور گم ہو جانے والے زرد ماہتاب کی طرح ایک پل کو دکھائی دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ... آپ نے ہمارا پانی پیا؟

لیکن یہاں... بھگتا پور میں... اُس کے دربار چوک میں... پوری پچپن کھڑکیوں میں سے کسی ایک کے کواڑ میرے لئے نہ کھلے۔

کوئی ایک کھڑکی تو کھل سکتی تھی... اور اُس میں سے ایک کماری... ایک لونگ لڈیس جھانک کر پوچھ سکتی تھی کہ... کون آیا پین لباس کڑے... لیکن کماری کھلم طور پر فوط الحواس تو نہ تھی جو ایک سٹیہائے جانے کی قربت میں ایک بوڑھے کو پٹ کھول کر بکھتی... اگرچہ وہ بوڑھا اپنے بھدے بدن میں ایک دل رعنار رکھتا تھا اور کماری سے ایسی ل نشیں اور عمر کے نقاد کو بھلا دینے والی باتیں کر سکتا تھا جو کوئی بھی نوخیز بھگت نہیں کر سکتا تھا۔

بھگتا پور کے تین بڑے چوک ہیں۔

دربار چوک...

تاؤ مادھی چوک...

اور دتہ تریا چوک...

ان تینوں چوکوں میں ایک خصوصیت ایسی تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا... میں دیکھ کر اگر آپ ٹائم پیسز کراس کر کے پچھلے زمانوں میں منتقل ہو جاتے ہیں اور آپ ابن بطوطہ، ہیون سانگ اور مارکو پولو وغیرہ نظر آنے لگتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پ کے سامنے جدید تہذیب کی کوئی علامت نہیں ہوتی... کوئی نیون سائن، کوکا کولا کے شمار، سائن بورڈ یا کوئی ماڈرن عمارت نہیں ہوتی اور عہد حاضر کا شاہدہ صرف اور صرف

ان بطوطہ بھی الگ الگ زمانوں کے ہیں... اور اگر وہ مجھے... ایک ہی زمانے میں بھگتا پور میں نظر آتے ہیں تو... کم از کم مجھے نظر آتے ہیں کیونکہ میں ایک سرد مزاج تاریخ دان اور مزاج محقق نہیں ہوں...

”تاؤ مادھی چوک...“ بودی شاہ اپنی مستی میں چلا جاتا ہے...

”کدھر ہے بھائی...“ سُہری بابا ہانپتے ہوئے کہتے ہیں ”ہم نے ابھی کھٹنڈو داہس

ہنچ کر ساڑھے چار بجے والی ایئر بس میں سوار ہونا ہے“

بودی شاہ کب ہماری شناختا تھا۔ وہ تو حالتِ نردان میں تھا...

لیکن ہم دربار چوک سے نکلے تو ایک منٹ میں تاؤ مادھی چوک کی وسعت میں

داخل ہو گئے۔

یہ ایک ایسا سکور تھا جس میں کل جمان معلق تھے...

یہ زمین پر نہ تھا کسی آسمان پر ٹھہرا ہوا تھا...

یہاں جو مندر، عمارتیں اور محل تھے ان کا زمین سے واسطہ کم تھا اور وہ افلاک

کے رشتے دار زیادہ لگتے تھے۔

تاؤ مادھی چوک میں جو آسمانی عجوبے تھے... انہیں دیکھ کر خیال آتا تھا کہ مصنف

ہابل کی یادداشت نے اُسے دھوکا دیا... اگر اُس نے کہا کہ بھگتا پور کے دربار چوک کو

دیکھنے کے لئے آدمی دنیا کی مسافت جائز ہے تو اُس کے ذہن میں تاؤ مادھی سکور تھا۔

ادب اور سیاست کی طرح... بلکہ ہر انسانی عمل کی طرح سیاحت میں بھی کچھ

”کلیشے“ ہوتے ہیں... یہ آرٹ اور فلم میں بھی ہوتے ہیں اور کردار اور کاروبار میں بھی...

تو سیاحت میں اگر ہم عمارتوں تک ہی محدود رہیں تو دیا میں صرف تاج ہے۔ اہرام اور

انقل ٹاور ہے... گلوبل سٹیٹ بلڈنگ اور سڈنی کا آپرا ہاؤس ہے... نیلی مسجد

اور کلیسا سینٹ پیٹرز ہے... کبوڑیا کے مندر اور مونجو ڈارو کے کھنڈر ہیں... ان کے سوا

اور کچھ نہیں۔

لیکن ان کے سوا جو کچھ ہے جو ”کلیشے“ نہیں ہے۔ ان سے کہیں بڑھ کر ہے...

ایک طویل فہرست ہے... پیڑا کا گلاب شہر اُردن میں ہے... شہر ہابل کے

ردازے عراق میں ہیں... پارس پالس کے سوختہ کھنڈر ایران میں ہیں، مینارِ جام اور غزنہ

ان میں گھومتے سیاحوں کے لباس اور کیمروں سے ہوتا ہے۔ اگرچہ یہاں سیاحوں کے لئے تمام تر سہولتیں موجود ہیں... بین الاقوامی ٹیلی فون اور فیکس، پوسٹ آفس، ریسٹوران، کافی شاپس، ہاتھ رومز، سوئیٹر شاپس، ہر شے موجود تھی لیکن اوجھل اور اشتہاری پنا سے عاری... یہ سہولتیں مندروں اور محلوں کی چار دیواریوں کے ساتھ پڑانے گھروں اور برآمدوں میں یوں پوشیدہ ہیں کہ ان کا وجود ان چوکوں کی قدامت میں مغل نہیں ہوتا۔

اسی لئے تو ابن بطوطہ اپنے لمبے چوٹے کے ساتھ دربار سکور میں موجود ہے اور پچپن کھڑکیوں والے اُس محل کو دیکھتا ہے جسے یونیسکو نے ورلڈ ہیٹریج ایچ کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ وہ نہ صرف اُسے دیکھتا تھا بلکہ گولڈن گیٹ، ناگ دیوتا کے قدموں میں اُٹلتے سُہری فوارے، بٹ سالہ مندر، کشمی مندر اور مٹی کے مندر کو بھی دیکھتا تھا۔

اگرچہ چینی راہب ہیون سانگ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنے وطن سے بدھ یا ترا کے لئے نکلا تھا اور پاکستانی شمال کے راستے ادھر آیا تھا... دریائے سندھ کے کناروں پر جو بلند چٹانیں تھیں ان کے خوفناکی سے پچتا وادی سوات اور نیگلسلا آیا تھا اور پھر بودھ گیا کی زیارت کو پہنچا جہاں گوتم نردان پا کر بدھ کے رُتے کو پہنچا... اُس تالاب پر

سجدہ ریز ہوا جہاں ملکہ مایا نے درخت کی ایک شاخ کو تھام کر گوتم کو جنم دیا تھا اُس نے گوتم کی راجدھانی جسے اُس نے تیاگ دیا تھا، کپل وستو کی بھی زیارت کی اور وہ اپنے سفر نامے میں کہتا ہے ”یہ شراب مفتوح ہے اور ایک وسیع کھنڈر ہے“ اگرچہ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ ہیون سانگ جب وہاں آیا تھا تو کپل وستو کے محلات کا نام و نشان تک نہ تھا۔

شاہ سدھو دانا... جو کہ گوتم کا باپ تھا اُس کا محل کب کاروپوش ہو چکا تھا... اور وہاں ایک خانقاہ کے کھنڈر تھے جنہیں ہیون سانگ کپل وستو کے محلات سمجھ بیٹھا... لیکن میرا خیال ہے کہ ایک سفر نامہ نگار کو اتنی سی تو چھوٹ دینی چاہئے کہ وہ اپنے عقیدے اور فینٹی کو بروئے کار لا کر وہ کچھ دیکھ لے جو وہاں موجود نہیں ہے جو تاریخ دانوں اور محقق حضرات کو نظر نہیں آتا...

چنانچہ حقائق کی نظر سے دیکھا جائے تو ہیون سانگ بھگتا پور میں ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی تعمیر سے ایک صدی پیشتر یہاں آیا تھا... اور اگر میں اُسے بھگتا پور میں دیکھتا ہوں تو سفر نامہ نگار کی اُس چھوٹ اور فینٹی کا سہارا لیتا ہوں... یوں بھی مارکو پولو اور

لوگ تھے۔ ان کے لئے رب کائنات نے خصوصی طور پر گھنٹیوں کا زنگ اُتارا اور پھر اُن کی آواز کل عالم میں گونجی اور ایک جہان کو مسحور کیا۔
لیکن ہم تو منتظر ہی رہے... زنگ نہ اُترا... نہ کوئی آواز سنائی دی... کہ ہم رائدہ درگاہ تھے... کمزور اور کینے لوگ تھے۔

کوئی ایک ہلکا سا جھونکا بھی ہماری جانب نہ آیا...
ہم وجد میں نہ آسکے... بے اختیار نہ ہو سکے...
تو اُس میں تصور کس کا تھا... جو اختیار میں تھا... یا وہ... جن کے اختیار میں کچھ نہ تھا ہم ٹھہری ہوئی ساکت زنگ آلود گھنٹیوں کے کھنڈر منتظر رہے اور بادِ نسیم کا کوئی ایک جھونکا بھی ہمارے جانب نہ آیا... تو تصور کس کا تھا؟
بودی شاہ ہمارے ساتھ باتیں کرتا جاتا تھا...
اُس کا خیال تھا کہ وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا ہے...
کیونکہ ہمارے پلے اُس کی کوئی کوئی بات پڑتی تھی...
اور یوں بھی وہ مگن اور بڑبڑاتا ہوا چلتا تھا...

اور جب کبھی کسی مندر کی اُونچائی بیان کرتا تو اپنی بودی چٹکی میں بھر کر اُسے بلند کر دیتا اور جب اُسے کسی چھوٹی شے کا ذکر کرنا ہوتا تو وہ جھک کر فرش کے قریب اپنی ہتھیلی لے جاتا... چنانچہ میں اگر نیپالی اور بھگتا پوری دیو مالا کے قصوں کو قدرے گڈڈ کر دوں تو اس میں میرا نہیں بودی شاہ کا تصور ہو گا...

تو یہ بودی شاہ ہمیں نیاتا پولا مندر کے سنو پائما سٹر پکچر کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یہ مندر جتنا ہمیں دکھائی دے رہا تھا اتنا ہی... اتنی ہی منزلیں زمین کے نیچے تھیں جو دکھائی نہیں دیتی تھیں... اگر اس کی پانچ منزلیں تمہ در تمہ اُوپر اُٹھتی تھیں تو بھگتا پور کی زمین کے اندر بھی اس کی اتنی ہی منزلیں اُترتی تھیں... اور اُن کے اندر ایک اندرونی اور اوجھل ایک معبد ہے جس میں بہت نیچے ہوئے بھگت ہی پہنچتے ہیں۔ اور وہاں زیر زمین ایک ماہیش مروانی سدھی لکشی کا ایک ایسا مجسمہ ہے جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے... اور جو بھی اُسے دیکھتا ہے وہ چُپ ہو جاتا ہے، کسی سے کچھ نہیں کہتا کیونکہ وہ سدھی لکشی کے حُسن کا اسیر ہو جاتا ہے... حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ سدھی لکشی کو مندر

کے دروازے افغانستان میں ہیں... وادی چلو اور شگر کی خانقاہیں اور مسجد بھونگ پاکستان میں ہے اور... نیاتا پولا کا مندر بھگتا پور میں ہے...
اسی تاؤ مادھی سکور میں... نیاتا پولا کی سرخ چھتیں زینہ زینہ... بلند ہو کر آسمان کو چھوتی تھیں۔

اور اُس کی پہلی منزل بھی تاؤ مادھی چوک سے بہت بلند تھی... اور وہاں تک پہنچنے کے لئے سینکڑوں سیڑھیوں کو طے کر کے جانا پڑتا تھا... اور ان سیڑھیوں کے آغاز میں دونوں جانب دو سنگی ہاتھی پہرے دار تھے... اگرچہ نیپالی بچے ان ہاتھوں کی پوترتا کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اُن پر سواری کرتے تھے اور اُنہیں اپنے ننگے اجسام سے دھکیلتے ہوئے یہ خواہش کرتے تھے کہ وہ چلنے لگیں لیکن وہ ساکت تھے... کہ صرف عقیدہ اور پختہ عقیدہ ہی ایک ایسا چابک ہے جو ہتھم کے بنے ہوئے ہاتھوں کو حرکت میں لاسکتا ہے۔

نیاتا پولا کا یہ حیرت ناک معبد تین سو برس پیشتر بھونپندر مالا نے تعمیر کیا تھا...
بے شمار کھڑکیاں... جو ہمالیہ کے برفانی منظر کو دیکھ نہ سکتی تھیں... کہ وہ سب کی سب اندھی تھیں... بند تھیں۔

اور اسی مندر میں سینکڑوں کے حساب سے وہ گھینٹیاں تھیں جنہیں ”ہوائی گھینٹیاں“ کہا جاتا ہے... یعنی... بادِ نسیم کا کوئی ایک ہلکا سا جھونکا ادھر بھگتا پور میں آنکے تو یہ سب کی سب بے اختیار ہو کر وجد میں آتی ہیں... اور بجنے لگتی ہیں۔
ہم سب اپنی حیات میں اُسی ایک جھونکے کے منتظر رہتے ہیں۔

ہمارے وجود کی گھینٹیاں زنگ آلود ہو جاتی ہیں اور اُن کی زبانیں آہنی تالوے چپک جاتی ہیں اور وہ جھونکا نہیں آتا جو ہمارے بدن کو... ہماری حیات کو مترنم کر دے...
کیا یہ انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ اپنے بدن کے اندر زنگ آلود گھنٹیوں کے وجود سے آگاہ ہوتا ہے اور پھر اُن کی آواز سننے کے لئے کیا کیا کشت کاٹتا ہے۔
کبھی بودھ گنیا میں ڈھونی رمانا ہے... اور کبھی غارِ حرا میں قیام کرتا ہے... کبھی زرتشت کی مانند آگ جلاتا ہے... صحرائے سینا میں نکل جاتا ہے اور کبھی مصلوب ہو جاتا ہے... صرف اس لئے کہ اُن زنگ آلود گھنٹیوں کی آواز سن سکے... اور یہ سب کے سب پہنچے ہوئے

اسی لئے سُہری بابا کو مہم یقین تھا کہ ساڑھے چار بجے والی ایئر بس پر کم از کم ہم یہ ہوں گے کہ تارڑ کے چرنے پر دیوانگی کے آثار ہیں، ہم بھگتا پور میں دیر کر دیں گے۔

”دیر ہو رہی ہے تارڑ صاحب...“ سُہری بابا نے اپنی کلائی آگے کر کے گھڑی دکھائی اور وہ مجھے نظر نہ آئی... کہ نظر میں صرف بھگتا پور کے زمین و آسمان تھے۔

اس تاؤ مادھی چوک میں... وہ چھوٹے چھوٹے ریسٹوران اور کیفے تھے... سوڈنیر ٹاپس اور ایک کشمیری شالوں کی دوکان تھی... جو قدیم عمارتوں کے اندر اُن کی قدامت کو بروج نہ کرتے ہوئے اس چوک پر کھلتے تھے... اور ریسٹورانوں کی گیلریوں میں ہم پر نظر کرتے ایسے خوش بخت سیاح تھے جن کی میزوں پر نیپالی خوراک اور ڈینش بیئر تھی اور اُن کی جیبوں میں کوئی ایسا ایئر لائن ٹکٹ نہ تھا جس پر یہ درج تھا کہ آج دوپہر ساڑھے چار بجے تم نے نیپال چھوڑا جانا ہے... اور ہماری جیبوں میں وہ ٹکٹ تھا... وہ ہمارے بودی شاہ کی مانند شانت اور سست دوپہر کے کھانے کے بعد نیچے اُن سیاحوں کو ٹک رہے تھے جن میں ایک بھدے بدن کا بے ڈول شخص تھا۔ دوسرا ایک باریش اور چست آدمی تھا اور اُن کے آگے آگے ایک بودی شاہ جنتر منتر پڑھتا چلا جا رہا تھا۔

میں اپنے خیال میں اس امکان کو لایا کہ اگر مجھے آج دوپہر کہیں نہ جانا ہو اور میری جیب میں جو ٹکٹ ہے اس پر آج کی ٹرن نہ ہو اور میں بھگتا پور کی چوٹی بالکونیوں میں اطمینان سے ایک ریسٹوران میں پاؤں پیراے بیٹھا رہوں تو یہ کیسا تجربہ ہو... یہ جیسا بھی تجربہ ہوتا اس میں یقیناً شانتی اور ٹھہراؤ اور قدامت ایسی ہوتی کہ شاید میں ایک سراسر مختلف انسان ہو جاتا... میری جنون بدل جاتی...

لیکن میرے پاس چو نچلوں کے لئے وقت کہاں تھا... ہم تو قدیم الفرصت لوگ تھے... اہم اور مشہور لوگ تھے اور بگلا بھگت بن کر بھگتا پور آئے تھے... ہمارے پاس ایسے چو نچلوں کے لئے وقت کہاں تھا...

میں اگر بگلا بھگت نہ ہوتا... ایک ٹانگ پر کھڑا جھوٹ موٹ آنکھیں بند کئے شہرت اور عزت کی مچھلیوں کی تاک میں نہ ہوتا... سچ سچ کا... زعفرانی چوٹے میں اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتا ایک معصوم سا بھگت ہوتا تو یقیناً نیا پولا کے زیر زمین معبد میں اتر کر دیوی کے جن چھوٹا اور آج کی شب بھگتا پور کی سیڑھیوں پر دیئے جلاتا اور اُن کی لو اُڈی رکھتا...

کے بلند ترین سنگھاسن پر براجمان نہیں کیا گیا بلکہ اُسے نیر زمین جہاں سے مندر کی بنیاد اُٹھائی گئی ہے وہاں پوشیدہ کیا گیا ہے...

مجھے نیاتا بولا مندر کا طرز تعمیر بے حد تہی لگ رہا تھا... اور یہ ایک قدرتی امر تھا کہ سرحد پار تبت تھا... جیسے ترشنگ کی مسجد میں لداخنی رنگ نمایاں تھے...

مندر کے باہر بھگتا پور کے داستاوی پہلوان ماں اور پنا مجستوں کی صورت میں پہرا دے رہے تھے... کہا جاتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک میں دس ہاتھیوں کے برابر زور تھا۔

اگرچہ بودی شاہ باتیں کیا جا رہا تھا لیکن میرا بڑھیاں ابھی وہیں اٹکا ہوا تھا جہاں نیاتا پولا کی زیر زمین منزلوں میں ایک ایسا معبد تھا جس میں سیدھی لکشمی کا بت تھا... اور اُس بت طناز تک پہنچنے والے بھگت اُس پر فدا ہو جاتے تھے...

اس حساب سے تو ہر شخص کے بدن کی زیر زمین منزلوں میں کوئی نہ کوئی بت پوشیدہ ہوتا ہے... کوئی نہ کوئی سیدھی لکشمی براجمان ہوتی ہے... کسی کے اندر شاہ گوری کے ڈیرے ہوتے ہیں، کوئی اپنے بینک بیلنس کی لکشمی کو سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے... اور کوئی زہد اور تقویٰ کے تکبر کو ایک بت کی صورت پوجتا ہے اور دوسروں کو حقیر جانتا ہے۔ بودی شاہ... سر جھکائے اپنی بودی جھکائے اس آس میں بھی بولتا چلا جاتا تھا کہ بالآخر اُسے اُس کے بولنے کی مناسب قیمت ادا کی جائے گی لیکن اس کے باوجود اُس کے انداز میں کوئی خوشامد کوئی چالپوسی یا ڈپلو میسی نہ تھی... جو خاصا ہے دنیا بھر کے گائیڈز کا... اگر ہم دن کے اختتام پر اُسے ایک پیسہ بھی نہ دیتے اور ”تھینک یو بودی شاہ“ کہہ کر چلے جاتے تو وہ پھر بھی انتہائی مطمئن بودی شاہ ہوتا اور اپنی بودی سلالتا ہوا چلا جاتا...

سُہری بابا البتہ ایک متفکر بے بسی کے ساتھ بار بار اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے تھے کیونکہ وہ میرے چہرے پر دیوانگی کے وہ آثار دیکھ رہے تھے جو کسی بھی سیاح میں تب نمودار ہوتے ہیں جب وہ اپنے سامنے کسی ایسی عمارت یا منظر یا شکل کو پاتا ہے جو اُسے یہ کہتی ہے کہ اب تم نے کہاں جانا ہے... یہیں ٹھہر جاؤ، قیام کرو... اور بس مجھے دیکھو...

بھگتا پور دراصل ایک دھوکا پور تھا جس کے فریب میں آیا ہوا سیاح کسی اور منزل کی جانب کوچ کرنے کے ارادے ترک کر دیتا تھا...

ذرا بہیدہ تھے... ان کے مکان اور آماجگاہیں ایک قدیم زوال کی نشانیاں تھے... ایک تھڑے پر بھگتا پور کے مشہور زمانہ مٹی کے برتن بچے تھے... دیئے اور مرتان... ہانڈیاں اور تیل کے ٹوٹے... اور ایک بوڑھی نیپالن جسے آنکھوں سے کچھ بھائی نہ دیتا تھا وہ ان برتنوں کو ٹٹل ٹٹول کر ان کی قیمت بتاتی تھی۔

سبزی کی دوکانیں، انڈین فلم شارز کے پوسٹر، فوڈیو کی دوکانیں، نیپالی حکیم جو ہارے یونانی دواخانوں کے شانہ بہ شانہ مایوس مریضوں کے لئے قوت مردی کی نوید دیتے تھے... ٹورسٹ ایجنسیاں اور پرجون کی دوکانیں جہاں سے آپ بھگوانوں کے لئے چاول زعفران اور تیل حاصل کر سکتے ہیں...

میں اگرچہ بھگتا پور کی قدامت کی دیوانگی کے زیر اثر تھا لیکن یکدم مجھ میں ایک سراسیمگی اپنے نچے پھیلانے لگی... کہیں ایئر بس مس نہ ہو جائے... میں اگرچہ دیوانہ ہو چکا تھا لیکن بہ کار خویش ہو سیا تھا... میں اتنا دیوانہ بھی نہ تھا۔

بودی شاہ جو کچھ کہتا تھا وہ ہمارے سر پر سے گزر جاتا تھا شاید اس لئے کہ ہمارے سر پر بودی نہ تھی... لیکن تاؤ مادھی چوک کے بعد... بھگتا پور کے بازاروں اور گلیوں میں سے گزرنے کے بعد ایک مقام پر... جہاں دائیں جانب ایک اور دادی کی ہریا دل اور پہاڑ نظر آتے تھے بودی شاہ ٹک گیا اور کہنے لگا "اُدھر وہ پہاڑ دیکھتا ہے؟"

"ہاں... دیکھتا ہے۔" میں نے کہا... "اس میں دیکھنے والی کیا بات ہے... بس پہاڑ ہے..." شہری بابا بہت بور ہو چکے تھے...

"صرف پہاڑ نہیں صاحب..." بودی شاہ اُسے ایسے تک رہا تھا جیسے ہلیری اور تن زنگ نے ایورسٹ پر قدم رکھنے سے پیشتر اُسے ایک تقدس سے دیکھا ہو گا "یہ وہی پہاڑ ہے جسے ہنومان جی اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لے گئے تھے۔"

میں نے بہت بچپن میں ہنومان جی کو گوالمنڈی چوک میں دیکھا تھا... میں شاید پانچ برس کا بھی نہ تھا... اور ایک موہوم سی یاد ہے کہ منڈیروں اور چھتوں پر... کرشنا گلی، گاندھی سکور اور نسبت روڈ کے تمام درو دیوار پر مٹی کے دیئے لاہور

خیر ہو تیرے بھگتوں کی... آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُدنی رکھیں لو... تاؤ مادھی سکور میں... زندگی کا بہاؤ بہت دھیرے سے بہتا تھا... یہ نیا دھیرے بہتی تھی...

اس میں اتنی آہستگی تھی... کہ انسان نہ صرف اپنی بلکہ قریب سے گذرتے کسی بدھ بھکشو کے دل کی آواز... قدرے مدہم سہی... سن سکتا تھا... بودی ہمارا چلتا جا رہا تھا۔

"ہیلو... شہری بابا نے صدا بلند کی "بھگتا پور تو دیکھ لیا ہے... اب کدھر جاتا ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے اپنی بودی کو اٹھا کر اُسے ذرا ہوا لگوائی "ابھی تو نیچے مانسری ہے۔ داناری کا مندر ہے... پی کاک وینڈو ہے... سب ٹورسٹ لوگ اُسے دیکھتا ہے... ابھی اُسے دیکھے گا۔" وہ چلتا گیا۔

"آرڈر صاحب۔" شہری بابا نے میرا بازو تھام کر کہا "آپ بہ قائمی ہوش و حواس میری بات سن رہے ہیں؟"

"کیوں... مجھے کیا ہوا ہے؟"

"آپ کچھ لاپرواہ سے لگ رہے ہیں۔ لیکن ہم نے بھگتا پور کافی نہیں دیکھ لیا؟"

"شہری بابا... اس بے چارے بودی شاہ کا دل توڑنا مناسب نہیں... اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اُس کا دل توڑ دیا اور اس کی بات نہیں مانی تو اس کی بودی ہمیشہ کے لئے گر جائے گی... تو کیا قباحت ہے اگر ہم ایک آدھ مانسری اور پی کاک وینڈو دیکھ لیں۔"

"شاید ہم اپنی ایئر بس مس کر جائیں؟"

"تو تین روز بعد چلے جائیں گے۔"

"بس مجھے یہی خدشہ تھا۔" شہری بابا نے ایک ذاکر کی طرح سینے پر دو ہتھ مار کر کہا "آپ پر اثر ہو گیا ہے..."

ہم بودی شاہ کی قیادت میں مندروں، محلوں اور عبادت گاہوں کے عظیم جھرمٹ میں سے یکدم بھگتا پور کے عام بازاروں اور گلیوں میں آگئے... اور یہ کوچے بھی ذرا

کی رات میں آسمان سے اترے بچھتے ستاروں کی طرح جھللاتے ہیں... گوالمنڈی چوک میں مٹھائیوں کے بڑے بڑے تھال سڑک کے درمیان تک بچے ہیں اور اُن میں بھی دیئے جل رہے ہیں... مجھے ہندو یاد نہیں لیکن ہندوؤں کی دیوالی کی کوئی رات میری یادداشت میں مرتے ہوئے جگنوؤں کی مانند ٹٹماتی ہے... مٹھائی کے ان بڑے بڑے تھالوں میں جو ہندو دیوالائی تصویریں جتی تھیں میں نے وہیں ہنومان جی کو دیکھا تھا... ان بندر شاہ کو میں نے آسمانوں میں پرواز کرتے ایسے دیکھا تھا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنی ہتھیلی پر اس احتیاط سے رکھے اُڑان کرتے تھے جیسے وہ ایک بلیک فارسٹ کیک ہو...

”تو یہ پہاڑ تو ابھی یہاں ہے یا را... تو ہنومان جی اسے واپس رکھ گئے تھے۔“ یہ سُہری بابا کا سوال تھا۔ لیکن اُن کا سوال بے جا تھا...

دیوالائی سائنسی توجیہ ممکن نہیں... یہ وہ خواب ہوتے ہیں جن میں حقیقت کا کوئی نہ کوئی ذرہ کسی گزرے زمانے میں ضرور موجود ہوتا ہے... اور پھر حقیقت کے اس ایک ذرے کو انسان... صدیوں کے سفر کے دوران، عقیدے اور احترام کی ناپیدائی سے دیکھتے ہوئے اُس ایک ذرے کو ایک کائنات بنا دیتے ہیں اور اُس پر اپنے یقین کی مٹرگا کر اُسے ناقابل تردید قرار دے دیتے ہیں... یہ تقریباً ہر مذہب میں ہوتا ہے... دیوالائیوں نے ہندو یا بلذہ ہو اُسے آپ توجیہ کی سرچ لائٹ کے نیچے رکھ کر نہیں پرکھ سکتے... یا تو آپ اُس پر یقین رکھتے ہیں... یا نہیں رکھتے... اور تیسرا راستہ اُس میں سے کسی قوم یا مذہب کی تاریخ اور عقائد کو ہمدردی سے سمجھنے اور اُسے اپنی تحریر میں ایک استعارے کی شکل میں آج کی حقیقتوں کو بیان کرنے کا ہوتا ہے... آپ اُس کا تسخیر نہیں اُڑا سکتے کہ آپ کے نیچے بھی ایسی زمینیں ہو سکتی ہیں جنہیں چنچل کیا جا سکتا ہے...

چنانچہ ہنومان جی اگر ایک پہاڑ اپنی ہتھیلی پر اٹھا کر فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں تو آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ سر آپ ایوی ایشن فیول کے بغیر کیسے اُڑان کرتے ہیں اور جب آپ لینڈ کریں گے تو کیا یہ کمپیوٹر کے ذریعے خود کار یعنی آٹومیٹک لینڈنگ ہوگی اور کیا آپ کی لینڈنگ کے لئے ایک ایئر سٹریٹ ضروری ہے یا آپ جنگلوں صحراؤں میں بخوبی اتر جائیں گے... کریش لینڈنگ کے بغیر...

بھگتا پور کی شانتی اور ٹھراؤ میرے قدموں کو ست کرتے تھے... اور سُہری بابا

میرے قدموں پر کڑی نظر رکھتے تھے...

جیسے ونس کی آبی گلیوں میں انسان کاہل اور لاپرواہ ہو جاتا ہے... ٹوریا کی شام میں اُترتا ہے ایک طویل نیم صحرائی سفر کے بعد تو وہاں سے کوچ کرنے کو جی نہیں چاہتا... ہرات کے طلوع آفتاب کے سامنے ایک چرسی کی مانند گم گم بیٹھا رہتا ہے۔ کوہ آرا رات کے دامن میں کسی بستی کے گھر سے سرشام دھواں اُٹھتا دیکھتا ہے تو وہیں سب کچھ تیاگ کر ٹھہر جانا چاہتا ہے... یا بیانو گلیشنز کے اُوپر ایک چٹان میں پوشیدہ شکاری جھوپڑے میں زندگی کے کچھ دن ایک برفانی تنہائی میں گزارنا چاہتا ہے... ہر سٹیج... ہر کوہ نور پر کسی نہ کسی مقام پر یہ سُستی اور ٹھراؤ وارد ہو جاتا ہے... وہ اپنی دربدری اور خانہ بدوشی سے تنگ آ جاتا ہے اور اپنا خیمہ جلا کر کسی ایک بستی ایک منظر میں آباد ہو جانا چاہتا ہے... یہ آوارہ گرد کسی اسکولے میں اپنی آوارگی کی بے معنویت سے عاجز آ جاتا ہے اور اُسے ترک کر کے بس وہیں رُک جانا چاہتا ہے... اور اُسے اِس سُستی اور ٹھراؤ کے خلاف ایک جنگ کرنا پڑتی ہے... اپنے آپ کو لہن طعن کرنا پڑتی ہے کہ... اُٹھو اپنا خیمہ سمیٹو... اپنا سامان اکٹھا کرو کہ تم اپنے قبیلے سے کیسے بغاوت کر سکتے ہو... تمہارے خیمے کے گرد گھاس اُگ آئی ہے تو اب تم کس منہ سے یہاں ڈھیٹ بن کر ٹھہر سکتے ہو... کوچ کرو... تمہارے لئے ابھی اور بستیاں ہیں جن تک تم نہ پہنچے تو وہ کھنڈر ہو جائیں گی... اور جھیلیں ہیں جہاں تمہارے قدم نہ گئے تو وہ خشک ہو جائیں گی... کوچ کرو...

یہی کیفیت مجھ پر بھگتا پور میں وارد ہوئی...

پی آئی اے کی ایئر لائن نے مجھے اس دیوالائی طلسم سے نکال کر مستقبل کے کسی اور بھگتا پور میں لے جانا تھا... ابھی کوئی اور جھیل بھی تھی جسے میں نے خشک ہو جانے سے بچانا تھا۔

بودی شاہ چلتا جا رہا تھا... ہنومان جی کے پہاڑ کو دکھا کر چلتا جا رہا تھا اور ابھی تک وہ مانسری وہ راہب خانہ وہ چوک نہیں آ رہا تھا جس کا اُس نے وعدہ کیا تھا کہ ابھی آ جائے گا...

”تارڑ صاحب دیر ہو رہی ہے۔“ سُہری بابا نے طلسم کے اُس تانے بانے کو توڑ

دیا جو بھگتا پور کی دیوالائی فضا میرے گرد بن رہی تھی۔

قدیم عمارتوں کو ایک نظر دیکھ کر انہیں بیان کرنا آسان نہیں... کہ آپ انہیں ایک آرکیٹیکٹ کی تکنیکی نظر سے نہیں دیکھتے کہ اس پر کونسی صدی کی ثقافت کے آثار نمایاں ہیں اور اس کی بنیادوں میں اینٹ روڑے اور سینٹ کی کیا شرح ہے اس پر جو تعمیرات تعمیر کی گئی ہیں وہ وہاں کیسے نصب کی گئی ہیں... استنبول کے ہاگا صوفیہ کا ناقابل یقین گنبد جب تعمیر کے مرحلوں میں تھا تو جب تک اُس کا لینتھر نہیں کھلا تھا اُسے سارا دینے کے لئے کیسے ستون بنائے گئے تھے... اور کتنے دنوں بعد جب اُس کی آخری اینٹ جڑی تھی تو ان ستونوں کے سہارے کو ہٹایا گیا تھا... شالیمار کے فواروں میں جو پانی اُبلتا ہے اُسے کیسے پریشردیا گیا تھا... یا تاج محل کے تناسب دریائے جمنا کے حساب سے کیسے حساب کئے گئے تھے...

آپ تو ان عمارتوں کو... اُس ایک لمحے میں دیکھتے ہیں جب ایک کُوپے سے نکلے ہیں تو وہ سامنے آجاتی ہیں... اور اُس ایک لمحے کے مشاہدے کو لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں... اور اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ قدیم عمارت وہ نہیں ہوتی جو آپ بیان کرتے ہیں... کہ آپ کے بیان کی حدود صرف ایک لمحے میں مقید ہوتی ہیں... ہاگا صوفیہ میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کا منہ کھل جاتا ہے اور آپ کہتے ہیں یہ گنبد نہیں ایک اور آسمان ہے... اور ابھی فرشتے اُتریں گے... کسی صحیفے کا نزول ہو گا... شالیمار میں آپ کو Pale hands beside the Shalimar نظر آتے ہیں۔

اور تاج اگرچہ میں نے دیکھا نہیں... لیکن سنا ہے کہ وہاں مرنے کی خواہش شدید ہو جاتی ہے اور چاندنی کے غبار میں وہ ہر شب آپ کی نظروں کے سامنے دوبارہ تعمیر ہوتا ہے اور صرف آپ کے لئے وجود میں آتا ہے۔

وہ تریا سکور میں جو عمارتیں اُس ایک لمحے میں سامنے آئیں وہ ہاگا صوفیہ، شالیمار یا تاج کے ہم پلہ تو ہرگز نہ تھیں لیکن اُن میں فنا سے پرے کی کی ایک جاذبیت ایک کشش ضرور تھی۔

اس سکور میں داخل ہوتے ہی جو ایک سیاہ پڑتا لکڑی کا عجوبہ نظر آیا کہ وہ ایک راہب خانہ یا مانسٹری نہ لگتا تھا کسی متروک دیوتا کا گھر لگتا تھا جس میں وہ اپنی

میں اُلجھا ہوا باہر آیا ”سُہری بابا اگر ہم آج اُس ایئر بس میں سوار نہ بھی ہوئے تو دنیا کی تاریخ میں کیا فرق پڑے گا... ہماری زندگیوں میں کیا فرق پڑے گا... آپ اسلام آباد میں ٹیلی ویژن کے ہیڈ کوارٹر کے سفید عقوبت خانے میں قید ہونے کے لئے کیوں بے چہین ہیں... میں کاہے کو لاہور کی آلودگی اور گندگی میں سانس لینے کے لئے... اپنے گھر کی آسودہ جھیل کا پھر سے قیدی بننے کے لئے بھاگ دوڑ کروں... ریلیکس...“

شاید اس ٹرپ میں پہلی بار سُہری بابا کو احساس ہوا کہ میں وہ نہ تھا جو پچھلے کئی روز سے اُن کے شب و روز اور قمار خانوں اور تھممل بازاروں میں اُن کے ساتھ تھا... میں کوئی اور تھا...

میری شکل بدل چکی تھی... میرے آوارہ گرد اور ناقابل اعتبار کردار کا یہ رُخ پہلی بار اُن کے سامنے آ رہا تھا۔

اور میں نے بہت سے دوست اور ہمدرد زندگی میں اسی طرح گنوائے کہ وہ مجھے ایک مددگار اور نہایت سر جھکا دینے والا شخص سمجھتے رہے... جو کہ میں ہوں... لیکن کسی ایک لمحے میں... جو میری گرفت میں نہ ہوتا تھا... مجھ پر وارد کر دیا جاتا تھا، میں یکدم باہمی ہو جاتا تھا، انکاری ہو جاتا تھا... میرا خون سفید ہو جاتا تھا اور میں کہتا تھا... ”نہیں...“ وہ مجھے سمجھاتے تھے اور میں پھر کہتا تھا ”نہیں...“ اور وہ مجھ سے بدظن ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دیتے تھے کہ اس شخص کا کوئی دین ایمان نہیں... یہ بلاشبہ اچھا لکھاری ہے لیکن دوبارہ بلاشبہ اچھا انسان نہیں...

لیکن سُہری بابا اُن سے سیانے تھے وہ میری سیما صفت طبیعت کو بھانپ گئے، اُنہوں نے اپنا رد عمل ظاہر نہ کیا اور صرف اتنا کہا ”سائیں ایئر بس کا کیا ہے، ہفتے میں چار پانچ بار کراچی جاتی ہے... آپ موج کرو“

ہم بالآخر ایک تنگ کُوپے سے نکلے اور اس کُوپے میں ایک خاص بات تھی کہ اُس میں ایک پرانی عمارت میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جس کے بورڈ پر لکھا تھا... ”ہماری کھڑکیوں سے ہمالیہ دکھائی دیتا ہے اور بھگتا پور دکھائی دیتا ہے اور یہاں آپ کے آرام میں کوئی محل نہیں ہو گا...“ تو اس تنگ کُوپے سے نکلے اور بالآخر نکلے تو بھگتا پور کے تیسرے چوک یعنی وہ تریا سکور میں داخل ہو گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد دن گزارتا تھا اور پچھلے پہر اچھے دیوتاؤں کی طرح جو کبھی بیورد کرتے رہ چکے تھے، پچھلے پہر... گالف کھیلتا تھا... اور بودی شاہ کا کہنا تھا کہ بھگتا پور میں جو بھی ٹورسٹ آتا ہے اسے ضرور دیکھتا ہے۔

چنانچہ ہم نے بھی اسے ضرور دیکھا۔

ایک اور تہہ در تہہ ایک بڑے اور قدیم جنگل میں جتنے درخت ہو سکتے ہیں ان کی لکڑی سے تراشا ہوا ایک عجائب خانہ جس میں بے شمار گیلریاں تھیں اور کھڑکیاں تھیں۔ اور ان کھڑکیوں میں سے راہب اور پجاری جھانکتے تھے اور اس کی میڑھیوں پر بے شمار سیاح بیڑ کے ٹن تھانے مزے کرتے تھے...

اس راہب خانے کے باہر بھی وہی دو پہلوان پہرا دے رہے تھے... آپ انہیں نیپال کے گاما اور امام بخش کہہ سکتے ہیں۔

دو تریا کی تکنیکی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ تین دیوتاؤں کی آماجگاہ ہے...

یعنی ریٹائرمنٹ کے بعد پچھلے پہر گولف کھیلنے والے تین دیوتا یہاں رہائش رکھتے تھے... سب سے اعلیٰ گریڈ کا... تخلیق کا دیوتا براہما... حفاظت کا دیوتا یعنی ڈیفنس منسٹر بشو اور مایشورا... تباہی کا دیوتا... یعنی آرڈ فورسز کا چیف...

”بھیدوں کی بستی بھگتا پور میں مورنا چا... کس نے دیکھا؟“

بودی شاہ کی یہ خصوصیت ہمیں پسند آئی تھی کہ وہ صرف ایک گائیڈ نہ تھا؛ صرف ہماری جیب پر پرکاش کی مانند نظر نہ رکھتا تھا بلکہ مسلسل اپنی عاقبت بھی سنوارے پلا جا رہا تھا اور اپنی بودی بھی سنوارے چلا جا رہا تھا...

”بودی بابا اب واپس چلیں...“ سُہری بابا کی آنکھیں اپنی گھڑی پر چیونگ گم کی طرح چپکی ہوئی تھیں ”میں نے ابھی اسلام آباد فون کر کے اپنے گھر والوں کو بتانا ہے کہ گاڑی ایئر پورٹ پر بھیج دیں... سرکاری گاڑی آئے گی تو آرام سے چلے جائیں گے ورنہ رکشے پر جانا پڑے گا...“

اسلام آباد کے نام پر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

یہ کونسا شہر ہے...

بھگتا پور کے مندروں اور راہب خانوں میں... فکیل کشور ہندوستان کے سائے میں... شیعہ سنی تصادم اور ایم کیو ایم کی معصوم دہشت گردی سے ڈور... سوس بینک کلائنٹس اور رائے ونڈ کے ونڈ سرکاسل سے پرے... یہاں یہ کس نے کس شہر کا نام لیا۔

”واپس کیسے جائے گا... ابھی تو پی کاک ونڈ دیکھے گا صاحب...“

بودی شاہ عجیب بودا گائیڈ تھا کہ وہ فوری طور پر ہم سے فارغ ہو کر کسی اور سیاح

سے نتھی ہو جانے کی بجائے یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ وہ ہمیں اپنے مقدس شہر کا ہر گوشہ دکھائے...

”کدھر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اُدھر ہے... مندر کے پیچھے جو گلی ہے اُس میں... سب ٹورسٹ لوگ اُسے دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے۔“

”ٹارڈ صاحب ابھی ہم پچپن کھڑکیاں دیکھ کر آئے ہیں... ایک اور کھڑکی کو دیکھ کر کیا کریں گے... صرف ایک کھڑکی کے لئے کراچی کی فلائٹ مس کر دینا تو دانش مندی نہیں ہے...“

”لیکن بودی شاہ کہتا ہے اور اپنی بودی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ پی کاک وِنڈو ہے“

”تو پھر؟“

”شاید اُس کھڑکی میں مور ناچتا ہو۔“

”کھڑکی میں مور ناچا کس نے دیکھا۔“ سُہری بابا اس ناگمانی مور کے تذکرے پر اتنے سخ پا ہو چکے تھے کہ اُسے سخ میں پرو کر روست کرنا چاہتے تھے یا اُس ناخجا مور کی مور کڑا ہی بنا کر اُسے تناول کر جانا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ہماری ایئر بس چھوٹ جانے کا امکان قوی ہوتا چلا جاتا تھا...

بودی شاہ اس دتہ تریا مندر کے بائیں جانب ایک تنگ گلی میں اپنی بودی پہلے سلاتا پھر لہراتا اور شاید اُس نامعلوم نشے سے ٹوٹتا جو اُس کے رگ و پے کو لاغر بناتا تھا... ذرا ایک مستانہ انداز میں داخل ہوا... اُس گلی میں۔

کھنڈو کی پہلی شام میں... دھوکا دربار اور کماری کے مندر کے باہر... ہم نے ہر جگہ نیپال ڈڈ ورک کے وہ دلکش نمونی دیکھے تھے جو چھوٹے چھوٹے دروازوں اور کھڑکیوں کی صورت میں فٹ پاتھوں پر ستیحوں کی نظر میں آنے کے لئے سجے تھے... اور وہ میری نظر میں بھی آئے... مجھے شیوا کے نقابوں، کالی دیوی اور بدھا کے سیاہ مجستوں، شد کے نیپالی پیالوں اور تبتی گھنٹیوں کے انبار میں رکھے نقاشی کے وہ مختصر اور حیرت انگیز شاہکار بے حد بھلے لگے تھے اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وطن واپسی پر ان میں سے ایک

نہ ایک میرے شوٹ کیس میں ہو گا...

بھگتا پور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کسانوں، تصویروں، نقاشوں، فن تعمیر، کانسی کے مجستوں، زیورات اور کوزہ گری کا شہر ہے... ہمیں تو ن۔م۔ راشد کا حسن کوزہ گر ہے اور گجرات کی سوہنی کہارن ہے... لیکن... ان سب خصوصیات کے سوا... یہ نیپال بھر میں اپنے لکڑی کے کام کی وجہ سے جانا جاتا ہے... گویا یہ یہاں کا چنیوٹ یا سوات ہے... ہم جو نئی دربار سکورٹ میں داخل ہوئے تھے تو پچپن کھڑکیوں اور سُہری دروازے کے عین سامنے فٹ پاتھ پر سجے ہمیں یہ سیاہ رنگ کے منقش، مختصر کھڑکیاں اور دروازے نظر آئے تھے اور ہم ان کی جانب لپکے تھے، اور بودی شاہ نے ہمیں لپکنے سے باز رکھا تھا اور صلاح دی تھی کہ... صاحب یہ تو مشین کا بنا ہوا ہے... ٹورسٹ لوگوں کو پتہ نہیں چلتا... ہم آپ کو ادھر لے کر جائے گا جہاں یہ صرف ہاتھ کی کاریگری کا ہوتا ہے اور اُدھر قیمت بھی کم ہو گا۔

دتہ تریا مندر کے پہلو میں جو گلی تھی وہ نہایت دیدہ زیب اور منقش اور قدیم کھڑکیوں والی گلی تھی... اور اُس گلی کو دیکھ کر مجھے قرطبہ کی پھولوں والی گلی یاد آئی... کبالا روخو کا رستوران یاد آیا جہاں میں نے ناٹلا سعد کے ہمراہ شاگرما کا سرخ رنگ کا نہایت ناقابل اعتبار شربت پیا تھا...

منقش کھڑکیاں اُس گلی پر جھکتی تھیں اور اُن کے نیچے چند دوکانیں تھیں جن کے باہر وہی سیاہ رنگ کے مختصر دروازے، ستون اور کھڑکیاں تھیں۔

”صاحب... ادھر مشین کا کام نہیں ہے... سب ہاتھ کا بنا ہوا ہے...“ بودی شاہ نے اپنی بودی کو بے اعتنائی سے لہرایا ”ادھر ان گھروں میں نیپال کا سب سے پرانا کاریگر لوگ رہتا ہے... پڑھا لکھا نہیں ہے صرف لکڑی میں پڑھا لکھا ہے۔ آپ نے کھنڈو میں جتنا کھڑکی اور مندر دیکھا وہ اُن کے بابا لوگ کا بنایا ہوا ہے...“

”لیکن بودی بابا وہ پی کاک وِنڈو کہاں ہے جس کا جھانسا دے کر تم ہمیں یہاں لے آئے ہو؟“ سُہری بابا نے داڑھی کو بے طرح کھجلائے ہوئے اور اپنی گھڑی پر ایئر بس کے وقت کو ٹیک ٹیک کرتے گذرتے دیکھا اور نہایت ایمر جنسی میں پوچھا...

”صاحب اوپر ہے۔“ بودی شاہ نے اپنی نشہ باز مہین اُننگلی سے اوپر اشارہ کیا۔

والے نمونے بھی تھے... یہ مختصر نمونے... الگ الگ ڈیزائنوں کے چھوٹے چھوٹے دروازے، کھڑکیاں، ستون اور محرابیں قدرے بیش قیمت تھے لیکن ہم بودی شاہ پر اعتبار کر کے یہاں آئے تھے اور اُس کا کہنا تھا کہ یہ سب کے سب ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں مہینوں پر تیار کردہ نہیں... اور وہ ایسا نہ بھی کہتا تو ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہ کسی انسان کی شب و روز کی ریاضت سے وجود میں آئے تھے... کیونکہ انسانی ہاتھ میں کھینکی طور پر درست کمال نہیں ہوتا... ایسا مہینے کمال جو کسی بھی تخلیق کو بے جان کر دیتا ہے... سندھی یا سواتی کڑھائی اگر ہاتھ کی ہو تو اُس کا ہر پھول، ہر پونٹا ایک دوسرے سے ذرا مختلف ہو گا... ذرا بے ربط ہو گا کہ گھل ربط صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب وہ نمونہ کوئی ایسی شے بنائے جو سانس نہ لیتی ہو... اور اگر وہ شے انسان ہو تو وہ سانس لے گا اور اُس کے ہاتھوں سے تخلیق کیا جانے والا نمونہ... وہ بے شک ایک تصویر ہو، کڑھائی یا لکڑی اور ہتھر پر کھدائی ہو... ایک عشق خاص ہو... تو ان سب میں اُس کے سانسوں کا زیر دم ضرور شامل ہو گا...

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ایورسٹ کے دامن میں پہنچنے کے لئے جو ڈالر میں نے اپنے دامن میں سنبھال رکھے تھے اُن سب سے یہ سب چیزوں کی کھڑکیاں دروازے اور مور خرید لوں یا قدرے اجتناب کروں... میں ایسے موقعوں پر اکثر غلط فیصلے کرتا تھا اور جب گھر واپس پہنچتا تھا تو احساس ہوتا تھا کہ تراکٹ کباز خرید لایا ہوں... چنانچہ اس بار میں نے صحیح فیصلہ کیا کہ صرف ایک نمونہ خریدوں گا اور ان کی خوبصورتی کے طلسم میں نہیں آؤں گا اور یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا... تو کوئی ایک نمونہ کونسا خرید جاوے؟

یا تو میں اس دوکان کے اوپر صدیوں سے ناچ کے انداز میں پڑھیلے مور کی ایک شکل خرید لیتا... یا وہ دروازہ حاصل کر لیتا جس کے مختصر در کھولنے سے قوت متغیہ کے تمام تردد رکھل جاتے تھے...

ایک مور جب پڑھیلے اپنے حُسن اور رنگ کی راجدھانی کی نمائش کرتا ہے تب بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ سخت جسمانی اذیت میں ہوتا ہے، اُسے پروں کو پھیلا کر اُنہیں پھیلائے رکھنے اور اپنی چھب دکھلانے کے لئے اپنی تمام تر قوت بروئے کار لانی پڑتی ہے... اگر وہ اپنی توجہ اور زور سے ذرا غافل ہو جائے تو اُس کا رنگین چھتار محل منہدم ہو

اوپر ایک ایسے مکان میں جہاں نیپال کا پرانا کاریگر لوگ رہتا تھا اور لکڑی میں پڑھا لکھا تھا ایک چوکور کھڑکی کے نیچے ایک چوبی مور پڑھیلے کھڑا تھا اور اُس کے اردگرد پھول اور بوٹے کھلتے تھے۔ یہی وہ مختصر سی مور کھڑکی تھی جو نیپال کی چوبی کاریگری کی ایک ایسی مثال تھی کہ اُس کے کوپڑے بازار میں اس وادی کی سب سے اہم تخلیقی علامت کے طور پر فٹ پاتھوں، دوکانوں اور ہوٹلوں میں جتی اور بکتی تھی۔

پی کاک وینڈو اگرچہ نہایت مختصر اور بھولی بھالی تھی لیکن اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی چوبی تختے پر بچھے ہوئے انسان نے اپنے ہاتھوں سے تراشی ہے۔ یہ چوبی مور کئی صدیوں سے بھگتا پور جنگل میں ناچ رہا تھا اور چونکہ ہم شہروں کے باسی تھے اس لئے ہم نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

پی کاک وینڈو اتنی مختصر تھی کہ جب تک کوئی اس کی نشاندہی نہ کرے یہ نظروں میں نہ آتی تھی...

انسان صناعتی کے بے شمار عجوبے ایسے ہیں جو اُس کے سامنے آتے ہیں تو اُسے مختصر کر دیتے ہیں... وہ انسان کے ہاتھوں کے بنے ہوئے ہیں اور دیکھنے والے انسان کو حقیر کر دیتے ہیں... تاج محل، اہرام مصر یا اکرپس کی جانب اشارہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ آپ کی نظر کے آگے ایک عظیم بند باندھ دیتے ہیں... لیکن کچھ عجوبے ایسے ہیں جن کی قربت میں پہنچ کر اُنہیں جھک کر دیکھا جاتا ہے یا اُن کی جانب اٹھی ہوئی انگلی کے آگے راستہ تلاش کر کے اُنہیں دیکھا جاتا ہے... ان میں ہنراد کی مختصر تصویریں ہیں... مونہجو ڈارو کی رقاصہ کا باشت بھر جسم ہے اور یہ پی کاک وینڈو ہے...

مور کھڑکی سے عین نیچے ایک ریٹائرڈ تبتی لاما کی دوکان تھی جو صرف نیپالی ڈڈ ورک سجائے بیٹھا تھا... دوکان کا دروازہ تبتی اور نیپالی قامت کے حساب سے ذرا ٹھگنے قد کا تھا اور اُس کے اندر جانے کے لئے ذرا احتیاط کرتے ہوئے سر جھکا کر داخل ہونا پڑتا تھا ورنہ پیشانی پر جو زخم آتا وہ مندمل ہو بھی جاتا تو ایک محراب کی مانند مقدس نہ ٹھہرتا کہ ایک چوبی مور کی زیارت کے دوران اگر یہ داغ ملے تو یہ داغ کفر اور شرک ہو گا...

تبتی لاما کی نیچی چھت کی نیم تاریک دوکان کے اندر... نئے نکور دروازے اور کھڑکیاں بھی تھیں اور اُنہیں سیاہ رنگ سے پالش کر کے اُنہیں قدیم شکل دیئے جانے

میں رکھے ہوئے تھے اب اُسے عمل طور پر ظاہر کر کے بیباک ہو گئے... اُن کے اندر ساڑھے چار بجے روانہ ہونے والی ایئر بس کا ٹائم ہم اتنی بلند آواز میں ٹک ٹک کرنے لگا کہ اُس کی دھمک سے جتنی لاماکی دوکان میں جتنے مور پڑ پھیلائے کھڑے تھے مزید ساکت ہو گئے اور جتنے دروازے کھلے تھے اُن کے در دستک دینے لگے... ہم واپسی پر بھگتا پور کے اُن گلی کوچوں میں سے ہانپتے ہوئے گزرے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے ہم اطمینان اور شانتی کے گیت الاپتے ہوئے آئے تھے...

جائے اور اُسکی کرکری ہو جائے...

تو کیا مجھے یہ مور خریدنا چاہئے...

تمام جانوروں پرندوں اور انسانوں کو اپنی جنس مخالف کو اپنی کشش میں لینے کے لئے ازحد جسمانی اذیت سہتا پڑتی ہے... اس میں اُن کی میل شاو نزم بھی ہوتی ہے اور مجبوری بھی...

تو کیا میں ایک ایسا مور خرید لوں جو پڑ پھیلائے کھڑا ہے اور اگر میں اُسے اپنی سٹڈی میں آویزاں کرتا ہوں تو وہ ہمہ وقت مجھے اپنی محروم کا احساس دلا کر شرمندہ کرتا رہے...

میں بھی تو ایک زمانے میں بہت زور لگا کر اذیت میں مبتلا ہو کر اپنے پڑ پھیلاتا تھا اور اُن کے رنگ لٹکیلے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے ہوتے تھے... جنس مخالف کے سامنے بظاہر لاپرواہ ہو کر ناپتا تھا... اور کچھ زیادہ ناکام بھی نہیں ہوتا تھا... اور ان دنوں... ان زمانوں میں... جب داڑھی سفید ہو چلی ہے اور قوی منہمکل ہو رہے ہیں تو ان دنوں میرے پر اقل تو بدن سے بلند ہی نہیں ہوتے اور اگر کوشش بسیار کے بعد قدرے بلند اور نیم ایستادہ ہو بھی جائیں تو اُن کے رنگ اتنے پھیکے پڑ چکے ہیں کہ کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا...

چنانچہ ایک ایسے پڑ پھیلائے مور کو خریدنے کا فائدہ جو مسلسل وجہ شرمندگی بنا رہے۔ میں نے ایک مختصر سیاہ رنگ کا چوہی دروازہ خرید لیا جس کے در کھلتے تھے... اور ایسے بے آواز کھلتے تھے جیسے کھل گئے شر غم کے دروازے... اک ذرا سی ہوا کے چلنے ہی...

وہ دروازہ اب میری سٹڈی میں اُستاد اللہ بخش کی ایک ڈرائنگ کے نیچے آویزاں ہے... اُس کے در اب بھی اک ذرا سے چھوٹے سے کھلتے ہیں لیکن اُن کے پیچھے سوائے پلاسٹک امیشن سے سے پینٹ کی ہوئی ایک دیوار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا... ”اب واپس چلیں تارڑ صاحب۔“ سُہری بابا جو اپنی سراسیمگی کو اب تک قابو

دغل نہ دیا اور سامنے دیکھا جہاں ”نیشنل آرٹ گیلری“ کا بورڈ ایک قدیم محل کی پیشانی پر ثبت تھا۔

میں اُس گیلری کے بے شمار برآمدوں میں سے گذرا... اور سرسری گذرا... کچھ مجھے دیکھے... تاترک آرٹ کے نمونے اور تصویریں دیکھیں... نیپالی شاہوں کی تصویریں اور زندگی کے حالات دیکھے اور جتنی قدیم دستاویزات دیکھیں لیکن میں اُن سے متاثر نہ ہو سکا... سرزمین گندھارا کا ایک باشندہ جو جانتا تھا کہ مجھتوں میں جان ہوتی ہے... تصویریں سانس لیتی ہیں... اور تخلیق کا اوجِ کمال کیا ہوتا ہے وہ کیسے اِن سے متاثر ہو سکتا تھا۔ میں باہر آ گیا۔

سُہری بابا ابھی تک منظر میں نہیں تھے... ابھی تک اُس دوکان میں روپوش اسلام آباد فون کر رہے تھے اور غالباً اُنہوں نے روانگی کے ٹائم بم کی ٹنگ کرتی گھڑی کو توڑی دیر کے لئے ساکت کر دیا تھا... میں انتظار کرنے لگا۔

اس منظر میں جس میں سُہری بابا کا نزول ہوتا تھا چند دوکانیں اور رستوران اور چند مندر تھے... ایک دوکان پر ایک بورڈ آویزاں تھا ”کشمیری زعفران یہاں ملتا ہے...“ میں نے آج تک زعفران کا پھول نہیں دیکھا۔

میں نے زعفرانی چاول تو کھائے ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس کی شکل کیسی ہوتی ہے اور اس کی مہک کیا ہوتی ہے... اور اس کے باوجود تاروں کو زعفران سے ایک ذور کی نسبت ہے...

کولو تاروں کے گاؤں میں دریائے چناب کے کنارے جب اُس کے کھیتوں میں سُہری گندم کے سُہرے سمندر ٹھاٹھیں مارتے تھے اور گردنیں اُوچی کرتے تھے تاکہ وہ کسی درانتی کی زد میں آکر کٹ جائیں تو ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ ستر برس پہلے کا قصبہ ہے... میں اپنے گاؤں کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے کے لئے داخل ہوا تو وہاں ایک الگ لباس اور الگ چہرے مرے والا اجنبی مسافر خوابیدہ تھا... وہ بیدار ہوا تو کہنے لگا ”بابا... میں ایک دور افتادہ ہمالیائی وادی سے آیا ہوں جہاں سے تبت کو دترے نکلتے ہیں۔ بہت مشکلوں سے اس گاؤں کو تلاش کیا ہے۔ میری وادی میں آباد جو لوگ ہیں وہ آپ کے قبیلے سے ہیں۔ بہت متمول اور خوش حال ہیں۔ اُنہوں نے میری ذمہ داری لگائی ہے کہ میں اُن کا

”ناگ دیوتا“ ایک متروک خدا...
اے ہمالہ... اے فصیلِ کشورِ ہندوستان“

دوبار سکور میں پہنچ کر سُہری بابا نے اپنی گھڑی پر سے نظریں ہٹائیں کہ وہ بھگتا پور کی بھاگ دوڑ میں راستہ نہ دیکھتے تھے... یہ نہ دیکھتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں اور تمنا کا اگلا قدم کہاں رکھ رہے ہیں۔ صرف اپنی گھڑی دیکھتے تھے... ”تاروں صاحب... میں ابھی اس سامنے والی دوکان سے اسلام آباد فون کر کے آتا ہوں... تاکہ گاڑی ایئر پورٹ پر آجائے... صرف پانچ منٹ میں آتا ہوں...“ یہ کہہ کر وہ اپنی سُہری ریش لہراتے رخصت ہو گئے۔

تو اِن پانچ منٹوں میں میں کیا کروں؟

بودی شاہ کے لئے یہ کوئی پرائلم نہ تھی کہ وہ اگلے پانچ منٹوں میں یا پانچ برسوں میں کیا کرے... وہ سر جھکائے اپنی بودی سنوارتا تھا اور ایک زمینی بھگوان کے چرنوں میں بیٹھ کئے ہوئے زعفران زدہ زردے کو بھوکی نظروں سے دیکھتا تھا اور اُسے اپنے بھوکے پیٹ میں اُتار نہ سکتا تھا کہ یہ کھانا صرف دیوتاؤں کے لئے تھا... وہ کھائیں یا نہ کھائیں یہ اُن کی مرضی تھی... بے شک اُس پر کھیاں بھینٹائیں... لیکن وہ خداؤں کی خوراک تھی... انسانوں کی نہ تھی۔ خدا اُسے کھانہ نہ کھاتے تھے... انسان اُسے کھا سکتے تھے۔ اور اس کے باوجود وہ اُسے کھانے کی جرات نہ کر سکتے تھے اور اُس پر کھیاں بھینٹاتی تھیں...

میں نے بودی شاہ اور اُس کے بھگوانوں کے بیچ جو خوراک کا جھگڑا تھا اُس میں

اصل تلاش کروں... کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کیا ہیں... جب انسان عمل آسانس کو پالیتا ہے اور اُس کے پاس خواب دیکھنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تب اُسے اپنے آبادیاد آتے ہیں اور وہ اپنی جڑوں کو جاننے کی خواہش کرتا ہے... وہاں اُس ہالیائی وادی میں جو لوگ آباد ہیں اُن کے نام اور ولدیت... یہ... اور یہ ہے... یہاں کون ہے جو پچھلے ایک سو برس کی تاریخ کا... حسب نسب کا حساب رکھتا ہو۔“

بزرگ جو کولو تارڑ میں یہ قصہ مجھے بیان کرتا تھا اُس اجنبی سے کہنے لگا ”ہمارا جدی پُشتی ایک دادا ہے... ایک میراٹی ہے جو ہماری پشتوں کا حساب رکھتا ہے“
تو وہ قدیم میراث کا دانش مندر میراٹی اُس اجنبی شخص کی درخواست پر اُس کے ہمراہ اُس ہالیائی وادی کو چلا گیا۔

بہت برسوں کے بعد اُس کی واپسی ہوئی تو اُس نے اپنا قصہ بیان کیا... چوہدری صاحب... وہ اجنبی شخص مجھے دریائے چناب کے کناروں سے سری نگر کی جھیل ڈل تک لے گیا۔ وہاں سے ہم نے کئی روز تک ٹڈوں پر سفر کیا... راستے میں برقانی تو دے اور بلند گذر گاہیں آئیں... ہم نے دریا عبور کئے... جھیلوں کے پار گئے اور ہمہ وقت چھائے بادلوں اور گرتی برف کے اندر گئے۔ اور تین روز کی مسافت کے بعد ایک ایسی وادی میں پہنچے جو نہایت سرسبز اور ہنستی ہوئی تھی... وہاں تاحد نظر زعفران کے پھولوں کے کھیت تھے اور کہا جاتا ہے کہ جو بھی ہمارے جو بن میں... زعفران کے کھیتوں کو... اس کشت زعفران کو دیکھتا ہے تو اُس کی خوش نمائی اور خوشبو ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہنستا چلا جاتا ہے اور اُسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہتا... اگلی صبح میں اُس وادی زعفران میں بکھرے لکڑی کے گھروں کی چھتوں پر کھڑا ایک مؤذن کی طرح اُن کے مکینوں کا شجرہ نسب بہ آواز بلند بیان کرنے لگا... کہ فلاں... فلاں کا بیٹا... فلاں کا دادا... اور وہ فلاں تارڑ کا پوتا... اور بالآخر... فلاں چناب کے کنارے گاؤں کولو تارڑ کے فلاں گھرانے کا بیٹا... وہ اپنا حسب نسب جان کر خوشی سے بے حال ہو گئے اور اُنہوں نے مجھے تحائف کے عجائبات سے لاد دیا... وہ کسی زمانے میں اپنے چناب سے جدا ہو کر روزی روزگار کی تلاش میں خانہ بدوش ہوئے اور ہالیہ کی گود میں روپوش اُس وادی میں جا قیام کیا... اپنی محنت اور مشقت سے اُس کی ویرانی کو آباد کیا... زعفران اُگایا اور صاحب ثروت ہو گئے...“

اور جب صاحب ثروت اور دولت مند ہو چکے تو اُنہیں چناب کا کنارہ آباد آیا... بزرگ نے بتایا کہ وہ میراٹی اُس وادی زعفران سے اُس کے دادا کے لئے اُن کشمیری تارڑوں کی جانب سے پُشمینے... کی ایک ایسی شال تھے کے طور پر لایا تھا کہ اُن کے دادا جان جب پوہ ماگھ کے پالوں میں اپنے صحن میں اُسے اوڑھ کر سوتے تھے تو پسینے سے نہا جایا کرتے تھے...

بھگتا پور میں جب سُہری بابا اسلام آباد فون کرتے تھے اور پانچ منٹ کے وعدے کو نصف گھنٹے تک طول دیتے تھے اور روانگی کے ٹائم بم کو نہایت آسانس سے خاموش کرتے تھے تو سامنے ایک دوکان پر... ”کشمیری زعفران یہاں ملتا ہے“ کے بورڈ کو دیکھ کر مجھے ایک ایسی زعفرانی وادی کی یاد آگئی تھی جس کے کاشت کار تارڑ تھے...

اور چونکہ سُہری بابا پانچ منٹ کا وعدہ کر کے ایک مدت سے روپوش تھے اس لئے بودی شاہ اپنی بودی کے ہریال کو الگ الگ کر کے سنوارتا تھا...

تو میں فارغ الہابی کے اس موسم میں کیا کرتا... میری تو کوئی بودی بھی نہ تھی جسے میں سنوار سکتا اور یہاں مجھے ایک عدد بودی کی افادیت کا شدید احساس ہوا... ویسے اگر میری ایک بودی ہوتی تو میں نہایت بودا لگتا... اس لئے فارغ الہودی کے اس موسم میں اُٹھ وقت گذاری کے لئے میں سُہری دروازے کے اندر چلا گیا... بچپن کھڑکیوں والے محل کے پہلو میں جو کماری مندر تھا اُس کے اندر چلا گیا...

اور وہاں اب بھی ”ادھر صرف ہندو لوگ داخل ہو سکتے ہیں“ کا بورڈ آویزاں تھا... کوئی دیکھتا نہ تھا...

اُس پاس نہ کوئی غیر ملکی ستیج تھا... نہ کوئی نیپالی نہ کوئی بھگت...

میں اس کے اندر جا سکتا تھا۔

کوئی دیکھتا نہ تھا...

لیکن اُس کے اندر جو بیت تھے... وہ مجھ پر کڑی نظر رکھتے تھے... وہ جانتے تھے کہ سو دو سو برس پہلے میں نے اپنی بودی کوا کر اُن سے بے وفائی کی تھی اور رب کعبہ کی پرستش کرنے لگا تھا۔

مجھے بھی بھگتا پور کے ان جوں سے نسبت تھی... اگرچہ دُور کی تھی۔

وہ ایٹر آئی لینڈ پر سمندر کی بجائے جزیرے کی جانب دیکھتے ہیں کہ انہیں
تراشنے والے اُن کے قدموں میں آئیں گے اور وہ نہیں آتے...

افغانستان میں... دنیا کے سب سے بڑے ساکیامنی... بدھ کے مجستے وادی بامیان
میں ہیں جنہیں سکندر اعظم نے بھی دیکھا تھا اور اور جن کے عظیم اجسام کے اندر بدھ
خانقاہوں کی چٹائی بھول بھلیاں ہیں... اور جن کے چہرے مٹا دیئے گئے ہیں وہ بھی تو اپنے
بھکشوؤں کے انتظار میں ہیں... جنہیں طالبان بارود سے اڑا دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے وطن
کو کفر کی آلائشوں سے پاک کر سکیں... اور پوری دنیا کے احتجاج پر فی الحال اپنے اس نیک
ارادے سے باز آچکے ہیں... وہ بھی منتظر ہیں۔

لکھنؤ... مصر... کے شہر دیوتا... جہاں آباد سوات کی چٹان میں ڈھونی رماے
گوتم... یونانی دیوتا... شہر بابل کے اوتار... پارس پالس کے سوختہ مجستے... میکسیکو کے اہرام
میں خوابیدہ بت... موہنجودادو کا پادری بادشاہ... ہڑپہ کی... مٹی سے پکائی ہوئی ماں دیوی... اور
کوہستان نمک کے کناس مندروں کی دیویاں۔

یہ سب کے سب متروک خدا ہیں۔
جو بڑے بد قسمت ہیں کہ اب وہ نرے پتھر ہیں۔
اُن پر سیاہوں کے کیمروں کی آنکھ کے سوا اور کوئی آنکھ نہیں...
وہ متروک ہو چکے ہیں اور اُن بچاریوں کے منتظر ہیں جو کبھی نہیں آئیں گے...
تو کیا موجود خداؤں کا بھی یہی حال ہو گا...

آج نہیں... آج سے دو تین ہزار برس بعد...
کیا یہ بھی متروک ہو جائیں گے... اور ہم جیسے بچاریوں کو ترسیں گے...
اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان...

بھگتا پور کے تہہ در تہہ مندروں، عبادت گاہوں اور راج مٹلو اور ناگ دیوتا کے
ساکت مہری پھن کے پس منظر میں جو آسمان تھا وہ خالی نہ تھا... اُس کے پیچھے فصیل کشور
ہندوستان تھی... سفید لانتھائی برفانی فصیل جس کی چوٹیاں بڑج میناروں کی طرح بلند ہوتی
تھیں اور میں اس فصیل کے دامن تک نہ پہنچ سکا تھا... میں اپنے جوگر شوز اور سنو جیکٹ
سے شرمندہ تھا کہ انہیں وہاں نہ لے جا سکا تھا... ایک مرتبہ میں نے اپنے ٹریگنگ شوز

اور انہوں نے مجھے ابھی تک اس بے وفائی پر معاف نہیں کیا تھا...
میں چاہتا تو یہی تھا کہ آخری بار اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی بے وفائی کی
معذرت کروں لیکن اُن کی خشونت اور ہتھمیلی نگاہوں سے لگتا تھا کہ وہ معاف کرنے
کے موڈ میں نہیں ہیں۔

مجھے کوئی نہیں دیکھتا تھا... میں اس مندر کے اندر جا سکتا تھا۔
لیکن ہم تو غالب کے وہ طرف دار تھے کہ اگر در کعبہ وانہ ہوا تو ہم لوٹ آئے...
تو ان بتوں کی خدائی اور خشونت کو کیونکر برداشت کرتے...
ہم لوٹ آئے۔

اپنی مسلمان کو داؤ پر نہ لگایا...
میں اگر نیپال کھنچا کھنچا چلا آیا تھا، تو مہری دروازے کے حسن کا اسیر ہو کر ہرگز
نہیں آیا تھا۔ نہ اس کماری مندر کے طلسم کی گرفت میں آکر بڑھال ہو کر ادھر آیا تھا۔
میں ادھر آیا تھا تو ایک سانپ دیوتا کے درشن کے لئے آیا تھا۔

اس کماری مندر سے پرے... زنی بھگوانوں کے چرنوں میں بکھری زعفرانی
خوراک، گیندے کے پھولوں اور تیل اور گھی سے پرے... پچپن کھڑکیوں والے محل کے
پچھواڑے میں ایک خشک تالاب کے اندر جو سانپ دیوتا اپنا پھن کھلا رہے کھڑا تھا... اور
اُس کے پھیلے ہوئے پھن کے پس منظر میں، ہالیہ کی برفانی زنجیر سفید ہوتی تھی...
ایک خشک تالاب میں۔

داسو کی کا اڑھا اپنا مہری پھن ایک زرافے کی طرح اپنی گردن لمبی کئے تھا...
وہ سانپ... وہ پوکھاری نہیں جانتا تھا کہ جس بنیاد سے اُس کا چکلیلا بدن اُٹھتا ہے
وہاں اب یا تریوں کے اشان کے لئے پانی نہیں ہیں... ایک خشک تالاب ہے اور وہ اس
خشکی میں سر اُٹھاتا بلکہ پھن اُٹھاتا ذرا متروک ہو چکا ہے۔

متروک خدا بڑے بد قسمت ہوتے ہیں۔
وہ اپنے تئیں خدا ہی سمجھتے ہیں... بھگوان ہی سمجھتے ہیں۔
لیکن اُن کے زمانے گزر چکے ہوتے ہیں۔
اُن کے بچاری رخصت ہو چکے ہوتے ہیں۔

تالاب میں ایک ہیوقوف شتر مرغ کی طرح کھڑا تھا...
ایک بچاری اور ایک زائر اگر خود غرض ہوتا ہے تو ایک ٹورسٹ ظالم ہوتا ہے...
وہ کسی مندر، مسجد یا کلیسا کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ کیا اس کی تصویر لے چکی ہے
گی۔ وہ ان عبادت گاہوں کی پاکیزگی کو لاطلفی سے دیکھتا ہے... وہ صرف ایک تصویر کا
بچاری ہے...

ناگ دیوتا متروک ہو چکا تھا اور اُس کی زندگی میں اب کوئی مقصد نہ تھا سوائے
اس کے کہ... سیاح اُس کے سُہری پھن کی تصویریں اُتار کر چلے جائیں... جیسے وہ
ابوالہول... تاج محل، مائیکل انجلو کے داؤد اور موسیٰ... شاردنگ بڑھا... کوہ طور... اور
آئفل ٹاور کی تصویریں اُتار کر چلے جاتے تھے...

تو یہ ناگ دیوتا بھی اب بے مقصد اور بے جان کھڑا تھا...

اگرچہ ایک زمانے میں وہ زندہ اور زہرناک تھا...

مجھے آج ساڑھے چار بجے پی آئی اے کی ایئر بس پر شکوک اور کفر اور اس ناگ
دیوتا کی سر زمین سے دُور چلے جانا تھا... لیکن میں اُسے مسلسل دیکھتا تھا...

بچپن کھڑکیوں والے محل کے باہر دربار سکور کی کسی ایک دوکان میں سُہری بابا
اعلام آباد فون کر کے ایئر پورٹ پر سرکاری گاڑی کے بچنے کا اہتمام کر رہے تھے اور
میں... یہاں ایک گہرے خشک تالاب کے کنارے کھڑا... ایک قطب مینار کی طرح بلند ہوتے
ہوئے اُس اژدھے کو تک رہا تھا... اُس کے سحر میں آیا ہوا تھا... اُس سے نظریں نہیں ہٹا
سکتا تھا... جیسے شنید ہے کہ سانپ کی آنکھیں اُس کے شکار کو مسحور کر دیتی ہیں اور وہ اپنی
جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا... اگرچہ اس اژدھے کے سُہری پھن کا رخ اپورسٹ کی
برفوں کی جانب تھا، وہ اُدھر دیکھتا تھا لیکن کوئی ایک لمحہ ایسا آیا جب میں نے واضح طور پر
محسوس کیا کہ وہ کن اکیوں سے مجھے دیکھتا تھا... اور پھر ایک اور وقت کی دُھول میں انا
گذرتا ہوا لمحہ رُکا اور اُس لمحے میں اُس نے مجھے پہچان لیا... لیکن شناخت اور پہچان میں
وہ تہا نہ تھا... میں نے بھی اُسے جان لیا تھا کہ وہ کون ہے۔ کیا ہے... اور ہماری ملاقات
اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے۔

یہی تو ہر برس مجھے دُستا تھا...

کے موٹے تلوں کو غور سے دیکھا تو اُن میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پتھر لے کنکر
پھنٹے ہوئے تھے... ہر کنکر میں ایک سفر کی داستان تھی... کوئی ایک کنکر بالٹورو گیشیئر کا حصہ
تھا... کوئی پامیر کا تھا اور کوئی سنولیک کے بیس کیمپ کی نشانی تھا... میرے جوگر زکی قسمت
میں یہ نہ تھا کہ اُن کے تلوں میں اپورسٹ کے دامن کا کوئی کنکر پھنس کر لاہور شہر کے
جرج میناروں تک سفر کرے...

ہالیو... سفید... ایک تسلسل کے ساتھ... دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کا ایک سفید
دوپٹہ جو افق تا افق لہراتا تھا اور مجھ سے بہت دُور تھا...

اور بھگتا پُور کے دربار سکور سے ہٹ کر بچپن کھڑکیوں والے راج محل کے
دامن میں ایک خشک تالاب کی گہرائی سے اُٹھتا ہوا ایک اژدھا پھن اُٹھائے یوں بلند ہوتا
تھا جیسے وہ اپورسٹ اور انا پورنا کی برفوں کو ڈس لینا چاہتا ہو... میں نیل کرائیاں نیلاں میرا
تن من نیل و نیل اُن کے سفید کنوارے بدن کو نیو نیل کر دینا چاہتا ہو... اُس اژدھے کا
رنگ دھوپ میں سُہری ہوتا تھا اور وہ بھگتا پُور کے آسمان پر ایک شوٹنگ کی طرح تپتا ہوا
اور لہتا ہوا تھا...

اور جس تالاب میں سے وہ اُٹھتا تھا وہ نہ صرف خشک تھا بلکہ اُس میں کہیں
کہیں کچھ بھی تھا...

کبھی یہاں ایسے بچاری بھی ہوتے تھے جو اس تالاب کو گیندے کے پھولوں،
معطر تیل اور زعفرانی چادلوں سے بھرتے تھے...

ناگ دیوتا کی زیارت کے لئے تبت اور چین تک سے آتے تھے...

اب وہ بچاری بھی رخصت ہو چکے...

ویسے ہر بچاری ہر زائر اپنی خصلت میں نہایت خود غرض ہوتا ہے... وہ درشن
کرتے ہیں، زیارت کرتے ہیں۔ پوجا کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں۔ پر نام کرتے ہیں، سلام
کرتے ہیں۔ مٹھا سیکتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں... اور اپنی آخرت سنوار کر رخصت ہو جاتے
ہیں... پھر اپنی زیارت کی خبر نہیں لیتے۔ چنانچہ اس ناگ دیوتا کے پوجنے والے بھی گم ہو
چکے تھے اور باقی صرف ٹورسٹ رہ گئے تھے... اُن کے لئے یہ ناگ دیوتا نہ تھا۔ ایک
ساکت اور بے جان اژدھا تھا جو ایک زبیرے کی طرح گردن لمبی کئے بھگتا پُور کے خشک

میں نے ایک عمر یونانی دیو مالا کی کشتی ”آرگوس“ میں سمندروں پر اپنی آوارہ گردی اور خواہش کے بادبان پھیلائے سفر کیا تھا... میں ان سمندروں کے سفر میں وہاں سے گذرا تھا جہاں جادو گر دو شیزاؤں کے ایسے جزیرے تھے کہ ان کی قربت سے گزرنے والے مسافر ان حسیناؤں کے نغمے سن کر مدہوش ہو جاتے تھے۔ وہاں ایک چشم دیو تھے جو سمندر میں سے ابھر کر میری کشتی کو تباہ کر سکتے تھے۔ میں وہاں سے بھی گذرا جہاں اطالیہ اور سسلی کے درمیان ایک درہ نما گذر گاہ ہے اور سسلی کے ایک آتش فشاں میں سے ابھتی آگ کو رات کے پچھلے پہر عرب مسافر ”النار۔ النار“ پکارتے تھے۔ اور یہی وہ مقام تھا جس کے بازے میں محاورہ مشہور ہے کہ ”شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان“ کہ ایک جانب وہ دیو مالائی چڑیل تھی جو جہازوں کو نگل جاتی تھی اور دوسری جانب سمندر میں ایسے بھنور تھے جو کشتیوں کو ڈبو دیتے تھے... عام لوگوں نے جن محاوروں کو صرف کتابوں میں پڑھ رکھا ہے میں نے ان کے اندر سفر کیا ہے۔ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں اور میں ان کے اندر سفر کرتا ہوں اور لکھتا ہوں۔

ناگ دیو تا بظاہر مجھ سے روٹھا ہوا اُدھر دیکھتا تھا جدھر ہالیہ کی سفیدی تھی۔

شاید وہ میرا سامنا نہیں کر سکتا تھا...

میری والدہ نے پورے یقین کے ساتھ میرے نھیالی گاؤں کے اُس جولاہے کا قصہ سنایا تھا جس نے بے خبری میں ایک ناگ اور ایک ناگنی کے ملاپ کے دوران خوفزدہ ہو کر ناگ کو ہلاک کر دیا تھا... اور تب ہر برس اُسی موسم میں وہ ناگنی اُس جولاہے کو... وہ جہاں کہیں بھی ہوتا تلاش کر لیتی اور اُسے ڈس لیتی... اور جب بھی اُس کے ڈسنے کے دن قریب آتے تو میری والدہ کا کہنا تھا کہ اُس جولاہے کا بدن ٹوٹنے لگتا... وہ پڑمردہ اور نڈھال ہو جاتا اور انتظار کرنے لگتا... راہ دیکھنے لگتا... اور جب وہ ناگنی اُسے تلاش کر کے اپنا زہر اُس کے بدن میں اُتارتی تو وہ پھر سے ہشاش بشاش اور پھرتیلا ہو جاتا... وہ زندہ ہو جاتا...

میں بھی وہی جولاہا تھا...

شاہ حسین بھی ایک جولاہا تھا جو مادھولال کے ڈسنے کا منتظر رہتا تھا۔

عثمان فقیر بھی عشق کے اژدھے کے ڈسنے سے دوہائی دیتا تھا کہ... یار ڈاڈی عشق آتش لائی ہے...

فرید کو بھی روہی کی نازک جھیلیاں جو راتوں کو دلوں کا شکار کرتی تھیں... ڈستی تھیں۔

دارث شاہ بھی ہیر کے رائنگے پنگ پر ڈسے جانے کی آرزو کرتا تھا۔

نابینا ہو مر بھی اُسی کی راہ دیکھتا تھا۔

غالب خستہ حال بھی یہی کہتا تھا کہ... ہے یہ وہ آتش غالب...

اور اقبال بھی عقل کو بام پر محو تماشا دیکھتا تھا اور بے خطر آتش نمود میں کود پڑتا

تھا۔

فیض بھی ایک عشق خاص کو گلے لگانے کی آرزو میں تھا۔

اور منیر نیازی کے در بھی اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی کھل جاتے تھے...

اور مجید امجد... اپنی شلاط کے لئے... تم پھر نہ آسکو گے، ہناتا تو تھا مجھے... تم ڈور جا

کے بس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا... ایک نازک بیاض پر مرانام... کون سمجھے گا اس پہلی کو... وہ

بھی ایک جرمن ناگنی شلاط کے زہر سے شاعری کرتا رہا۔

میں ان ڈسے جانے والے لوگوں کا ایک ادنیٰ مرید ہوں...

اس ناگ نے مجھے پہلی بار رتی گلی کی جھیلوں میں تیرتے برفانی تودوں میں سے

پھنکڑا کر کے مجھے ڈسا تھا۔ مجھ میں آوارگی اور کوہ نوردی کا زہر بھردیا تھا اور اُس کے

بعد کوئی حساب کتاب نہ تھا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ رتی گلی کی جھیلوں میں سے جس ناگ نے پھنکڑا دیا تھا...

اُس نے مجھے نہیں... میں نے اُسے ڈس لیا تھا... اُس کے تن بدن میں زہر بھردیا تھا۔

اس کا فیصلہ تو نہیں ہو سکتا کہ کس نے کس کو ڈسا تھا۔

کہ تو من شدی... من تو شدم...

کون ہے جس نے پہلا وار کیا تھا۔

اور یہ اژدھا ہر کسی کو نہیں ڈستا... اس لائق ہی نہیں سمجھتا کہ اپنا زہر ضائع

رے... صرف اُس میں اپنا زہر داخل کرتا ہے جو خود یہ چاہتا ہو کہ ایسا ہو...

تب بھگتا پور کے دربار سکور میں... پچپن کھڑکیوں کے راج محل میں پوشیدہ

دلک کے طرح تباہ ہوا اُس ناگ دیوتا کا پھن زندہ ہوا... اُس نے ہالیہ کی برفوں سے پھن

موڑا... مجھے دیکھا۔ مجھے پہچانا اور جانا... اور میری جانب جھٹکا چلا گیا... اُس کا سُہری پھن
 میرے چہرے کے سامنے تھا... میں نے تمہیں پہچان لیا ہے... وہ جھکا... اور اُس نے ایک
 مرتبہ پھر مجھے دُس لیا... میرا جولاہا بدن ٹوٹا تھا... اچھا کیا جو اُس نے مجھے پھر سے دُس لیا۔
 یا شاید... میں نے اُسے دُس لیا...

ہم میں سے کون زیادہ زہرناک ہے... اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM